حسن البنا شہیدؒ کی ڈائری

خلیل احمد حامدی

فہرست عنوانات

اخوان کے نعرے

اَللّٰہُ غَایَتُنَا

—— اللہ کی خوشنودی ہمارا اصل مدّعا ہے۔

اَلرَّسُوْلُ زَعِیْمُنَا

—— رسولؐ ہمارا قائد ہے

اَلْقُرْاٰنُ دَسْتُوْرُنَا

—— قرآن ہمارا دستور ہے

اَلْجِھَادُ سَبِیْلُنَا

—— جہاد ہمارا راستہ ہے

اَلْمَوْتُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَسْمٰی اَمَانِیْنَا

—— اللہ کی راہ میں جان دے دینا ہماری بلند ترین آرزو ہے

(الاخوان المسلمون)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حسن البنّا شہیدؒ کا مختصر تعارف

حسن البنّاؒ کے عہد میں مصر کی اجمالی تصویر

حسن البنّا بیسویں صدی کے اوائل میں مصر میں پیدا ہوئے۔ اور بیسویں صدی کے ربع اوّل میں انھوں نے وہ عظیم الشان اسلامی تحریک برپا کی جسے الاخوان المسلمون کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ جس طرح پاک و ہند کی اسلامی تحریک جماعت اسلامی کو اس کے بانی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ سے منفک نہیں کیا جا سکتا اسی طرح الاخوان المسلمون کو حسن البنّا سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ یہ دونوں لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حسن البنّا کی عبقری شخصیت نے یہ تحریک اس انداز سے اٹھائی کہ اس نے تھوڑے ہی عرصے میں نہ صرف مصر بلکہ پورے عالمِ عرب کے اندر اسلام کی روح کو بیدار کر دیا۔ اس عظیم شخصیت کا صحیح مقام اور اصل کام اس وقت تک پوری طرح نہیں سمجھا جا سکتا جب تک اس ماحول اور فضا کو نہ سمجھ لیا جائے جس میں انھوں نے دنیا میں قدم رکھا، پروان چڑھے اور تعلیم و تربیت پائی۔ اس وقت ہم اس عظیم شخصیت کے حالات و سوانح سپردِ قلم کر رہے ہیں۔ مگر ہمارا یہ مطالعہ اُس وقت تک ناقص و خام رہے گا

جب تک ہم ایک طائرانہ نظر اس بات پر نہ ڈال لیں کہ حسن البنّا کی پیدائش کے وقت مصر سیاسی لحاظ سے کن حالات سے دوچار تھا۔ ثقافتی اور فکری لحاظ سے کس قسم کا مدّوجزر وہاں برپا تھا اور وہ کون سے مقامی اور بین الاقوامی عوامل تھے جن سے وہ نبرد آزما تھا۔ چنانچہ حسن البنّا کے حالاتِ زندگی پر قلم اٹھانے سے پیشتر ہم چند لمحات کے لیے قارئین سے اس دور کا تعارف کراتے ہیں جس نے حسن البنّا کو جنم دیا اور حسن البنّا سے وہ خدمت لی جو اس وقت مطلوب تھی۔

جہاں تک راقم نے مصر اور بلادِ عربیہ کی تاریخ جدید کا مطالعہ کیا ہے اس کی رو سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں مصر میں جن بڑے بڑے مسائل پر معرکہ آرائی ہوتی رہی ہے ان میں مصری وطنیت، اسلامی خلافت، عرب قومیت اور قدیم و جدید کی کش مکش سرِ فہرست ہیں۔ اور ہم یہ کوشش کریں گے کہ ان بڑے بڑے مسائل کا جائزہ اس انداز سے لیں کہ اس میں اس دور کے مصر کی پوری تہذیبی و سیاسی اور فکری و ثقافتی تصویر سامنے آجائے۔

تحریک آزادی کے دو گروہ:-

۱۸۸۳ء میں عرابی پاشا کی بغاوت کی ناکامی مصر پر انگریزوں کے تسلّط کا پیغام لے کر آئی۔ یہ ناکامی مصر کے لیے صرف ایک سیاسی المیہ نہ تھی بلکہ اس نے پوری مصری قوم کے اندر مایوسی اور خوف و ہراس کی لہر دوڑا دی، اور اسی کے نتیجے میں مصر یکایک فکری اور اخلاقی لحاظ سے انحطاط اور پستی میں مبتلا ہو گیا۔ عرابی پاشا کی ناکامی دیکھ کر لوگ سیاسی اور اصلاحی جدوجہد کا نام سُن کر گھبرانے لگے۔ بیسویں صدی کے اوائل تک یہی صورت حال قائم رہی۔ آخر کار مصری نوجوانوں کی ایک جماعت نے پردۂ سکوت کو چیر دیا اور انھوں نے انگریزی استعمار سے آزادی اور قومی بیداری کی آواز بلند کی۔ یہ نوجوان دو گروپوں میں نمودار ہوئے۔ ایک گروپ وہ تھا جس نے اپنی جدوجہد کو دینی

جذبات اور اسلامی رشتے سے مربوط رکھا۔ اور دوسرے گروپ نے ایک نیا طرز اختیار کیا۔ اس نے مصری وطنیت کو اپنی تحریک کا نعرہ قرار دیا، اور ہر اس نظریئے کی مخالفت شروع کر دی جو رشتے سے بحث کرتا تھا یا عثمانی ترکوں سے رابطے کی بات کرتا تھا۔

پہلا گروہ ـــــــ محب اسلام و وطن

گروہ اوّل کی نمائندگی الحزب الوطنی کر رہی تھی، اور اس کی قیادت ایک شعلہ بیان خطیب اور آتش نفس نوجوان مصطفےٰ کامل کر رہا تھا، اور جیسا کہ ہم نے بیان کیا یہ گروہ اسلامی رشتہ کے حوالے سے قوم کے اندر حب الوطنی کی آگ بھڑکا رہا تھا۔ اور اس کے نزدیک مذہب اور وطن پرستی دو متضاد باتیں نہ تھیں۔ مصطفےٰ کمال کا یہ مقولہ تھا کہ:
" دین و وطن دو جڑواں بھائی ہیں جو ایک دوسرے سے منفک نہیں کیے جا سکتے"۔
وطن کی محبّت کو یہ گروہ ایسے اسلوب و انداز سے بیان کر رہا تھا جیسے کوئی عاشق اپنی محبوبہ کا ذکر کرتا ہے۔ مصر کے نامور شعراء غایاتی اور محرّم اس آگ کو شعر و ادب کی زبان میں ڈھال رہے تھے۔ محمد فرید وجدی جیسے صاحب تحقیق اور عبد العزیز جاویش جیسے عالم و ادیب اس گروہ کے گل سر سبد تھے۔ انگریز حکاّم اور خدیو مصر دونوں اس تحریک سے اس قدر پریشان تھے کہ جب غایاتی کے شعری دیوان پر محمد فرید وجدی اور عبد العزیز جاویش نے مقدمے لکھے تو اس "جرم" کی پاداش میں دونوں کو قید بامشقت کی سزائیں دی گئیں۔

دوسرا گروہ ـــــــ لادین قوم پرست

دوسرا گروہ اسلامی اتحاد یا اسلامی رشتے پر زندگی کی تعمیر کے خلاف تھا۔ وہ مصری وطنیت کا علمبردار تھا۔ مگر اس وطنیت سے اس کا مدّعا یہ تھا کہ مصر کو دوسرے مسلمان ملکوں کا " دردسر " مول نہ لینا چاہیے بلکہ صرف اپنے مفادات و مصالح کی حفاظت اور خدمت کرنی چاہیے۔ " مصری وطنیت " کے عقیدے کو پختہ کرنے کے لیے وہ مصر کی تاریخ قدیم

کو کُرید کُرید کر لا رہا تھا ۔ اور دورِ فراعنہ سے اپنے تاریخ کے قلابے ملاتا تھا ۔ اس کا نظریہ یہ تھا کہ جس چیز میں مصر کا مفاد ہو وہ عزیز ہے خواہ وہ غیر مصریوں کے لیے مضر ہی کیوں نہ ہو۔ یہ گروہ "مصری وطنیت" کی دعوت کی حد تک تو ایک ہی گروہ شمار ہوتا تھا۔ مگر اس کے خیالات و افکار کے چشمے دو حصّوں میں بٹے ہوئے تھے ۔ ایک حصّہ وہ تھا جس کی نمائندگی اخبار المقطّم کر رہا تھا ۔ المقطّم کے بارے میں یہ بات کوئی ڈھکی چھپی نہ تھی کہ وہ انگریزی استعمار کی وکالت کرتا ہے اور انگریز گورنر لارڈ کرومر سے رہنمائی حاصل کرتا ہے ۔ مصری وطنیت کا نظریہ انگریز خود فروغ دے رہا تھا ۔ کیونکہ انگریز چاہتا تھا کہ مصر کو عالمِ اسلام سے الگ تھلگ کر دیا جائے اور مصری قوم کے دماغ میں یہ بات راسخ کی جائے کہ اسے دوسری مسلمان اقوام خواہ وہ ترک ہوں یا ایرانی یا ہندی ، ان کی طرف دیکھنے کے بجائے صرف اپنے مفادات کی فکر کرنی چاہیے ۔ اس طرح انگریز ایک طرف عربوں کو ترکوں سے جدا کرنا چاہتا تھا اور دوسری طرف عربوں کو عربوں سے بیزار کر رہا تھا ۔ المقطّم اخبار تو انگریز نوازی میں یہاں تک بڑھ گیا تھا کہ وہ صاف صاف یہ لکھ رہا تھا کہ :

" انگریز مصر میں قیام کی مشقت اس لیے برداشت کر رہے ہیں کہ وہ مصریوں کو نظامِ ظلم سے نجات دلانا چاہتے ہیں اور انھیں عدل و انصاف کی بہار سے بہرہ اندوز کرنا چاہتے ہیں ۔ مصر کو افلاس کے چنگل سے نکالنے اور مصر میں متوازن اقتصادی نظام قائم کرنے کا سہرا انگریزوں کے سر ہے ۔"

اس جماعت کا ایک اور رسالہ المقتطف اس لَے کو مزید بڑھا رہا تھا ، اور مصری نوجوانوں کا ایک اچھا خاصا طبقہ اس سے متاثر ہو کر لارڈ کرومر کے گیت گانے لگ گیا تھا ۔ بلکہ ہمیں یہ کہنے میں بھی کوئی باک نہیں ہے کہ شیخ محمد عبدہٗ جیسے عالمِ دین بھی لارڈ کرومر کے ہمنواؤں میں شامل تھے ۔ جو شخص المقطّم اور المقتطف کے نظریات کی مخالفت کرتا اسے " ترکی گزیدہ " اور " ترک نوازی " کا خطاب دے دیا جاتا ۔ مگر یہ بات

بھی محتاج ثبوت نہیں ہے کہ المقطم اور المقتطف کے حامی وہ لوگ تھے جو اپنے مفادات کی تکمیل کے لیے الدوبارہ پیلس کی سرپرستی کے خواہش مند ہوتے تھے۔ اس مفاد پرست اور ابن الوقت عنصر نے الحزب الوطنی الحر کے نام سے بالآخر اپنی ایک الگ تنظیم قائم کر لی اور مصطفیٰ کامل کی الحزب الوطنی کی مخالفت کو اپنا مذہب قرار دے لیا۔

لادین قوم پرستوں کے لیڈر اور ترجمان

"مصری وطنیت" کی دعوت کا علم بردار دوسرا حصہ "حزب الامۃ" پر مشتمل تھا۔ اس کا تانا بانا مصری پاشاؤں اور جاگیرداروں سے عبارت تھا۔ اس کی رائے یہ تھی کہ مصر کا اصل اقتدار اب کرومر کے ہاتھ میں ہے لہٰذا اس کے ساتھ تصادم کی پالیسی نہیں توافق کی پالیسی اختیار کرنی چاہیے۔ حزب الامۃ کی تاسیس ۱۹۰۷ء میں محمود سلیمان پاشا کی سربراہی میں عمل میں آئی۔ ان پاشاؤں اور جاگیرداروں کی ساری سوچ اپنے ذاتی مفادات کے گرد گھوم رہی تھی۔ انھوں نے اپنے ساتھ چند ضعیف الایمان اور نفس پرست تعلیم یافتہ لوگوں کو بھی ساتھ ملا لیا جن میں نمایاں شخصیت لطفی السید کی تھی۔ "اخبار الجریدہ" ان کا ترجمان تھا۔ جہاں تک پاشاؤں اور جاگیرداروں کا تعلق ہے وہ تو محض اپنی دنیا پرستی کی خاطر حزب الامۃ کا سہارا لے رہے تھے۔ مگر جہاں تک لطفی السید اور دوسرے اُن ادباء اور فلاسفہ کا تعلق ہے جو حزب الامۃ کا فکری محاذ سمجھے جاتے تھے۔ وہ باقاعدہ ایک سیاسی دعوت اور اجتماعی نظریے کے علمبردار تھے۔ ان کا نظریہ فکر و نظر کی کھلی آزادی، یورپ سے تعاون اور زندگی کے تمام میدانوں میں یورپ کی اندھی تقلید تھا۔ وہ ثقافتی، اقتصادی اور سیاسی ہر لحاظ سے مصر کو مغرب کے رنگ میں رنگ دینے کی دعوت پیش کر رہے تھے۔ لارڈ کرومر اس عنصر کو جس کی پیشروی لطفی السیّد کر رہا تھا۔ "حزب الشیخ محمد عبدہ" کے نام سے پکارتا تھا اور

ان لوگوں کو مصر میں اپنی آئندہ امیدوں کا مرکز گردانتا تھا۔ الجریدہ انگریزی تسلّط کو "حقیقت" کی حیثیت سے پیش کرتا تھا۔ چنانچہ لطفی السیّد لکھتا ہے :

"مصری قوم امن چاہتی ہے۔ انگریز سے اسے مخلصانہ محبّت ہے۔ حکومت قانوناً خدیو مصر کے ہاتھ میں ہے اور عملاً کرومر کے ہاتھ میں ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ دونوں قسم کے اختیارات یکجا جمع ہو جائیں۔ یعنی قانونی حکومت بھی خدیو مصر کے بجائے کرومر کو دے دی جائے۔"

رہا اسلام کی بنیاد پر قوم کی شیرازہ بندی اور وطنیت کی تشکیل، تو یہ لوگ اس کے سخت خلاف تھے۔ اس گروہ کے ایک مشہور لیڈر عبدالحمید الزہراوی نے الجریدہ میں لکھا :

"حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد مسلمانوں کا سیاسی اتحاد ختم ہو گیا۔ اور حضرت علیؓ کی وفات کے بعد ان کا مذہبی اتحاد بھی ختم ہو گیا ہے۔ تیرہ سو سال سے جس اتحاد و اتفاق کی بنیاد مٹ چکی ہے اُسے کیوں زندہ کیا جائے۔"

دونوں گروہوں کی کش مکش

ایک طرف مصطفیٰ کامل اور فرید وجدی اور عبدالعزیز جاویش کی الحزب الوطنی تھی، اور دوسری طرف مختلف عناصر مختلف لبادوں میں برسرِ پیکار تھے۔ کوئی الحزب الوطنی الحر، کے نام سے موسوم تھا اور المقطّم اور المقتطف کی آڑ میں مفادات سمیٹ رہا تھا۔ اور کوئی حزب الامۃ، کے نام سے متعارف تھا اور الجریدۃ، کے ذریعہ دنیا پرستی میں مبتلا تھا، یا "حزب الشیخ محمد عبدہ" کے پردے میں مصر کو مغربیت میں رنگنے کے لیے کوشاں تھا۔ ان دو متضاد تحریکوں میں یہ فرق نمایاں طور پر محسوس ہو رہا تھا کہ الحزب الوطنی اور مصطفیٰ کامل کے اندازِ دعوت پر جذبات انگیزی اور ہیجان خیزی غالب ہے، اور حزب الامۃ اور مصطفیٰ السیّد یا الحزب الوطنی الحرّ دلیل و عقل کا سہارا لیتے ہیں، اور بڑے

دھیمے انداز سے نوجوانوں کے اندر لبرلزم اور میٹیریلزم کا ذوق اُتار رہے ہیں ۔ مصطفیٰ کامل اور اس کا اخبار اللّوا ، بڑے تُند لہجے اور تلخ انداز میں استعمار پر حملے کرتا تھا۔ وہ دین کی اساس پر مصری قومیّت کی تعمیر کا داعی تھا اور تمام مسلم اقوام کے اندر اتحاد و یگانگت کا علم بردار تھا۔ وہ ۱۸۴۰ء کے ترکی و مصری معاہدے کی پابندی کا اعلان کرتا تھا ۔ یہ معاہدہ ترکی اقتدار کے اندر مصر کی داخلی آزادی کی ضمانت فراہم کرتا تھا۔ اس کی رُو سے مصر پر ترکی اقتدار صرف اس حد تک رہ جاتا تھا کہ مصر آستانہ کو مقررہ خراج ادا کرتا رہے، اور مصر کے لیے ترکی کی طرف سے قاضی القضاۃ نامزد کیا جائے۔ مگر حزبُ الامۃ اور الحزب الوطنی الحرّ کی طرف سے مصطفیٰ کامل پر یہ الزام لگایا جاتا تھا کہ " وہ انگریزی استعمار کو ختم کر کے ترکی استعمار کو مستحکم کرنا چاہتا ہے"۔ یہی وجہ ہے کہ المقطّم مسلسل ایسے مضامین چھاپتا تھا جن میں وہ ثابت کرتا تھا کہ ترک ظالم اور انگریز عادل ہیں ۔ مصطفیٰ کامل دین و وطنیت میں تعارض کا قائل نہ تھا۔ وہ کہتا تھا کہ :

> " جب انگریز وطن پرست بھی ہوسکتا ہے اور پروٹسٹنٹ بھی تو مصری کیوں بیک وقت مسلمان اور وطن پرست نہیں ہوسکتا "۔

انگریزی اقتدار کی حکمتِ عملی

انگریزوں کی یہ کوشش تھی کہ مصر کے اندر ترکی نفوذ اور مذہبی عصبیت کو کمزور سے کمزور تر کیا جائے ۔ چنانچہ انگریز ہر اس شخص کی سرپرستی کرتا جو " خلیفۃ المسلمین " پر زبانِ طعن دراز کرتا۔ یا جو خدیو مصر کا جس کے پاس مصر کا قانونی اقتدار تھا مخالف ہوتا۔ یا جو انگریزوں سے تصادم کے بجائے " داخلی اصلاح " کا قائل ہوتا۔ چنانچہ انگریز مصطفیٰ کامل کا اس لیے دشمن تھا کہ مصطفیٰ کامل حب الوطنی کی تعریف یہ کرتا تھا کہ مصر سے انگریزوں کا انخلاء عمل میں آئے ۔ انگریز " خلافتِ عرب " کے نظریے کا جسے شریف حسین والیٔ مکہ نے بلند کر رکھا تھا اس لیے حامی و مؤید تھا کہ اس سے " خلیفۃ المسلمین " کی پوزیشن کمزور ہوتی تھی۔ ترک

نوجوانوں کی تحریک "ترکیا الفتاۃ" اور انجمن اتحاد و ترقی کے جو لوگ ترکی سے بھاگ کر مصر میں آکر پناہ لے رہے تھے، انگریز ان کا خیر مقدم کر رہا تھا۔ ان نوجوانوں نے مصر میں آکر اخبارات نکالے اور سلطان عبدالحمید پر تیز و تند حملے شروع کر دیے۔ اور جب سلطان عبدالحمید نے خدیو مصر عباس کو لکھا کہ ان مفرورین کو سلطان کے سپرد کیا جائے تو کرومر نے دخل اندازی کی اور عباس کو اس کام سے منع کر دیا۔ اسی طرح جو شخص خدیو مصر کی مخالفت کرتا کرومر اسے تھپکی دیتا۔ شیخ محمد عبدہٗ اور خدیو عباس کے درمیان جب تعلقات انتہائی خراب ہو گئے تو کرومر نے شیخ محمد عبدہٗ کی تائید و حمایت کی پالیسی اختیار کر لی۔ یہ کرومر کی حمایت کا نتیجہ تھا کہ شیخ محمد عبدہٗ عباس کی مخالفت کے باوجود مسند افتاء پر فائز رہے۔ نیز شیخ محمد عبدہٗ چونکہ داخلی اصلاح کے علم بردار تھے اس لیے بھی کرومر ان کا مدّاح تھا۔ شیخ محمد عبدہٗ کے رفقاء مصطفیٰ فہمی، ریاض پاشا، سعد زغلول، فتحی زغلول اور قاسم امین کو بھی اسی بنا پر انگریز کی تائید حاصل تھی کہ یہ لوگ خدیو مصر کے مخالف اور داخلی اصلاحات کے علمبردار تھے۔

الغرض انگریز نے ایک طرف مصری مسلمانوں کے دینی جذبہ اور اسلامی عصبیت کو کمزور کرنا شروع کر دیا تاکہ انگریزی نوآبادیوں کے اندر بسنے والے مسلمانوں کے باہمی روابط اگر منقطع نہ ہو سکیں تو کم از کم غیر مؤثر ہو کر رہ جائیں، اور دوسری طرف یہ ذہن پیدا کرنے لگا کہ مصری، فراعنہ کی اولاد ہیں۔ لبنانی فنیقی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ عراقی بابلی اور آشوری اقوام کے وارث ہیں اور حجازی بزرگ عربوں کے چشم و چراغ ہیں۔ اور حجازی ہی خلافتِ اسلام کے زیادہ حق دار ہیں۔ کیونکہ اسلام حجاز کی سرزمین سے پھوٹا ہے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ عثمانی خلافت سے کسی طرح عرب اپنا رشتہ منقطع کر لیں۔ عثمانی خلافت ان کے نزدیک اپنے عیوب و نقائص کے باوجود مسلمانوں کو اسلام کے نام پر متحد کرنے کی قدرت رکھتی تھی۔ مصر کے اندر انگریزوں نے خدیوی عباس کو ذلیل و رسوا کرنے کی مہم چلائی اور خود

مصریوں کے اندر انھیں ایسے لوگ مل گئے جو عباس کے عیوب کی تشہیر کرتے اور اس کی برائیوں کو خوب اُچھالتے۔ اس امر کا انھیں کوئی احساس نہ رہا کہ عباس کی کمزوری مصر میں انگریزوں کے پنجوں کو مضبوط تر کر دے گی۔

اس دور کے شعراء میں نسیم اور ولی الدین یکن کو جو مرتبہ و مقام حاصل تھا وہ کس سے مخفی ہے۔ مگر یہ وہی شعراء تھے جنھوں نے انگریزی سیاست کو شعر و ادب کے موتیوں سے چمکایا اور اُسی کردار کا ثبوت دیا جو ہندوستان میں انگریزی استعمار کی خدمت کے لیے بعض شعراء فخر و مباہات کے ساتھ اپنی ادبی قابلیتوں کو وقف کر چکے تھے۔ البتہ ان دو متضاد تحریکوں، مصطفیٰ کامل کی اسلامی وطنیت کی تحریک اور کرومر کے وفاداروں کی مصری وطنیت کی تحریک، کی سرگرمیوں سے جہاں ایک طرف مصر کی قدیم تاریخ اور فرعونی تہذیب و تمدّن کو زندہ کیا گیا وہاں اسلامی تاریخ اور عرب تہذیب کے روشن گوشے بھی اُجاگر ہوگئے۔ اگر اوّل الذکر پہلو سے نسیم اور ولی الدین یکن اور مصطفیٰ السیّد جیسے حزب الامّۃ اور الحزب الوطنی الحرّ کے زعماء یہ "کارِ خیر" سرانجام دے رہے تھے تو دوسرے پہلو سے مصطفیٰ کامل کو بھی شوقی اور بارودی جیسے شعراء، عبدالعزیز جاویش اور فرید وجدی جیسے صاحبِ علم و ادب کا تعاون حاصل تھا۔ پیچھے یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ مصری وطنیت کی تحریک دلیل و حجّت کے ساتھ اپنے آپ کو مصری عوام کے سامنے پیش کر رہی تھی اور اسلامی وطنیت کی تحریک صرف جوش و جذبہ کا نام تھا۔ اس کا فکری پہلو زیادہ واضح اور مضبوط نہ تھا۔

غیر مسلموں کی روش

یہ دونوں متضاد تحریکیں اس قدر آگے بڑھ گئیں کہ ۱۹۱۱ء میں دونوں کے اندر شدید تصادم برپا ہوگیا، اور معاملہ اسلامی وطنیت اور مصری وطنیت کی دعوت تک نہ رہا بلکہ مسلمان اور قبطی کا سوال اُٹھ کھڑا ہوا، اور مسلمانوں اور قبطیوں کے اندر سخت کشیدگی پیدا ہوگئی اور آزادی کی تحریکوں کا رُخ انگریز سے ہٹ کر ایک دوسرے کی مخالفت کی

جانب مڑگیا۔ نتیجۃً خود مصر کے وجود کو ایک شدید خطرہ لاحق ہوگیا۔ انگریز نہ صرف اس تماشے کو دیکھ کر لطف اندوز ہو رہا تھا بلکہ اسے درپردہ ہوا دے رہا تھا۔ اس کی یہ وہی سیاست تھی جو اس نے "لڑاؤ اور حکومت کرو" کے تحت ہر جگہ کر رکھی تھی۔ یہ بات محتاج دلیل نہیں ہے کہ قبطی اور مسلمان قرنوں سے مصر میں آباد چلے آرہے تھے، اور دونوں کے باہمی تعلقات خوشگوار چلے آرہے تھے۔ مگر انگریزوں نے اپنی نوآبادیوں کے اندر ہمیشہ یہ کوشش کی کہ وہاں کی اقلیتوں کو شہ دیتے، ان کی سرپرستی کرتے، اور ان کے ذریعہ سے اکثریت کو دباتے، شام کے اندر فرانس نے بھی مسلم اکثریت کے ساتھ یہی معاملہ کیا۔ چنانچہ اسی مکروہ سیاست کے تحت انگریزوں نے مصر میں قدم رکھتے ہی وہاں کی قبطی آبادی کو اکسانا شروع کر دیا۔ لارڈ کرومر کے الفاظ میں قبطیوں کو یہ امید ہونے لگی کہ اب انگریزی دور میں ان کا مرتبہ و مقام بالاتر ہو جائے گا۔

ایک طرف مسلمانوں نے انگریزی اقتدار سے مقاطعہ کی روش اختیار کر رکھی تھی، اور دوسری طرف قبطی آبادی نے اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھا کر تعلیم و اقتصاد کے میدان میں مفادات سمیٹنے شروع کر دیے اور نہ صرف عہدہ و منصب سے ہاتھ رنگنے شروع کر دیے، بلکہ مال و دولت سے بھی جھولیاں بھرنے لگے۔ یہ چیز مسلمانوں کے دلوں کے اندر ان کے خلاف بدظنی پیدا کرنے لگی۔ مسلمان انگریز سے تعاون کو غدّاری سمجھتے تھے، اور قبطی (مصری عیسائی) اس تعاون کو غنیمت سمجھ رہے تھے۔ یہاں سے دونوں قوموں کے اندر تعلقات کی خرابی کا آغاز ہوگیا۔ انگریزوں کے غلبے سے مسلمان دبتے گئے اور قبطی شیر ہوتے گئے، اور بات سیاسی اختلاف سے بڑھ کر مذہبی اختلاف تک پہنچ گئی۔ اور یہ سوال اٹھ کھڑا ہوا کہ ملک کا غدّار کون ہے اور وفادار کون۔

۱۸۷۷ء میں پہلا قبطی اخبار 'الوطن' جاری ہوا تھا۔ ان کا دوسرا اخبار صحیفۂ مصر ۱۸۹۵ء میں نکلا۔ اس جنگ میں ان دونوں اخبارات نے بھی خوب حصّہ لیا، اور

قبطیوں کو مسلمانوں کے خلاف جس قدر بھڑکا سکتے تھے انھوں نے بھڑکایا۔ انھوں نے قبطیوں کو ایک جداگانہ قوم کی حیثیت سے پیش کیا۔ بلکہ یہ دعویٰ کیا کہ قبطی اولادِ فراعنہ ہیں، اور مصر کے اصل مالک ہیں، اور ان کے جسم میں "بیرونی خون (عربوں کو بیرونی خون کہا گیا) کی قطعاً آمیزش نہیں ہے۔ جس بات کو مصری عوام ناپسند کرتے یہ اخبارات اس کا استحسان کرتے۔ ۱۹۰۸ء میں مصر کی وزارتِ عظمیٰ ایک قبطی کے ہاتھ آگئی جس کا نام پطرس غالی تھا۔ اس نے ۱۹۰۹ء میں اس پریس آرڈی ننس کو بحال کر دیا جو ۱۸۸۱ء میں عرابی پاشا کی بغاوت کے دوران مصر میں جاری ہوا تھا۔ مصر کے تمام مسلمان اخبارات نے اس آرڈی ننس کی بحالی پر احتجاج کیا۔ مگر قبطی اخبارات نے نہ صرف اس کا خیر مقدم کیا بلکہ احتجاج کرنے والوں کو "پاگل اور فتنہ جو" لکھا۔ ۱۹۱۰ء میں امریکی صدر ٹیوڈور روزویلٹ نے مصر کا دورہ کیا۔ قاہرہ کی مصری یونیورسٹی میں اس نے جو خطبہ دیا وہ چونکہ مصری عوام کی امنگوں کے خلاف تھا اور اس مصر کی دستوری تحریک کی جو ان دنوں عروج پر تھی، مخالفت کی گئی تھی۔ اس لیے مصریوں نے اس خطبے پر شدید احتجاج کا اظہار کیا۔ مگر قبطی اخبارات نے اس پر تحسین کے ڈونگرے برسائے اور روزویلٹ کو مصر کا سب سے بڑا خیر خواہ قرار دیا۔ قبطی اخبارات کا یہ رویہ مسلمانوں کے دلوں میں قبطیوں کے بارے میں مسلسل سوءِ ظن اور شکوک و شبہات کے جذبات جنم دے رہا تھا۔

خانہ جنگی

۲۰ فروری ۱۹۱۰ء کو پطرس غالی[1] الحزب الوطنی کے ایک پُرجوش کارکن جناب

---

[1] پطرس غالی کی پوری سیاسی زندگی خیانتوں اور سازشوں سے بھری ہوئی تھی۔ یہ شخص وزیر اعظم بننے سے پہلے وزیر خارجہ رہ چکا تھا۔ ۱۸۹۹ء میں اس نے بحیثیت وزیر خارجہ انگریزوں

ابراہیم ناصف الوردانی کے ہاتھوں قتل کر دیا گیا۔ اب کیا تھا، مسلمان اور قبطی کی جنگ کھلّم کھلا چھڑ گئی اور اخبارات کے صفحات سے نکل کر گلی کوچوں میں آ گئی۔ قبطیوں نے اب صرف اپنے اخبارات کو ہی جنگ کا ذریعہ نہ بنایا بلکہ برطانوی صحافت سے مدد کی اپیل کی۔ چنانچہ ڈیلی نیوز نے ان کا بھرپور ساتھ دیا۔ قبطیوں کے وفود بھی انگلستان گئے اور انھوں نے وہاں جاکر اپنی "مظلومیت" کا رونا رویا۔ ۵ مارچ ۱۹۱۰ء میں اسیوط میں قبطیوں نے اپنی ایک زبردست کانفرنس منعقد کی جس میں انھوں نے قبطیوں کے لیے متعدد مطالبات حکومت کے سامنے رکھے۔ ان مطالبات نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ اور مذہبی جنگ میں مزید اضافہ ہو گیا۔ دونوں مذاہب کے نافہم لیڈر اور انگریز کے جاسوس اور ایجنٹ اسے آخری حد تک پہنچانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔ جب ریاض پاشا نے وزارت عظمیٰ سنبھالی تو اس نے بڑی تگ و دو کے بعد اس آگ کو ٹھنڈا کیا۔ اگرچہ ۱۹۱۱ء میں آکر حالات کافی سنبھل گئے اور اتحاد و اتفاق کی باتیں ہونے لگیں۔ مگر یہ جنگ مصری معاشرے پر مستقل اثرات ڈال گئی، اور نہ صرف مسلمانوں اور قبطیوں کے اندر بلکہ خود جدید تعلیم یافتہ اور قدیم تعلیم یافتہ مسلمانوں کے اندر بہت سی غلط فہمیوں کو جنم دے گئی اور مستقبل کے مصلح کے لیے مشکلات کا ایک اور باب کھول گئی۔

سیاست داں اور مصلحین

اب تک تو ہم نے مصر کے سیاسی رجحانات اور سیاسی تحریکوں کا جائزہ لیا ہے۔

(بقیہ صد گذشتہ) کے ساتھ معاہدہ سوڈان پر دستخط کئے تھے اور اس معاہدے کی رو سے انگریزوں کو سوڈان کی حکومت میں براہ راست حصہ لینے کا حق دیا تھا، اور بھی متعدد واقعات ایسے ملتے ہیں جن سے یہ واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ یہ انگریزوں کا آلۂ کار تھا۔ اپنے آخری ایام میں یہ کوشش بھی کر رہا تھا کہ انگریزوں کے سوئز کے معاہدے کی مدت اور بڑھا دی جائے اور یہ معاہدہ ۱۹۶۸ء میں ختم ہونے کے بجائے ۲۰۰۸ء میں ختم ہو۔

اب ہم اس بحث کو ایک دوسرے انداز سے لیتے ہیں۔ پچھلی بحث میں ہم اشارۃً بتا چکے ہیں کہ مصری زعماء کا ایک گروہ ایسا بھی تھا جو سیاسی تحریکوں میں حصّہ لینے اور خصوصاً انگریزوں کے انخلاء کی بات کو اہمیت نہ دیتا تھا۔ اس گروہ کو ہم سیاست دانوں کا گروہ کہنے کے بجائے مصلحین کا گروہ کہیں گے کیونکہ اُس وقت یہ گروہ اسی لقب سے پکارا گیا تھا۔ سیاست دانوں اور مصلحین میں مابہ الامتیاز یہ نظریہ تھا کہ سیاست داں کہتے تھے مصر کی اصل مصیبت بیرونی تسلّط ہے اس لیے اس مصیبت کا علاج بیرونی تسلّط سے نجات میں ہے۔ مصلحین کہتے تھے کہ بیرونی تسلّط (انگریزی استعمار) کا سبب ہمارا اجتماعی بگاڑ ہے۔ لہٰذا ہم اگر معاشرتی خرابیوں کو درست کرلیں گے تو بیرونی تسلّط سے خود بخود نجات مل جائے گی۔

یہاں یہ بتا دینا بھی فائدے سے خالی نہ ہوگا کہ لارڈ کرومر سیاست دانوں کے مقابلے میں "مصلحین" کے نظریہ کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا۔ لارڈ کرومر اور شیخ محمد عبدہ کے درمیان خوشگوار تعلقات کی بنیاد یہی نظریاتی اتحاد تھا۔ سیاست دانوں کے خیالات تو ہم بالاختصار پیچھے بیان کر آئے ہیں۔ اب ہم "مصلحین" کے کام کا جائزہ لیتے ہیں۔ ان مصلحین کے اندر دو واضح گروہ پائے جاتے تھے۔ ایک گروہ اصلاح سے مراد تجدّد لیتا تھا، اور تہذیب مغرب کو جوں کا توں اختیار کرلینے کا داعی تھا، اور دوسرا گروہ اسلامی اور مشرقی روایات کو اختیار کرنے پر بھی زور دیتا تھا۔ یہ دونوں طرز کی "اصلاحی دعوتیں" سیاسی میدان پر بھی اثر انداز ہو رہی تھیں۔ مصری وطنیت کے حامی تہذیب مغرب کے داعیوں کی تائید کر رہے تھے۔ اور اسلامی قومیت کے علمبردار "مشرقیت" کے حامیوں کا ساتھ دے رہے تھے۔ ادب اور فن کے میدانوں میں بھی یہ تفریق برپا ہوگئی۔ ایک فریق فن و ادب کے اصول یورپ سے لینے لگا اور دوسرا فریق قدیم عربوں اور مشرقی روایات میں اپنے اصول تلاش کرنے لگا۔ تعلیم کے میدان میں بھی یہ دونوں خیالات آگھسے۔ ایک طرف متجدّدین رہا

مقلّدین مغرب) تھے جو تعلیم کے قدیم ورثے سے لوگوں کو متنفّر کر رہے تھے، اور انھیں ہوا کے رُخ پر چلنے کی تلقین کر رہے تھے اور دوسری طرف وہ لوگ تھے جو لباس، معاشرتی آداب اور طرز زندگی سب باتوں میں قدامت پرستی دکھا رہے تھے۔

حکمرانوں کا نفاق

ان دو طرز کے رجحانات نے مصری معاشرے کو تقسیم کر کے رکھ دیا اور دونوں طرز کے لوگوں میں منافرت کی ایک خلیج حائل ہوگئی۔ مگر ان دونوں کے درمیان ایک تیسرا طبقہ اُبھر آیا جس نے ان دونوں رجحانات کے درمیان مضحکہ خیز پیوند لگایا، اور معاشرے اور زندگی کے اندر دو رنگی کو جنم دے دیا۔ اس دو رنگی اور پیوند کی ابتدا خدیوی عباس کے قصر سے ہوئی۔ خدیوی عباس رمضان المبارک میں قصر عابدین میں تفسیر قرآن کے درس کا اہتمام کرتا اور مشرقیت یا اسلامیت کے حامیوں کو خوش کر دیتا، اور سال میں ایک مرتبہ قصر میں رقص وسرود کی محفل بھی جماتا اور تجدّد پرست گروہ کی ہمدردیاں بھی حاصل کرلیتا۔ یہ دو رنگی اور تناقض قصر عابدین سے اٹھا اور مصری معاشرے کے اندر ہر جگہ اور ہر میدان میں پھیل گیا۔ شوقی جیسا عظیم مصری شاعر جسے مصر کا علاّمہ اقبال کہا جاتا ہے۔ ایک طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان مبارک میں بے نظیر نعتیں کہتا ہے۔ اور دوسری طرف رنگ وطرب کی محفلوں پر بھی تعریفی قصائد دل کھول کر پیش کرتا ہے۔ اب ہم ذوالوجہین) گروہ کو سردست نظر انداز کرتے ہیں، اور مذکورہ صدر دونوں گروہوں پر الگ الگ نظر ڈالتے ہیں۔

متجدّدین کا کردار

مغربی تہذیب کے علمبردار زیادہ تر شامی اور لبنانی عیسائی تھے جو مصر میں آکر آباد ہوگئے اور کچھ وہ مصری تھے جنہوں نے یورپ میں تعلیم پائی تھی۔ یا مشنری اسکولوں سے پڑھ کر نکلے تھے۔ شامی اور لبنانی عیسائی دو حصّوں میں بٹے ہوئے

تھے ۔ ایک حصّہ انگریزی اثر و نفوذ کے تحت تھا اور دوسرا فرانسیسی اثرات کے تحت ۔ الاہرام فرانس کے نفوذ و اثر کا نمائندہ تھا اور المقطم اور المقتطف برطانوی نفوذ و اثر کے آئینہ دار تھے ۔ رہے مصری متجدّدین تو ان کی کیفیت عجیب و غریب تھی ۔ وہ ذہنی و فکری لحاظ سے جس سطح پر آ چکے تھے اس کی تصویر مصر کے ایک نامور مورّخ محمد حسین کی زبانی سُنیے :۔

" مصریوں کا جو گروہ تہذیب مغرب کا داعی بن چکا تھا یہ ان لوگوں پر مشتمل تھا جو تہذیب مغرب کی چکا چوند سے متاثر ہو چکے تھے، کیونکہ انھوں نے یا تو یورپ میں زندگی کا کچھ حصّہ گزارا تھا یا یورپین طرز کے اسکولوں میں تعلیم پائی تھی۔ انھوں نے اپنے سامنے جو مثالی نمونے رکھے ہوئے تھے یہ اس ثقافت سے ماخوذ تھے جس کا رشتہ اسلام یا عربیت سے دُور کا بھی نہ تھا ۔ وہ انگریزوں اور فرانسیسیوں کی جتنی تاریخ جانتے تھے اس کے مقابلے میں مسلمانوں اور عربوں کی تاریخ کا انھیں عشر عشیر بھی معلوم نہ تھا ۔ یورپی کلیسا اور اس کے مذہبی اختلافات کو تو وہ خوب جانتے تھے مگر فقہ اسلامی کے بارے میں ان کی معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں ۔ اسلامی اور عربی تہذیب کی نامور شخصیتوں کی تاریخ سے تو نابلد تھے جب کہ یورپی ادب و فکر کے نمایاں فضلاء و شعراء کے حالات انھیں پوری طرح ازبر تھے ۔ اپنی گھریلو زندگی میں وہ مغرب کے طور و اطوار کی نقّالی کرتے ۔ اپنے بچّوں کو وہ یورپین انّاؤں کے حوالے کرتے کہ وہ ان کی تربیت و پرداخت کریں۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب کے ساتھ ان کے ثقافتی، ادبی اور روحانی تعلقات مستحکم ہو چکے تھے، اور اسلام اور مشرق کے ساتھ ان کے ہر نوعیت کے روابط سرد مہری کا شکار ہو چکے تھے ۔ مغرب کے اہل قلم مشرقیوں کی پسماندگی کا سبب اسلام کے ساتھ ان کی وابستگی قرار دے رہے تھے ۔ یہی بات مصری متجدّدین کے ذہنوں میں راسخ ہو چکی تھی ۔ وہ یہ کہتے " اسلام ایک بالایہ مذہب ہے ۔ صدیوں

پیشتر اس مذہب نے بدوؤں کے معاشرے کو تو منظم کر لیا تھا لیکن اب
بیسویں صدی کی ماڈرن سوسائٹی کی قیادت اور تنظیم اس کے بس کا روگ
نہیں ہے۔"[1]

لارڈ کرومر ان لوگوں کے اندر ان خیالات کو خوب پختہ کر رہا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا:
جو مسلمان یورپ کے اخلاق سے آراستہ نہیں ہے وہ مصر کی حکمرانی کا اہل نہیں ہے۔"[2] حافظ
ابراہیم جیسا نامور شاعر ۱۹۰۶ء میں مصر میں امریکن گرلز کالج کی تقریب میں جو نظم پیش کرتا ہے
اس میں وہ صاف صاف کہتا ہے کہ:

لیتنا نقتدی بکم أو نجاریکم
عسی نستردّ ما کان ضاعا

(کاش ہم، اے مغربیو! تمہاری پیروی کرتے یا تمہاری ہمنوائی کرتے۔ اس
طرح شاید ہم اپنی گمشدہ عزت کو بحال کر لیتے)۔

مغربی تہذیب کی یلغار

ایک طرف مذکورہ بالا طبقے (لبنان و شام کے عیسائی اور مصر کے متجددین)
مغربی تہذیب کی پیروی اور افرنگیوں کی تقلید کا بھرپور پرچار کر رہے تھے، اور مصری
نوجوان کے دل و دماغ کو اپنی باتوں سے مسحور کر رہے تھے اور دوسری طرف مصر پر
مغرب کی مادّی ترقی کی یلغار مختلف شکلوں میں بڑھ رہی تھی۔ چنانچہ ۱۸۸۴ء میں ٹیلیفون
کی انگریزی کمپنی قائم ہوگئی۔ ۱۸۹۶ء میں قاہرہ میں پہلے سینما کا افتتاح ہوا۔ ۱۹۹۷ء
میں پہلی لائن بچھائی گئی۔ ۱۹۹۸ء میں نیشنل بنک قائم ہوگیا اور اس نے کرنسی نوٹ

---

[1] الاتجاهات الوطنیة فی الادب المعاصر ص ۲۵۹، ۲۶۰

[2] MODERN EGYPT ص ۵۶۹، ۵۷۰

جاری کر دیئے اور ساتھ ہی ساتھ ہر جگہ شراب خانے کھُل گئے۔ یہاں تک کہ دیہاتی آبادیوں اور مزدوروں کی کالونیوں تک پھیل گئے۔ بڑے بڑے شہروں میں لائسنس یافتہ قحبہ گری کا آغاز ہو گیا۔ اور شخصی آزادی کے نام پر لوگ کھلم کھلا منکرات کا ارتکاب کرنے لگے۔ گویا ان کے نزدیک شخصی آزادی کا یہ مفہوم تھا کہ انسان ہر پابندی سے آزاد ہو جائے اور کسی دین یا عُرف یا مصلحت کی پروانہ کرے۔ الغرض مغربی تہذیب اور مغربی فکر و ذہن کے اثرات مختلف قسم کی تحریکوں کی شکل میں اُبھرے۔ ان تحریکوں میں تین تحریکیں سرفہرست تھیں :

ایک شخصی آزادی کی تحریک اور مغربی طرز کے پارلیمانی نظام کی دعوت۔

دوسری دین اور ریاست کی تفریق کی تحریک۔

اور تیسری آزادی نسواں کی تحریک۔

ان تینوں قسموں کی تحریکوں کو الگ الگ کرنے سے ہماری بات زیادہ واضح ہو جائے گی۔

مطالبۂ پارلیمانی نظام

پہلی تحریک شخصی آزادی اور پارلیمانی نظام کی داعی تھی۔ اس تحریک کے حامی تقریباً تمام مصری زعماء تھے۔ جن میں مصطفےٰ کامل جیسے وطن پرست بھی تھے، اور لطفی السیّد جیسے اباحیت پسند بھی۔ یہ لوگ دراصل انقلاب فرانس اور فرانسیسی مفکّرین سے سخت متاثر تھے اور فرانسیسی انقلاب کا نعرہ بھی انھوں نے اپنا لیا تھا۔ یعنی آزادی، اخوت اور مساوات[1]۔ مصطفےٰ کامل اور ان کے ہمنوا شعراء اور اہلِ قلم نے پارلیمانی نظام

---

[1] فری میسن کا بھی یہی نعرہ ہے۔ بلکہ فری میسن کے لوگوں اور یہودیوں کے ذریعہ ہی یہ نعرہ فرانسیسی انقلابیوں تک پہنچا ہے۔ ملاحظہ ہو کتاب: " محاسنِ فری میسن" ص ۴، ۴۹، ۸۹، ۱۳۳

کے قیام کا مطالبہ کھڑا کر دیا اور برابر اس سلسلے میں تگ و دو کرتے رہے یہاں تک کہ مارچ ۱۹۰۷ء میں مجلسِ عمومی نے حکومت کے سامنے دستور اور پارلیمنٹ کے قیام کا مطالبہ کر دیا جو مصری تاریخ کا ایک جرأت مندانہ قدم تھا۔ ۱۹۰۷ء میں واقعہ دانشوائے کے بعد کرومر کو مصر سے بُلا لیا گیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ترکی کے اندر انقلاب برپا ہو گیا اور جولائی ۱۹۰۸ء میں عثمانی دستور صادر ہوا۔ ان باتوں نے مصری زعماء کی حوصلہ افزائی کی۔ یکم دسمبر ۱۹۰۸ء کو قوانین کی مجلس شوریٰ نے بھی مجلس عمومی کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ اور پارلیمانی زندگی کا مطالبہ کر دیا۔ خدیو عباس اور انگریزی استعمار کی کوششوں کے علی الرغم یہ تحریک زور پکڑ گئی۔ اس دور میں جس کتاب نے مصر کی سیاسی اور فکری دنیا پر سب سے زیادہ اثر ڈالا وہ عبدالرحمٰن الکواکبی کی تالیف طبائع الاستبداد ہے[1]۔ اس کتاب میں الکواکبی نے تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ نظامِ استبداد انسان کے اخلاق کو تباہ کر دیتا ہے۔ دین کو برباد کر دیتا ہے، تربیت کو بگاڑ دیتا ہے۔ قوم اس نظام کے تحت صحیح عزّت و شوکت سے ہرگز ہمکنار نہیں ہو سکتی۔ یہ نظام انسان کو چوپایوں سے بھی بدتر بنا دیتا ہے۔ یہ کتاب پہلے علی یوسف کے اخبار المؤیّد میں قسط وار شائع ہوئی اور پھر اسے کتابی صورت میں چھاپا گیا۔ الکواکبی ادب و بیان کی بے پناہ طاقت سے بہرہ ور تھا۔ اس نے اس کتاب کے ذریعے مصر کی سیاسی اور معاشرتی فضا میں تہلکہ

---

[1] الکواکبی حلب میں ۱۸۴۸ء میں پیدا ہوا اور جب وہاں ترکی والیوں کے مظالم سے اس پر عرصۂ حیات تنگ ہو گیا تو وہ مختلف اسلامی ملکوں کے اندر پھرتا پھراتا مصر آ گیا۔ وہاں اس نے دو کتابیں تصنیف کیں، ایک امّ القریٰ (۱۸۹۹ء) اور دوسری طبائع الاستبداد (۱۹۰۱ء میں) اس کی وفات ۱۹۰۲ء میں ہوئی۔ اس کے مکمل حالات کے لیے ملاحظہ ہو ڈاکٹر احمد امین کی کتاب "زعماء الاصلاح فی العصر الحدیث"

مچادیا اور استبداد و آمریت کے خلاف جذبات کا طوفان کھڑا کردیا۔

تحریکِ تفریقِ دین و سیاست

دوسری تحریک جو اس دور میں نمایاں طور پر اُبھری وہ دین اور سیاست کی تفریق کی تحریک تھی۔ اس تحریک کے برپا ہونے کا سبب بھی متجدّدین کی مغرب پرستی تھی۔ ان لوگوں نے مغرب کی مذہبی تاریخ اور کلیسا اور ریاست کی کشمکش کی داستانیں پڑھ رکھی تھیں اور انھیں سے متاثر ہوکر وہ اسلام کو بھی زندگی کے مختلف دوائر سے نکال کر صرف چند مخصوص مذہبی مراسم کے اندر محدود کردینا چاہتے تھے۔ ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ قرونِ وسطیٰ میں یورپ جن حالات سے دوچار تھا وہی حالات اب مصر میں پائے جاتے ہیں۔ لہٰذا مصر میں بھی ان حالات سے نجات پانے کے لیے مغرب کے پیش کردہ حل یعنی دین و ریاست کی تفریق کو اختیار کرلینا چاہیے۔ ڈاکٹر محمد حسین لکھتا ہے:۔

> "متجدّدین کے اندر اس غلط فہمی کو مزید اس بات نے راسخ کردیا کہ جو لوگ اسلام کے وکلاء تھے وہ اُسی اسلامی دنیا کے افراد تھے جو پسماندگی اور جہالت کا شکار تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں کے خیالات تمسخر و استہزاء کا ہدف بن چکے تھے۔ ثقافتی بے مائیگی کی وجہ سے یہ لوگ اکثر و بیشتر جاہلانہ طور پر مفید علوم و فنون کی مخالفت بھی کرنے لگتے اور یہ سمجھتے کہ یہ علوم و فنون دین کے خلاف ہیں۔ مزید برآں خدیوی اسماعیل کے دورِ حکومت سے اور علی الخصوص انگریزی استعمار کے دور میں سرکاری ملازمتوں کا ایسا نظام وضع کردیا گیا کہ دینی تعلیم رکھنے والے لوگ اصلاح کے میدان سے خارج کردیئے گئے اور قافلۂ حیات سے پیچھے رہ گئے۔ ان کا دائرہ کار مساجد کے اندر محدود ہوگیا۔ سرکاری مناصب اور معاشرے کے اندر کارفرمائی کے وسائل مغربی تعلیم رکھنے

والوں کے ہاتھ آ گئے، اور ان لوگوں نے جس طرح کی تعلیم پائی تھی اُسی کے مطابق اجتماعی اور عمرانی زندگی کی منصوبہ سازی کی۔ مغرب کی اندھی تقلید میں جو باتیں انھیں حاصل ہوئیں ان میں دو باتیں سر فہرست تھیں ایک اہل مذہب کی تذلیل اور دوسری امور دین کی تضحیک۔ کچھ خفیہ ہاتھ اس ذوق کو مسلسل شہ دے رہے تھے، اور جھوٹی اور غلط باتیں گھڑ گھڑ کر پھیلا رہے تھے۔ عالمی یہودیت علی الخصوص اس میدان میں سرگرم کار تھی[۱]

اصل ہدف۔ خاتمۂ خلافت

دین و ریاست کی تفریق کی تحریک کا اصل نشانہ عثمانی خلیفہ عبدالحمید خاں تھا۔ ظلم و استبداد کی جو مکروہ تصویریں پیش کی جا رہی تھیں وہ سلطان عبدالحمید کو سامنے رکھ کر تیار کی جا رہی تھیں۔ سلطان عبدالحمید کے پاس نہ صرف سیاسی اختیارات تھے بلکہ خلیفۃ المسلمین ہونے کی حیثیت سے وہ دینی اختیارات کا حامل بھی تھا۔ دین و سیاست کی تفریق کا مقصد یہ تھا کہ سلطان عبدالحمید خاں کو دونوں قسم کے اختیارات میں سے ایک قسم کے اختیارات سے دست بردار ہو جانا چاہیے۔ عرب زعماء کا مطالبہ یہ تھا کہ سلطان کے پاس سیاسی اختیارات رہیں اور مذہبی اختیارات (خلافت) عربوں کو مل جانے چاہئیں۔ کیونکہ عرب دین کا زیادہ فہم رکھتے ہیں۔ ترک زعماء تو مغرب کے الحادی نظریہ لبرلزم کے حامی تھے۔ اس لیے وہ مذہب کا بھی صفایا کر دینا چاہتے تھے۔ اس موضوع پر جو کچھ لٹریچر میدان میں آ رہا تھا وہ مصر میں چھپتا تھا۔ عثمانی قلمرو میں اسے کسی جگہ چھپنے کی گنجائش نہ تھی۔ اس لٹریچر کے مصنفین زیادہ تر لبنانی اور شامی تھے مگر وہ طبع اور تقسیم مصر میں ہوتا تھا۔ دین و دنیا کی تفریق پر شامیوں کی جو کتابیں

۱؎ الاتجاھات الوطنیہ۔ ص ۲۷۵ و ۲۷۶

منظرِ عام پر آئیں ان میں ایک کتاب عبدالرحمٰن الکواکبی کی امّ القریٰ تھی۔ اسی کتاب میں مصنّف نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ خلافت عربوں کو دے دی جائے اور سلطنت ترکوں کے پاس رہے۔ اس کی دلیل مصنّف نے یہ دی کہ ترک سیاست کو دین پر ترجیح دیتے ہیں۔ ان کو دین سے دلچسپی محض مسلمانوں کو خوش کرنے کے لیے ہے۔ عبدالرحمٰن الکواکبی کے اخلاص اور دینی حمیت میں تو کوئی شک نہیں ہے لیکن عربوں کا ایسا مخلص اور صاحبِ علم و فضل لیڈر بھی جب عثمانی ترکوں کی مخالفت پر اتر آیا تو عدل و انصاف کے تمام تقاضے پامال کر دیئے۔ مصنّف کو یہ ثابت کرنا تھا کہ عثمانیوں کو دین سے کوئی قلبی لگاؤ نہیں ہے۔ چنانچہ وہ اپنے اس دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے تاریخی حوالوں سے یہ بیان کرتا ہے کہ سلاطین آلِ عثمان سیاسی مفادات کے حصول کے لیے دین کو قربانی کرتے رہے ہیں[1]۔ بلکہ وہ یہاں تک لکھ دیتا ہے کہ سلطان محمد فاتح نے اسپین کے عیسائی حکمراں فرڈینانڈ اور ایزابلا سے خفیہ طور پر یہ معاہدہ کر رکھا تھا کہ سلطان محمد فاتح اندلس میں بنو احمر کی آخری عرب سلطنت کو ختم کرنے کے لیے ان دونوں عیسائی حکمرانوں کو پورا پورا موقع دے گا۔ چنانچہ اسی معاہدے کے تقاضے میں سلطان محمد فاتح نے اندلس کے ۵۰ لاکھ مسلمانوں کے کشت و خون اور ان کو بالجبر عیسائی بنائے جانے کو گوارا کر لیا۔ سلطان نے افریقہ کے بحری بیڑوں کو اندلسی مسلمانوں کی مدد سے روکے رکھا۔ اس کے عوض سلطان کو اس بحری بیڑے کی مدد سے پہلے مقدونیا اور پھر قسطنطنیہ پر حملہ کرنے اور عیسائیوں کی مشرقی امپائر کو شکست دینے کا موقع ملا[2]۔ الکواکبی نے عثمانی ترکوں پر یہ بھی الزام لگایا کہ جب اسپین

ے[1] امّ القریٰ۔ ص ۱۶۴، ۱۶۵۔

ے[2] حیرت ہے عبدالرحمٰن الکواکبی جیسا عرب لیڈر بھی عثمانی ترکوں کی اندھی مخالفت میں اس قدر شدت اختیار کر گیا کہ تاریخی حقائق کا بھی خیال نہ رکھا۔ محمد فاتح نے ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ پر قبضہ کیا ہے فرڈینانڈ اور ایزابیلا

کے عیسائی حکمران اندلس میں مسلمانوں میں بچی کھچی تعداد کو زندہ نذر آتش کر رہے تھے اور عثمانی فرماں روا سلطان سلیم مصر میں عباسی حکمرانوں کی بیخ کنی کر رہا تھا، اور اس ظلم وستم میں ہر حد کو پھاند رہا تھا یہاں تک کہ سلطان سلیم حاملہ عورتوں کو بھی قتل کرنے سے باز نہ آیا۔ سلطان عبدالمجید کے بارے میں الکواکبی نے لکھا:

"سلطان عبدالمجید یہ سمجھتا تھا کہ اس کی حکومت کا استحکام اس میں ہے کہ سود اور شراب کو جائز قرار دے دیا جائے اور حدود اللہ کو ساقط کر دیا جائے۔"

ترک قوم کے بارے میں مجموعی رائے قائم کرتے ہوئے الکواکبی بتاتا ہے کہ:

"ترکوں نے تاتاری مسلمانوں کے خلاف روسیوں کی مدد کی ہے اور جاوا اور ہندوستان کے مقابلے میں ہالینڈ کی مدد کی ہے۔"

الغرض عبدالرحمان الکواکبی نے عثمانی خلافت کے خلاف عرب عوام کو اکسانے اور ترکوں سے آزادی حاصل کرنے کے لیے تند و تیز لہجہ اختیار کیا۔ مذکورہ بیانات ہم نے اس کی کتاب ام القریٰ میں سے لیے ہیں۔ ان بیانات کا خلاصہ یہ تھا کہ عثمانیوں کے پاس صرف سیاسی اختیارات رہنے چاہئیں اور وہ بھی بامر مجبوری۔ باقی رہے مذہبی اختیارات تو وہ عربوں کو منتقل ہو جانے چاہئیں۔ الکواکبی کی ان تحریروں نے دین و سیاست کی تفریق کی آواز کو بڑی مدد پہنچائی۔ الکواکبی کے خیالات پر بڑی حد تک استعماری نظریات کا

(بقیہ صفحہ گذشتہ) اسپین کے تخت پر ۱۴۷۹ء میں کہیں جا کر بیٹھے ہیں۔ محمد فاتح کی وفات ۱۴۸۱ء میں ہوئی ہے اور غرناطہ کی اسلامی مملکت اس وقت تک قائم تھی، اور فرڈینانڈ اور ایزابلا کے ہاتھوں اس کا سقوط ۱۴۹۲ء میں ہوا ہے اور اندلسی مسلمانوں کا کشت وخون اور انھیں عیسائی بنانے کی مہم اس کے بھی چند سال بعد شروع ہوئی ہے۔ ——— عبدالرحمٰن الکواکبی نے عثمانی ترکوں پر جو بے بنیاد الزامات لگائے ہیں انہی کو بعد میں عرب قوم پرست جاہل عوام کو بہکانے کے لیے دہراتے رہے ہیں۔

اثر تھا۔ چنانچہ غیر مسلم حکومت اور جہاد اور خلافت کے باب میں وہ انہی باتوں کو دہراتا ہے جو مسٹر بلنٹ نے اپنی کتاب "اسلام کا مستقبل" میں لکھی ہیں[1]۔

شامی لیڈروں نے جو کتابیں مصر میں چھاپیں ان میں مذکورۃ الصدر کتاب ام القریٰ کے علاوہ ایک اور کتاب بڑی کثرت سے پھیلی۔ وہ کتاب سلیمان بستانی کی تالیف "ذکریٰ و عبرۃ" تھی۔ اس کتاب میں اس عیسائی مصنف نے دولتِ عثمانیہ کا نفاذ دستور سے پہلے اور نفاذ دستور کے بعد، دونوں ادوار کا جائزہ لیا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۰۸ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں بھی مصنف نے صحیح اور وضعی حکایات کی مدد سے عثمانی خلافت کی انتہائی سیاہ تصویر پیش کی ہے، اور ظلم واستبداد کا ایسا بھیانک نقشہ پیش کیا ہے جس سے آزادی پسند ترکوں اور یورپی اقوام جو عثمانی سلطنت کو تقسیم کرنے کے منصوبے بنا رہی تھیں بڑی مدد ملی۔ نسیم، ولی الدین یکن اور حافظ ابراہیم جیسے شعراء ان خاکوں میں مزید رنگ آمیزی کر رہے تھے۔

فتنۂ آزادئ نسواں

تیسری تحریک آزادئ نسواں کے مطالبے پر مشتمل تھی۔ یہ تحریک عورت کو زندگی کے ہر میدان میں شریک کرنا چاہتی تھی۔ سابقہ دونوں تحریکوں سے اس کا گہرا رشتہ تھا۔ کیونکہ سابقہ دونوں تحریکیں شخصی آزادی کی علمبردار تھیں۔ شخصی آزادی صرف مردوں ہی کو درکار نہ تھی بلکہ عورتوں کو بھی اس میں اپنا حصہ ملنا چاہیے تھا۔ اس موضوع پر قاسم امین کی دو کتابیں یکے بعد دیگرے منصۂ ظہور پر آئیں۔ ۱۸۹۹ء میں تحریر المرأۃ (عورت کی آزادی) اور ۱۹۰۰ء میں المرأۃ الجدیدۃ (جدید عورت)۔ اس دور میں ان کتابوں کی طباعت نے ایک شدید ہنگامہ برپا کر دیا۔ اور تقریباً نصف صدی تک ان پر ردّ و قدح ہوتی رہی۔ پہلی کتاب

---

[1] ملاحظہ ہو "اسلام کا مستقبل" ص ۲۴، ۲۵۔

ہیں مصنّف نے زیادہ تر کوشش اس بات پر صرف کی ہے کہ پردہ اسلام سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ اسلام عورت کو مُنہ اور ہاتھ ننگے رکھنے کی اجازت دیتا ہے۔ دوسری کتاب میں مغربیت کا پورا غلبہ ہے۔ اور مصنّف مصری عورت کو انگریز عورت اور فرانسیسی عورت کے ہم پلّہ اور ہم رنگ دیکھنا چاہتا ہے۔

ان دونوں کتابوں کے ذریعے قاسم امین نے مصری معاشرے کے اندر کس نوعیت کے افکار پھیلائے ان کا ایک جائزہ ہم ان کتابوں کے الگ الگ مطالعہ سے کر سکتے ہیں۔ تحریرالمرأۃ میں مصنّف نے چار مسائل پر بحث کی ہے۔ پہلا مسئلہ پردہ ہے جس پر مصنّف نے کتاب کے اکثر وبیشتر صفحات سیاہ کیے ہیں۔ دوسرا مسئلہ زندگی کے جملہ معاملات میں عورت کی شرکت ہے۔ تیسرا مسئلہ تعدّدِ ازدواج کی بحث کے لیے مخصوص کیا گیا ہے اور چوتھے مسئلہ میں طلاق پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔ ان چاروں مسائل پر مصنّف نے جو مسلک اختیار کیا ہے وہ بعینہ وہی ہے جو اہلِ مغرب اختیار کرتے ہیں۔ مگر مصنّف نے ظلم یہ کیا ہے کہ اس مسلک کو اسلام کا مسلک ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

مثلاً پردے کے بارے میں وہ کہتا ہے کہ شریعت اسلامی میں ایسی کوئی نص نہیں پائی جاتی جو پردے کو فرض ٹھیراتی ہو۔ اس کے خیال میں یہ پردہ ایک رواج کے تحت مسلمانوں نے دوسری اقوام کے خلط ملط سے اختیار کیا تھا۔ جسے بعد میں دین سمجھ لیا گیا اور جو لوگ پردے کی یہ دلیل دیتے ہیں کہ معاشرے کو فتنے سے بچانا مقصود ہے۔ قاسم امین ان کو یہ جواب دیتا ہے کہ مردوں کو کیوں برقع نہیں پہنا دیا جاتا۔ کیا عورت مرد کی نسبت ارادے اور ضبطِ نفس کی طاقت کم رکھتی ہے۔ تعدّدِ ازدواج اور طلاق کے باب میں بھی اُس نے اسی نوعیت کی گُل افشانیاں کی ہیں اور جا بجا علمائے دین اور فقہائے اسلام پر پھبتیاں کسی ہیں۔ اس کتاب کی مخالفت تو بہت کی گئی مگر اس کے جواب میں جو کچھ شائع ہوا وہ زیادہ تر اخباری مضامین تھے۔ البتہ محمد طلعت حرب نے تربیۃ المرأۃ والحجاب

(عورت کی تربیت اور پردہ) کے نام سے ایک تنقید لکھی، جو دینی پہلو سے تو مضبوط تنقید تھی مگر اُس بنیادی فکر کا ٹھوس جواب نہیں تھا جو قاسم امین کی کتاب کی تہ میں کام کر رہی تھی۔

تحریر المرأۃ کی اشاعت کے ایک ہی سال بعد مصنّف ایک اور کتاب میدان میں لے آیا۔ یعنی المرأۃ الجدیدۃ اس کتاب میں اس نے دین و شریعت کے باب میں اپنی وہ ظاہری نسبت بھی ختم کر دی جو پہلی کتاب میں اختیار کی تھی۔ کیونکہ اس کتاب میں اُس نے تمام مسلّمات اور عقائد کا انکار کر دیا۔ خواہ وہ دین کے ذریعہ انسانوں کو ملے ہوں یا اور طریقے سے۔ اس نے اپنی بحث کی بنیاد "تجربہ" اور "امر واقع" پر رکھی۔ اور اس کا نام اس نے "علمی استدلال" رکھا۔ اس علمی استدلال کی آڑ میں مصنّف نے عورت کو اباحیت، دینی قیود سے آزادی اور معاشرے کی تمام روایات و آداب کے خلاف بغاوت پر اکسایا۔ اور دل کھول کر مغرب کی تقلید کی دعوت دی، اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مسلمانوں کے انحطاط اور زوال کا اصل سبب موجودہ خاندانی نظام اور عورت کا پردہ اور شرعی احکام کی پابندی ہے۔ اگر کوئی غیر مسلم اسلامی معاشرت کے خلاف کوئی کتاب لکھنا چاہتا تو اس سے بہتر ہرگز نہ لکھ سکتا تھا۔

اسلامی اقدار پر معذرت خواہانہ رویّہ

تہذیب مغرب کو اپنا کر مصر کی ترقی کے لیے کوشش کرنے والے گروہ کے خیالات اور کارنامے کسی قدر آپ کو معلوم ہو چکے ہیں۔ اب اس گروہ کی جدوجہد بھی دیکھ لی جائے، جس کے نزدیک صحیح نشاۃِ ثانیہ وہ ہے جو دین کی اتباع اور دینی روایات کی پیروی میں ہے۔ اس گروہ کو جو بات زیادہ مبتلائے تشویش و اضطراب کیے ہوئے تھی وہ یہ تھی کہ جو مسلمان نوجوان مغربی تمدّن کے فریب میں آ چکا ہے وہ دین سے نسبت کو ایک گالی اور دینی حکم کی پابندی کو عار سمجھتا ہے۔ یہاں تک کہ اُس دور کا ایک ادیب طٰہٰ حسین یونیورسٹی میں زبان و

ادب کے موضوع پر جب ایک لیکچر دینے لگتا ہے تو وہ اپنے لیکچر کا آغاز حمد و ثنا سے نہ کرنے کی معذرت کرتا ہے اور اس معذرت کی وجہ یہ بیان کرتا ہے کہ:

"اگر میں اس لیکچر کا افتتاح حمد و صلوٰۃ سے کروں گا تو حاضرین یہ سن کر مجھ پر ہنسیں گے کیونکہ یہ طرز عصرِ نو کے مزاج کے خلاف ہے۔"[۱]

یہ گروہ مغرب کی ترقیوں کے خلاف تو نہیں تھا، مگر یہ چاہتا تھا کہ دین کو ترک کیے بغیر بھی وہ ترقی حاصل کی جا سکتی ہے جو مغرب نے کی ہے۔ دین کے بارے میں اس گروہ کا اخلاص تو شک و شبہ سے بالا تھا لیکن مغرب کے سامنے یہ معذرت خواہانہ انداز میں بات کر رہا تھا اور مغربی تہذیب سے مرعوبیت اس کی بات بات سے مترشح ہو رہی تھی۔ بہرحال اس گروہ نے طوفان شر و فساد کے اندر اسلام کے گُن گائے اور اسلامی تاریخ اور اسلامی روایات کا چرچا کیا۔ محرّم کا دیوان اسلام کی قدیم شان و شوکت کے ذکر سے بھرا ہوا ہے۔ کاشف صاف صاف کہتا ہے کہ مسلمانوں کی پسماندگی کا سبب دین سے بُعد ہے۔ شعراء میں شوقی اس میدان میں پیش پیش ہے۔

اس گروہ کے اہلِ علم و شریعت کے سامنے اصل کام یہ ہے کہ وہ لوگوں کے ذہنوں سے دین کا غلط تصوّر نکال کر صحیح تصوّر بٹھائیں۔ چنانچہ وہ غلط عقائد اور بدعات و خرافات کے خاتمہ کے لیے اپنی پوری توجہ صرف کرتے ہیں۔ شیخ محمد عبدہٗ، عبداللہ الندیم اور عبدالرحمٰن الکواکبی اور ان کے دوسرے ساتھی اس میدان میں نمایاں معرکے سر انجام دیتے ہیں۔

الوقائع المصریۃ (۱۸۸۰ء) میں شیخ محمد عبدہٗ نے مشائخ طریقت اور میلاد النبیؐ کی بدعات پر مقالات لکھے۔ عبداللہ اور الندیم نے مجلۃ الاستاذ کے ذریعہ بدعات کے خلاف مہم جاری کی۔ الکواکبی نے امّ القریٰ میں غالی صوفیاء کی خبر لی۔ اس دَور میں مصر میں مذہب کے نام سے جو

---

[۱] مجلۃ الہدایۃ شمارہ اکتوبر و نومبر ۱۹۱۱ء

رسم و رواج جاری تھے وہ اس جاہلیت کا عکس پیش کر رہے تھے۔ جس میں مشرکین مکّہ گرفتار تھے۔ کسی بھی مصلح کے لیے ایسے تاریک حالات میں کام کرنا آسان نہ تھا۔

شیخ محمّد عبدہٗ کی شخصیّت

اس دور کی اصلاحی کوششوں میں شیخ محمد عبدہٗ کا نام سرِ فہرست آتا ہے۔ اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ شیخ محمد عبدہ کے کام کو نسبتاً تفصیل سے بیان کریں۔ شیخ کے کام کا اگر ہم خلاصہ بیان کرنا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ اسلام اور مغربی تہذیب کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنا چاہتے تھے۔ شیخ محمد عبدہٗ، جمال الدین افغانی کے شاگرد تھے اس لیے ہم شیخ محمد عبدہٗ کی تحریک کو جمال الدین افغانی کی تحریک ہی کا عکس سمجھتے ہیں[۱]۔

---

[۱] شیخ محمد عبدہٗ کے بارے میں ان کی زندگی میں بھی اور بعد میں بھی دو قسم کی رائیں پائی گئی ہیں۔ شیخ محمد عبدہٗ کے شاگرد علاّمہ رشید رضا اور ان کے دیگر ساتھی شیخ محمد عبدہٗ کو مجتہد فی الدین کا درجہ دیتے ہیں، اور اخلاص و عزیمت کے لحاظ سے انھیں انتہائی درجہ کا امام تصوّر کرتے ہیں۔ مگر دوسری طرف ان کے معاصر اور غیر معاصر علماء نے ان پر دین سے انحراف کا الزام لگایا ہے اور ان سے یہ شکایت کی ہے کہ انھوں نے دین کو اعدائے دین کے مقاصد کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ اگر ہم ان دونوں گروہوں کے خیالات سے ہٹ کر بھی دیکھیں تو چند باتیں صاف نظر آتی ہیں:

(۱) مغربی سیاست دانوں کی کتابوں میں بکثرت شیخ محمد عبدہٗ کے مدرسۂ فکر اور تحریک اصلاح کی تحسین و تعریف کی گئی ہے۔ اور یہ کہا گیا ہے کہ انھوں نے مغرب کی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اور خاص طور پر یہ خدمت کہ انھوں نے مغربی استعمار اور مسلمانوں کے درمیان عداوت کو کم کیا ہے۔ اور اگر یہ عداوت قائم رہتی تو مسلمانوں کے اندر مغربی استعمار کے خلاف شورشیں برپا رہتیں اور کبھی ختم نہ ہوتیں۔ ملاحظہ ہو MODERN EGYPT ج ۲ ص ۱۷۹ تا ۱۸۱

WHITHER ISLAM ص ۶۹، ۱۶۳، ۱۷۱، ۱۷۲ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

علامہ عبدہٗ کی دعوت کو ہم دو قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک قسم وہ ہے جو پیرس جلاوطنی سے پیشتر کی ہے، اور دوسری قسم وہ ہے جو جلاوطنی کے بعد انھوں نے مصر واپس آکر اختیار کی ہے۔ ان دونوں قسموں میں ہمیں نمایاں فرق محسوس ہوتا ہے۔ پہلی قسم میں ان کی جملہ مساعی کا نقطۂ ارتکاز اسلامی اتحاد کی حمایت و تقویت ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب وہ جمال الدین افغانی مرحوم کے ساتھ وابستہ تھے اور ملتِ اسلامی کا شیرازہ مائل بہ انتشار دیکھ کر اسلامی اتحاد (جسے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۹) GREAT BRITAIN IN EGYPT ص ۱۶۵ و ۱۶۷

ISLAM IN MODERN HISTORY ص ۶۳ و ۶۷

الاتجاهات الحديثة في الاسلام ص ۶۴ و ۷۲ و ۸۴

التاريخ السري لاحتلال انجلترا مصر: مقدمہ کتاب۔

زعماء الاصلاح في الازهر۔ باب پنجم۔

مصر میں انگریز حکام کی ۱۹۰۵ء و ۱۹۰۶ء کی رپورٹیں۔

(۲) شیخ محمد عبدہٗ فری میسن کے ممبر تھے۔ مصر میں فری میسن کا ایک اہم رکن اپنی کتاب فضائل الماسونية میں لکھتا ہے کہ جمال الدین افغانی اور ان کی جماعت لبنان لاج میں آتے اور تقریریں سنتے تھے، اور جب لبنان لاج میں امریکی نمائندہ آیا تو اس نے شیخ محمد عبدہٗ کو لاج کا بہت اونچا درجہ پیش کیا (ص ۱۲۴)۔ طہران یونیورسٹی نے ۱۹۶۳ء میں جو دستاویزات چھاپی ہیں انھوں نے اس بات کی تصدیق کر دی ہے۔ خود شیخ محمد عبدہٗ کے شاگرد رشید علامہ رشید رضا نے بھی شیخ محمد عبدہٗ کی جو سوانح عمری لکھی ہے اس میں اس بات کی تصدیق کی ہے۔ ملاحظہ ہو کتاب: تاریخ الاستاذ الامام ج اوّل ص ۴۰، ۴۶، ۴۸، ۸۱۹، ۸۷۳۔ راقم کے نزدیک شیخ محمد عبدہٗ کی شخصیت اسی مرتبہ و منزلت کی حامل ہے جو برطانوی ہند میں سر سید احمد خاں کی تھی۔ آپ سر سید مرحوم سے اختلاف تو کر سکتے ہیں لیکن ان کے اخلاص کا انکار نہیں کر سکتے۔

"جامعہ اسلامیہ" کے نام سے یاد کیا جاتا تھا) کی تحریک برپا کردی تھی۔ ان کی دعوت کی دوسری قسم پہلی قسم سے غیر معمولی حد تک مختلف نظر آتی ہے۔ دوسری قسم کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام اور تہذیب مغرب یا اسلام اور جدید مغربی نظریات کے درمیان ہم آہنگی پیدا کی جائے۔

دورِ اوّل کی دعوت میں علاّمہ عبدہٗ ملّت اسلامی کے اندر پائے جانے والے اخلاقی اور معاشرتی امراض کے خلاف برسرِ پیکار رہے۔ مسلمانوں کی کم کوشی، ضعف ارادہ، امورِ دنیا میں ان کی پسماندگی، دشمنوں کے مقابلے سے دست برداری، غلامی سے نجات پانے میں کوتاہی اور تقدیر کا غلط تصوّر اُن کی دعوت کا نشانہ تھے اور ان امراض پر وہ تابڑ توڑ حملے کرتے رہے، اور قرآن وسنّت کی مدد سے اور تاریخ اسلامی کی جذبہ انگیز مثالوں کی بدولت وہ برابر غافل لوگوں کو بیدار کرنے کی کوشش کرتے رہے، اور ان پر واضح کرتے رہے کہ دین چند کلمات کا نام نہیں ہے جنہیں زبان سے وقتاً فوقتاً دہرا لیا جائے بلکہ دین ایسے عقیدہ کا نام ہے جو مسلمان کے جملہ معاملات واحوال پر غالب رہنا چاہیے۔

لیکن جب علاّمہ جلا وطنی کے بعد واپس مصر آئے تو ان کی مساعی نے رنگ دیگر اختیار کرلیا۔ ایک طرف انھوں نے مضامین ومقالات کے ذریعہ جامع ازہر میں عصری علوم کو شامل کرنے کی تحریک اٹھادی اور دوسری طرف قرآن اور احادیث کی تشریح وتعبیر کے ذریعہ تہذیب مغرب اور اسلام میں منافرت کی خلیج کو پاٹنا شروع کردیا۔ جہاں تک جامع ازہر کی اصلاح کا تعلق ہے بے شک یہ قدیم تعلیمی ادارہ جس پس ماندگی اور جمود کا شکار تھا اور جس طرح کے دنیا پرست اور کم نظر علماء کے ہاتھ میں تھا، اور بیسویں صدی کا آغاز ہوجانے کے باوجود وہ جس شدّت کے ساتھ اپنے آپ کو پانچویں صدی کے خول سے نکالنے کے لیے انکار کررہا تھا، ان سب باتوں کے خلاف علاّمہ عبدہٗ کی آواز نہایت بروقت اور قابلِ استحسان تھی۔ دوسری طرف علاّمہ عبدہٗ نے ازہر میں اپنے دروس کے اندر اور گھروں میں منعقد کی جانے والی محفلوں کے اندر اور اخبارات میں مقالات کے ذریعہ زندگی کے مختلف مسائل پر اپنی جرأت مندانہ

آرار، اور فتاویٰ کا اعلان شروع کر دیا۔ ان کے درسوں اور محفلوں میں اسکولوں کے اساتذہ، ازہری علمار، رجال قانون وقضا اور ارباب حکومت تک شریک ہوتے۔ شیخ احمد ابراہیم، حافظ ابراہیم، محمد کرد علی، احمد فتحی زغلول، رفیق العظم، قاسم امین، اور شیخ عبدالعزیز جاویش؛ جیسے اکابران کی محفلوں کے روح رواں تھے۔ ان درسوں اور محفلوں میں انھوں نے جو آرار بیان کی ہیں اور جو فتاویٰ صادر کیے ہیں ان میں بلاشبہ لبرل ازم پایا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت آج تک مابہ النزاع بنی ہوئی ہے۔ اس وقت عرب ممالک کے جو لوگ تجدّد کا مذہب اختیار کیے ہوئے ہیں وہ اپنے خیالات کا استدلال علاّمہ شیخ عبدہٗ کے فتاویٰ سے کرتے ہیں۔

خلافت عثمانی کا خاتمہ

پہلی عالم گیر جنگ نے مصر کے حالات پر شدید اثر ڈالا، اور وہاں مختلف فکری اور اخلاقی تحریکوں نے اب ایک نئے رنگ سے مصری معاشرے کے اندر مدّوجزر پیدا کر دیا۔ اس دَور میں جن سیاسی اور مذہبی لہروں نے سب سے زیادہ قومی پیمانے پر طوفان انگیزی کی ان میں سرفہرست اسلامی خلافت کا مسئلہ ہے۔

اپنی تمام رنجشوں کے باوجود مصری قوم مجموعی طور پر اسلامی خلافت کے ساتھ وفاداری بشرطِ استواری کا رشتہ رکھتی تھی۔ ۱۸ دسمبر ۱۹۱۴ء کو انگریزوں نے مصر پر اپنی "سرپرستی" کا اعلان کر دیا۔ اور مصر کو ترکی سے کلیتہً کاٹنے کے لیے خدیوی عباس کو معزول کر کے امیر حسین بن کامل کو تخت پر بٹھا دیا اور اسے "سلطان" کا لقب دے دیا۔ اور مصر کے لیے ترکی قاضی القضاة کا منصب بھی ختم کر دیا جو مصر اور ترکی کے مابین ایک آخری رشتہ تھا۔ اس سب کے باوجود مصری قوم نے ترکی کی اسلامی خلافت کے ساتھ ______ جیسی کچھ بھی وہ تھی ______ اپنی وفاداری کو ختم نہ کیا۔ اور ہنگامی قوانین کے نفاذ، اخبارات پر سنسر شپ اور استعماری فوج کی تشدّد آمیز کارروائیوں کے باوجود نئی صورتِ حال کے خلاف عوام مظاہرے کرتے

رہے۔ مصری عوام نے سلطان حسین کے اقتدار کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ دو مرتبہ اس پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ وزیر اوقاف پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ وزیر اعظم کی طرف سے ازہریوں کی زبان بندی کی گئی۔ ۱۹۱۸ء میں مصر کے اندر انگریزوں کے خلاف کئی خفیہ تنظیمیں قائم ہوئیں جو سنوسیوں کے ساتھ مل کر انگریزوں کا مصر سے انخلاء چاہتی تھیں۔ محمد فرید جسے مصطفیٰ کامل کا دایاں بازو شمار کیا جاتا تھا جلاوطنی کے باوجود خلافتِ عثمانیہ کی حمایت کر رہا تھا۔ انگریزوں نے جب مصر کو عثمانی خلافت کے خاتمے کے لیے اپنی خفیہ کارروائیوں کا اڈہ بنایا۔ اور مصریوں پر جنگ کے اندر کھینچا، اور جنگی مصارف کے نام پر ان سے بھاری بھرکم چندے وصول کیے گئے[1]، تو مصریوں کے جذبات انگریزوں کے خلاف اور بھڑک گئے۔ مگر مصر کا ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو انگریزوں کی خدمت بجالانے میں پیش پیش تھا۔ ۱۵ ستمبر ۱۹۱۵ء کو مصری وزیر اعظم نے یہ تقریر کی کہ جرمن ظالم اور انگریز عادل ہیں۔ مصری علماء کے ایک گروہ نے مصری عوام کے نام ایک مکتوب شائع کیا، جس میں انھیں اولی الامر کی اطاعت کی تلقین کی۔ اس سب کے باوجود مجموعی طور پر مصری قوم ترکوں کے ساتھ تھی۔ نامور مصری شاعر محرم نے اپنے مشہور قصیدے کے مطلع میں کہا:

الترک جند اللہ لولا بأسہم

لم یبق فی الدنیا مقیم اذان

---

[1] ان چندوں کی تفصیل یہ ہے:

۱۹۱۵ء میں ۱ لاکھ ۱۲ ہزار پونڈ سے زیادہ۔

۱۹۱۶ء میں ۱ لاکھ ۱۹ ہزار پونڈ سے زیادہ۔

۱۹۱۸ء میں ۲ لاکھ ۲۶ ہزار پونڈ۔

مصر سے جو جنگی چندہ جمع کیا گیا وہ اس قدر تھا کہ چندہ کے لحاظ سے مصر تمام دوسرے ممالک میں دوسرے نمبر پر تھا۔

(ترک اللہ کے سپاہی ہیں، اگر ان کا دبدبہ نہ ہوتا تو دنیا کے اندر کوئی اذان دینے والا نہ رہتا)۔

چار سال تک مصر شدید بحران کی کیفیت میں مبتلا رہا اور آخر کار مصطفیٰ کامل کی قیادت میں مصر میں انگریزوں اور انگریزوں کے آلۂ کار حکومت کے خلاف ۱۹۱۹ء میں بغاوت پھوٹ پڑی۔ اس بغاوت میں انگریزی فوجوں اور انگریزوں کی ڈھڈی حکومت نے مصریوں پر جو مظالم کیے ہیں وہ ناقابلِ بیان ہیں۔ جب ترکی پر اتحادی فوجوں کا قبضہ ہوا اور آستانہ کے اندر دشمنوں کی فوجیں گھس گئیں تو مصر کے اندر صفِ ماتم بچھ گئی۔ حافظ ابراہیم کا یہ قصیدہ بچے بچے کی زبان پر تھا:

ایا صوفیا حان التفرق فاذکری
عهود کرام فیك صلّوا وسلّموا

(اے ایا صوفیا! اب جدائی کا وقت آگیا ہے، مگر تو ان بزرگ انسانوں کے ایام یاد رکھنا جنہوں نے تیرے اندر نمازیں گزاریں)۔

انہی پُرملال حالات میں جب اناطول کے اندر مصطفیٰ کمال پاشا کی قیادت میں ترکوں نے آزادی کی جنگ شروع کردی تو مصریوں کے چہرے یکایک دمک اٹھے اور انھوں نے "غازی" مصطفیٰ کمال پاشا پر امیدوں کی نگاہیں مرکوز کردیں۔ اور جب اس نے اناطول کے بعض علاقے یونانی فوجوں سے آزاد کروالیے تو شوقی بک نے یہاں تک کہہ دیا:

الله اکبر کم فی الفتح من عجب
یا خالد الترك جدّد خالد العرب

(اللہ اکبر! یہ فتوحات کس قدر حیرت انگیز ہیں، اے ترکوں کے خالد عربوں کے خالد کی یاد تازہ کردی)۔

مصطفیٰ کمال نے جب آستانہ کو بھی واگزار کرالیا تو مصریوں کی مسرت دوبالا ہوگئی۔

مصطفیٰ کمال نے خلیفہ وحید الدین کو معزول کر دیا اور اس کی جگہ عبد المجید خاں کو خلافت کی مسند پر بٹھا دیا۔ مصریوں نے اس اقدام کی بھی تحسین کی۔ مگر جب مصطفیٰ کمال نے دین اور ریاست کی علیحدگی کا اعلان کیا اور عبد المجید خاں کو سیاسی اختیارات سے محروم کر کے صرف برائے نام خلیفہ رہنے دیا تو یہ اقدامات گو بڑے خوفناک تھے مگر مصری دانشوروں کا ایک گروہ ان اقدامات کو بھی خیر پر محمول کرتا تھا۔ اور دو سال تک مسلسل مصر میں یہ بحث چلتی رہی کہ مصطفیٰ کمال کا یہ اقدام صحیح تھا یا غلط۔ محمد شاکر جیسے عالم دین بھی "بہادران انقرہ" کی تعریف میں رطب اللسان تھے۔ مگر یکایک مصریوں نے یہ سنا کہ نام نہاد خلافت بھی ترکوں نے ختم کر دی ہے تو ان پر غم و اندوہ کے بادل ٹوٹ پڑے۔ شوقی کے اس قصیدے نے لوگوں کو خون کے آنسو رلا دیا جس میں اُس نے کہا تھا:

عادت اغانی العرس رجع نواح

ونعیت بین معالم الافراح

(شادی کے نغمے نوحہ گروں کے نوحوں میں بدل گئے، اور اے خلافت خوشی کی مجلسوں کے اندر تیری مرثیہ خوانی ہونے لگی)۔

خلافت کے نئے دعوے دار

تنسیخ خلافت کے چار روز بعد علمائے ازہر کی طرف سے ایک بیان صادر ہوا جس میں مصطفیٰ کمال کے اس فیصلے کو ناجائز قرار دیا گیا، اور اسلامی خلافت کی بحالی کے لیے فوری طور پر ایک اسلامی کانفرنس کے انعقاد کی ضرورت بیان کی گئی۔ اس اعلان کے ساتھ ہی مختلف حلقے امیدوار خلافت بن کر تگ و دو میں مشغول ہو گئے۔ افغانستان کا حکمران امان اللہ خاں بھی خلیفۃ المسلمین بننا چاہتا تھا۔ شریف حسین بن علی نے تو فلسطین اور شرق اردن کے لوگوں سے خلافت کی بیعت بھی لے لی۔ خود مصر کا بادشاہ فواد بھی امیدواروں میں پیش پیش تھا۔ انگریز بھی یہ کوشش کر رہے تھے کہ خلافت کا وجود اب دوبارہ کسی بھی شکل میں بحال

نہ ہو۔ معزول خلیفہ وحید الدین جو مالٹا میں جلاوطنی کے ایام گزار رہا تھا اُس نے بھی امیدوار کی حیثیت سے ایک بیان جاری کر دیا کہ " وہ آستانہ سے فرار ہو کر نہیں نکلا تھا بلکہ اس کے کمالی گروہ کی اسلام دشمنی کی وجہ سے ہجرت کی تھی تاکہ وہ کسی محفوظ مقام میں بیٹھ کر اسلام کا دفاع کرے، اور کمالی گروہ کے بُرے ارادوں کا پردہ چاک کرے "۔

الغرض ایک طرف اسلامی کانفرنس کے انعقاد کی تحریک زور پکڑ رہی تھی اور دوسری طرف امیدواران خلافت اپنی کوششوں کو تیز تر کر رہے تھے۔ بہرحال " اسلامی کانفرنس " کے نام سے ایک کمیٹی تشکیل کر دی گئی۔ اور " اسلامی کانفرنس " کے نام سے ایک مجلّہ بھی جاری ہو گیا۔ جس کے پہلے ہی شمارے میں سیّد رشید رضا کا ایک مضمون شائع ہوا۔ اس مضمون میں انھوں نے واضح کیا کہ " یہ پہلی اسلامی کانفرنس ہے جس میں تمام ملکوں کے علماء شریک ہو رہے ہیں، اس کا مقصد اسلامی حکومت کی بنیادوں کی تدوین ہے جن سے اسلامی شریعت کی برتری واضح ہو جائے، اور ایسے تعلیمی قواعد وضع کیے جائیں جو دینی رہنمائی اور دنیاوی مصالح دونوں کو پورا کرتے ہوں۔ نیز اس کانفرنس میں مسلمانوں کا ایک خلیفہ اور امام بھی چُنا جائے گا "۔[1]

اسلامی کانفرنس کمیٹی کی شاخیں اطرافِ مصر میں قائم ہو گئیں۔ اور مسلمانوں کے اندر امیدوں کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ یہ کانفرنس کئی مرتبہ ملتوی ہوئی کیونکہ اس کانفرنس کی ناکامی کے متعدد اسباب فراہم ہو چکے تھے۔ اس کی ناکامی کا سب سے بڑا سبب جو بظاہر سامنے آیا وہ یہ تھا کہ سعد زغلول جو ان دنوں مصر کا وزیر اعظم تھا اور مصری عوام کے اندر اس کا بڑا اثر و نفوذ تھا وہ خود نظریاتی طور پر اسلامی اتحاد کا مخالف تھا اور مصری عوام کو بآسانی قصر شاہی کے خلاف اُبھار سکتا تھا۔ مصری عوام کے اندر بھی یہ افواہ پھیل گئی کہ شاہ فوأد کی خلافت کے لیے انگریز بھی کوشاں ہیں۔ چنانچہ سب سے پہلے ازہر کی طرف سے شاہ فواد کی مخالفت کا آغاز ہوا۔

---

[1] المنار ۲۵ ج ۷، ص ۵۲۵، ۵۳۴۔

اور علماء اور اربابِ فکر دو حصّوں میں بٹ گئے۔ ایک حصہ سرکاری علماء کی نمائندگی کر رہا تھا اور شیخ الازہر ان کا زعیم تھا۔ اور اس کا رجحان شاہ فوأد کی طرف تھا۔ دوسرا حصّہ جسے شیخ محمد ماضی ابوالعزائم کی قیادت حاصل تھی، شاہ فواد کی امیدواری کا مخالف تھا، اور اس کی رائے یہ تھی کہ مصر خلافت کی سرزمین نہیں بن سکتا۔ خلافت کے لیے جو کانفرنس بھی منعقد کی جائے وہ مکّہ میں ہو (جو اس وقت سلطان ابن سعود کے تابع ہو چکا تھا) یا کسی اور آزاد ملک میں۔

التواء و تعویق کے کئی مرحلے گزارنے کے بعد یہ کانفرنس ۱۳ مئی ۱۹۲۶ء کو منعقد ہوئی۔ اس میں کل ۳۴ مندوبین شریک ہوئے اور معاملہ گفت و شنید سے آگے نہ بڑھا، اور آخر کار اس بے جان قرار داد پر اس کانفرنس کا اختتام ہوا کہ "خلافت کانفرنس کی مجلس انتظامی کا مرکز مصر میں رہے گا۔ یہ کانفرنس دوسرے اسلامی ممالک میں اپنی شاخیں قائم کرے گی اور حسبِ ضرورت کانفرنسیں منعقد ہوتی رہیں گی" ———— یہ تھا اس ساری تگ و دو کا افسوسناک انجام جو تنسیخ خلافت کے بعد تجدید خلافت کے سلسلے میں انجام دی گئی۔ مصری عوام کے لیے خلافت کانفرنس کی ناکامی بھی اُسی طرح کا ایک المیہ بن کر نازل ہوئی، جس طرح خود تنسیخ خلافت ایک حادثہ جانکاہ تھی۔

اعداء دین کی مسرّت

تنسیخ خلافت اور کانفرنس کی ناکامی سے مصر کا مغرب پرست، الحاد پسند اور اباحیّت کا حامی عنصر پھولا نہ سماتا تھا۔ اور ان دونوں واقعات کے نتیجے میں نہ صرف مصری مسلمان فکری انتشار اور سیاسی ابتری کا شکار ہو گیا بلکہ اخلاقی بے راہ روی اور دین سے بیزاری کی خوفناک تحریک برپا ہو گئی۔ اس دور میں مسلمانوں کے نظریۂ خلافت و سیاست پر چار معرکہ خیز کتابیں ظہور میں آئیں۔ جنہوں نے برسوں تک قوم کو نظریاتی بحثوں میں مشغول رکھا۔ ان میں سے دو کتابیں اسلام کے نظریۂ خلافت کی صحت مندانہ تصویر پیش کر رہی تھیں، اور دو اس کے برعکس تھیں۔ جن دو کتابوں نے مسئلۂ خلافت کو صحیح بنیادوں پر پیش کیا۔ ان میں سے ایک سید رشید رضا

مرحوم کی کتاب " الخلافۃ أوالامامۃ العظمی "ہے۔ (خلافت یاامامت کبریٰ) اور دوسری کتاب ترکی کے سابق شیخ الاسلام مصطفےٰ صبری کی تالیف: " النکیرعلی منکری النعمۃ من الدین والخلافۃ والأمۃ "۔ (دین، خلافت اور امت کے منکروں کی سرکوبی) ان دونوں کتابوں میں نہایت علمی اور تحقیقی انداز میں شریعت اسلامی کے فضائل ومحاسن اور اسلامی خلافت کی شرائط اور بنیادیں بیان کیں۔ مصطفےٰ صبری نے وضاحت کے ساتھ مصطفےٰ کمال کے نظریات کا تجزیہ کیا اور یہ ثابت کیا کہ یہود اور انگریزوں کے ساتھ مل کر اس نے اسلامی خلافت کی قباچاک کی ہے۔ ان دونوں کتابوں کے مقابلے میں جو دو کتابیں شریکِ معرکہ ہوئیں ان میں سے ایک الخلافۃ وسلطنۃ الأمۃ (خلافت اور اقتدار امت)۔ یہ کتاب سیّد رضا مرحوم کی مذکورہ بالا کتاب کے بعد شائع ہوئی۔ اصل میں یہ کتاب ترکی زبان میں تھی جسے عربی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ کتاب کا مصنّف کوئی گمنام شخص ہے جسے عبدالغنی سنّی بیگ بتایا گیا ہے۔ اس کتاب کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ ترکوں کی ایک کمیٹی نے اسے کمالیوں کے اشارہ سے مدوّن کیا تھا، اور ترکی حکومت نے اپنے مصارف پر اسے شائع کروایا تھا۔ اس کتاب میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ فقہی طور پر یہ ثابت کیا جائے کہ خلافت ایک سیاسی جھگڑا تھا، اس کا دین سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ خوارج اور شیعہ نے مبالغہ آمیز بحثوں کے ذریعہ اسے دین کا ایک مسئلہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ اس نوعیت کی دوسری کتاب علی عبدالرزاق کی " الاسلام واُصول الحکم "ہے۔ یہ کتاب مذکورہ بالا کتابوں کے آخر میں منصۂ ظہور پر آئی اور اس نے مصر کے علمی وفکری حلقوں کے اندر سب سے زیادہ اثر ڈالا۔ مصنّف نے کتاب میں مستشرقین کا اسلوب اختیار کیا، اور تاریخی یا فقہی حوالے کتاب وسنّت سے لینے کے بجائے زیادہ تر مستشرقین کی کتابوں سے لیے۔ اور لاگ لپیٹ رکھے بغیر اُس نے اسلام اور اسلامی تاریخ پر حملے کیے۔ اور مسلمانوں کے جذبات کو جگہ جگہ چیلنج کیا[۲] ______ (حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کتاب کے پہلے باب میں نظریۂ خلافت کی بنیاد منہدم کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے

کہ کتاب وسنّت میں ایسی کوئی دلیل موجود نہیں ہے جس سے یہ ماخوذ ہو کہ مسلمانوں کو خلافت قائم کرنی چاہیے۔ جن فقہاء نے خلافت کو قرآن وحدیث سے ثابت کیا ہے انھوں نے سب کچھ من گھڑت بیان کیا ہے۔ دوسرے باب میں اسلام کے تصورِ حکمرانی کی بنیاد پاش پاش کی گئی ہے۔ اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف فریضۂ رسالت سرانجام دیا ہے، بادشاہت یا حکومت نہیں کی ہے۔ تیسرے باب میں اس نے اسلام کے تمام قوانین خواہ وہ فوجداری ہوں یا دیوانی یا حرب، انکار کیا ہے، اور یہ بتایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی شخص جانشین نہیں ہوسکتا۔ خلفائے راشدین کی قیادت " لادینی قیادت" تھی (نعوذباللہ)۔ الغرض اس کتاب نے اسلام کی نہ صرف تاریخ مسخ کرکے پیش کیا، بلکہ اسلام کے مکمل تصورِ حیات کے پرخچے اڑانے کی کوشش کی، اور مسلمانوں کے ملّی وجود کی نفی کردی۔ ان پراگندہ خیالوں نے مسلمانوں کو ہر طرح سے مضمحل کردیا اور نوجوان نسل کو دین سے برگشتہ کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ملک کے اندر الحاد وا باحیت کی تند وتیز رو برپا ہوگئی۔

لہ (بقیہ صرگذشتہ) علی عبدالرزاق اس خاندان سے تعلق رکھتا تھا جس کے اکثر وبیشتر لوگ مصر کی دستور پارٹی کے ارکان تھے۔ اور اس پارٹی نے شاہی قصر کی حامی پارٹی حزب الاتحاد کے ساتھ مل کر حکومت بنا رکھی تھی۔ خود علی عبدالرزاق ازہر کا فارغ التحصیل تھا۔ لیکن اس کی یہ کتاب آجانے کے بعد علمائے ازہر کی سپریم کونسل نے اس کا محاکمہ کیا اور اسے علمائے ازہر کی فہرست سے خارج کردیا گیا اور اس کے نتیجے میں اسے قضائے شرعی کے منصب سے بھی معزول ہونا پڑا۔ مصر کا وزیر قانون ان دنوں عبدالعزیز فہمی تھا، جس کا تعلق دستور پارٹی سے تھا۔ اس نے سپریم کونسل کے فیصلے کو نافذ کرنے سے انکار کردیا۔ اس پر شاہ فواد نے اسے معزول کردیا۔ اس کے عزل پر احتجاج کے طور پر دستور پارٹی کے تمام وزراء نے استعفی دے دیئے۔ اور یوں یہ کتاب صرف فکری طور پر مصر کے اندر ہلچل پیدا کرنے کا موجب نہ ہوئی بلکہ اس نے سیاسی جنگ بھی چھیڑ دی۔

ترکی کے ملحدین تو لادینیت کو قانون اور طاقت کے زور سے مسلمانوں پر ٹھونس رہے تھے۔ مگر مصر کے اندر اس کا ردِ عمل لادینیت کو برضا ورغبت اختیار کرنے کی شکل میں ہوا۔ کمالیوں نے "سفید بھیڑیے" کو اپنا شعار بنایا تو مصریوں نے ابوالہول کو اپنا شعار بنالیا اور کرنسی اور ڈاک کے ٹکٹوں پر اس کی تصویر چھاپی۔ ترکوں کی پیروی میں مصر کے اندر بھی شرعی عدالتوں کے خاتمے اور بے پردگی اور اختلاط کے فروغ کی دعوت اُٹھ کھڑی ہوئی۔ بلکہ عربی حروف کو لاطینی حروف میں تبدیل کرنے اور فصیح زبان کے بجائے عامی زبان کو رائج کرنے کی تحریکوں نے سر اُٹھالیا۔

عرب قومیّت کا نعرہ

ادھر عرب قومیّت نے پھر سر اُٹھایا۔ جنگ عظیم سے پہلے جب "اتحاد اسلامی" کی تحریک برپا تھی تو عرب قومیّت کے نعرے کی مقبولیّت کم تھی۔ مگر اب تسبیح خلافت دانہ دانہ ہوجانے کے بعد عرب قومیّت ہی ذریعہ اتحاد بن کر سامنے آئی اور پہلے کی نسبت اُسے زیادہ بہتر فضا مل گئی۔ کچھ لوگ "عرب قومیّت" کو وحدت و یگانگت کے احیاء کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے، اور وہ اسے اسلام کی دعوتِ وحدت سے کوئی الگ نظریہ نہ تصوّر کرتے تھے۔ مگر لبنانی عیسائیوں کے گروہ نے اسے ایک فلسفے کی حیثیت سے پیش کیا۔ مصر کا تجدّد پسند اور مغرب پرست گروہ بھی ان کا ہمنوا ہوگیا۔ آگے چل کر عرب قومیّت نے کئی ضمنی قومیتوں کو جنم دے دیا۔ اشوری قومیت، بابلی قومیت، کلدانی قومیت، حبشی قومیت اور فرعونی قومیت۔ یہ آخر الذکر قومیت مصر کی سرزمین سے تعلق رکھتی تھی۔

۱۹۱۹ء میں سعد زغلول کی قیادت میں استعمار اور استبداد کے خلاف بغاوت کے شعلے بھڑک اٹھے۔ اس بغاوت میں مصریوں پر استعماری فوج اور قصر دونوں نے مل جل کر جو ستم ڈھائے ان کی وجہ سے مصری قوم کے اندر فکری و ذہنی اختلاف کے باوجود اتحاد اُبھر آیا اور وہ تمام طبقے جو کل تک باہم دست و گریبان تھے۔ وہ سب شیر و شکر ہوگئے۔ ازہری علماء

اور حزب الامّۃ کے ملحدین دونوں ایک پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر استبداد کے خلاف سینہ سپر ہوئے۔ مگر یہ اتحاد ایک عارضی شے تھی۔ شرپسند عناصر نے اس اتحاد کو "مصری قومیت" کو چمکانے کا ایک اچھا ذریعہ سمجھ لیا اور "مصری قومیت" کے قلابے فرعونی تہذیب سے استوار کر دیئے۔ چنانچہ ایک طرف مصری قوم ناکام بغاوت کے زخم چاٹ رہی تھی اور دوسری طرف فرعونی تہذیب کا نعرہ معصومیّت کے ساتھ اپنا راستہ ہموار کر رہا تھا۔ یہودیوں، عیسائیوں اور استعماری ایجنٹوں نے درپردہ اسے خوب ہوا دی، اور پھر بڑے بڑے سیاستداں بھی اس قومیت کے علمبردار ہو گئے۔ یہ سب کچھ مصری اتحاد کے نام پر ہونے لگا۔ مصر کے نامور مصنّف محمد حسین لکھتے ہیں :

"مصر میں فرعونیت کی سخت لہر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ جو قریب قریب تمام فکری و ثقافتی پہلوؤں پر چھا گئی۔ ادب و فن کو فرعونی بنیادوں پر استوار کرنے کی دعوت دی جانے لگی۔ جریدہ " السیاسۃ الاسبوعیۃ" اس نئے رجحان کا قائد تھا۔ اس نے فرعونیت کے داعیوں کے لیے اپنا دامن وا کر دیا۔ اس کا کوئی شمارہ ایسا نہ ہوتا تھا جس میں فراعنہ کی تہذیب و ثقافت اور شان و شوکت کے گیت نہ گائے جاتے۔ اس کے ایڈیٹر نے ایک مرتبہ لکھا : " یہ ایک عمیق حقیقت ہے کہ ہمارے اور ہمارے اجداد فراعنہ کے مابین تعلقات آج تک قائم ہیں"۔

مزید لکھتے ہیں :-

" دعوت فرعونیت پہلے نقاب پہن کر سامنے آتی تھی۔ مگر اب اُس نے کھلم کھلا سر اٹھا لیا۔ فرعونیت کے داعیوں کے لیے یہ سنہری موقع تھا۔ وہ لوگوں کے فکر و نظر پر فرعونیت کی چھاپ لگانے کے لیے سرگرم کار ہو گئے۔ اخبارات کے قارئین اور محفلوں کے سامعین کے سامنے فرعونیت کے سوا کوئی اور تصویر نہ آتی۔ ابوالہول کا سر (فرعونیت کے شعار کی حیثیت سے) ڈاک کے ٹکٹوں اور کرنسی کے

نوٹوں پر چھاپا گیا۔ یونیورسٹی کے ہر کالج نے اپنے لیے دورِ فراعنہ کے مختلف بتوں میں سے کسی نہ کسی بُت کو اپنا شعار قرار دے لیا۔ سعد زغلول کی لاش کو اس کی موت کے تین سال بعد ایک نئی قبر میں منتقل کیا گیا جو فرعونی طرز پر بنائی گئی تھی۔ اکثر سرکاری عمارات میں بھی فرعونی طرزِ تعمیر اختیار کیا گیا۔ سرکاری اسٹیشنری پر فرعونی شعار چھپاں تھا۔ جب عدلی یکن ۱۹۲۱ء میں انگریزوں سے بات چیت کا سلسلہ منقطع کر کے یورپ سے واپس قاہرہ آیا تو حافظ ابراہیم جیسے نامور شاعر نے اس کی شان میں جو نظم پیش کی اس کے تمام اشعار فرعونیت کی محبت اور فرعونیت پر فخر و اعتزاز سے لبریز تھے"۔[1]

قدیم و جدید کی جنگ

جنگ عظیم اوّل کے بعد جو فکری طوفان اُٹھ کر آئے ان میں سے چند ایک کی تفصیل ہم پچھلے صفحات میں قلم بند کر آئے ہیں۔ لیکن یہ بحث اس وقت تک نامکمل رہے گی جب تک ایک اور نظریاتی تحریک کے خدوخال نہ بیان کریں جسے اس زمانے میں "قدیم و جدید کی کش مکش" کا عنوان دیا گیا تھا۔ یہ تحریک درحقیقت اباحیت اور اخلاقی انارکی کی علمبردار تھی۔ اور معاشرتی روایات کے تار و پود بکھیر کر ایک بے لگام اور بے غیرت قوم جنم دینا اس کا مطمحِ نظر تھا۔ لیکن اصل مقصد کو مستور رکھنے کے لیے اسے " قدیم و جدید کی کش مکش" کا عنوان دیا گیا اور " دعوت آوارگی" کی اصطلاح اختیار کرنے کے بجائے اسے "تاریخ کا تقاضا" کہہ کر فکر و فلسفہ کے غلاف میں پیش کیا گیا۔ قدیم و جدید کی بحث یوں تو پرانی تھی لیکن پہلی جنگ عظیم کے بعد یہ اس قدر شدت اختیار کر گئی کہ صحافت سے لے کر عوامی مجالس تک اس کی لپیٹ میں آگئیں۔ قدیم سے مراد ہر وہ چیز تھی جس کا تعلق مسلمانوں کے

---

[1] الاتجاهات الوطنية ج۲ ص ۱۴۶، ۱۴۷۔

دینی، فکری اور تہذیبی ورثہ سے تھا، اور جدید سے مراد ہر وہ نئی چیز تھی جو یورپ سے منتقل ہو کر مصر میں مختلف ذرائع سے پہنچ رہی تھی۔ درحقیقت یہ جنگ محمد علی پاشا کے عہد سے شروع ہو چکی تھی۔ مصر کے روایاتی اور مقیّد ماحول سے نکل کر جو تعلیمی مشن یورپ جا رہے تھے یا یورپ کی طرف سے جو ماہرین مصر پہنچ رہے تھے وہ اس معرکہ آرائی کی تخم ریزی کر رہے تھے۔ اسماعیل پاشا کے زمانے میں یہ معرکہ زیادہ شدّت اختیار کر گیا۔ کیونکہ اسماعیل پاشا مصر کو یورپ کا ایک حصّہ بنانا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے یورپ کی ہر چیز کے لیے فراخ دلی کے ساتھ مصر کے دروازے کھول دیئے تھے۔ علامہ محمد عبدہٗ اور عبداللہ الندیم اپنے اپنے عہد میں اس کا مقابلہ کرتے رہے۔ مگر یہ دونوں حضرات خود یورپ سے کسی حد تک مرعوب تھے، اس لیے اسلام کی مدافعت میں بالعموم معذرت خواہانہ انداز اختیار کرتے رہے، یا قدیم و جدید کے مابین توافق پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ جنگ عظیم کے بعد قدیم و جدید کی کشمکش بحث و مناقشہ کی حدود پھلانگ کر فکری محاذ آرائی اور نظریاتی جنگ کی صورت اختیار کر گئی۔ مصری مصنّف محمد حسین کی رائے میں قدیم و جدید کی کش مکش کے شعلوں کو تیز کرنے میں مصر کے اس اخلاقی انحطاط کا بھی دخل ہے جس کا سیلاب جنگ کے دوران مصر میں اُمڈ آیا تھا۔ یہ مصنّف لکھتا ہے:

> "جنگ عظیم کے دوران مصر میں مختلف اقوام سے تعلق رکھنے والے انسانوں کا سیلاب آ گیا، جن سے مصر کی گلیاں اور کوچے اُبل پڑے۔ یہ لوگ دن ہو یا رات شراب اور جوئے کے اڈوں کی تلاش میں رہتے۔ قحبہ خانے لائسنس یافتہ ہوں یا بلا لائسنس، علانیہ ہوں یا خفیہ ان کی آماجگاہ ہوتے۔ جنگ کے پورے چار سال لوگوں نے آوارگی کے یہ مناظر دیکھے۔ اس دوران قتل و غارت اور آبروریزی کے واقعات بکثرت پیش آتے رہے۔ موقع پرست انسانوں اور کمینہ افراد نے اس صورتِ حال سے خوب فائدہ اٹھایا اور دیّوثی اور دلّالی کو خوب فروغ ملا۔ اور

لہو ولعب اور خمر و قمار کے مراکز کی کثیر تعداد وجود میں آگئی ۔"

لہو ولعب کے اڈوں نے مصری قوم کے اندر کیا تباہی مچائی، اس کی تصویر مصطفےٰ لطفی منفلوطی اپنے مضمون " المرقص " میں یوں پیش کرتا ہے :

" میں نے رقص خانوں میں دیکھا کہ درہم و دینار ساغر مے میں گھُل رہے ہیں۔ عقل سروں میں جامد ہو رہی ہے۔ جیبوں پر ڈاکہ ڈالنے کے لیے جال نصب ہیں۔ دلوں کو نخچیر کرنے کے لیے خدنگ و پیکان استوار ہیں۔ میں نے دیکھا کہ میں جسے سب انسانوں سے زیادہ زیرک سمجھتا تھا، جسے سب سے زیادہ باضمیر گردانتا تھا، جس کے سامنے میں تعظیماً جُھک جُھک جایا کرتا تھا، وہ کسی حسینہ کے دام میں گرفتار ہو چکا ہے۔ وہ اسے نگنی کا ناچ سنچاتی ہے، اسے زیر و زبر کرتی ہے، کھلونا بنا کر اس سے کھیلتی ہے، حالانکہ یہ وہی شخص ہے کہ جب وہ عوام کے سامنے ہوتا ہے تو عزت و افتخار میں قیصر روم ہوتا ہے اور تکبر و غرور میں کسریٰ فارس[1] ۔"

ان مراکز لہو ولعب اور مجالس عیش وطرب نے مصری قوم کی اخلاقی و دینی روایات اور مقدس اقدار کو بُری طرح مجروح کر دیا۔ اوباشوں کی اس قدر بن آئی کہ وہ علانیہ غیرت و حیا کے دامن تار تار کرتے۔ عوام الناس حسبِ عادت ان چیزوں کے بارے میں بے حسّی اور لااُبالی پن کا ثبوت دیتے رہے۔ اتحادی فوجوں کی خدمت کے لیے وہ ہزاروں فلاّحین جو دیہاتوں سے اُٹھ کر شہروں میں آگئے تھے۔ جنگ ختم ہو جانے کے بعد اس حال میں واپس دیہاتوں کو لوٹے کہ دیہاتی حمیت وغیرت کی متاع سے اکثر و بیشتر تہی دست ہو چکے تھے۔ وہ اپنے گھروں میں جنگ کی حیرت انگیز کہانیاں اور فوجیوں کی گوناگوں عادات و خصائل ہی لے کر نہ گئے بلکہ امراض خبیثہ اور اخلاق فاسدہ کا بہت بڑا ذخیرہ بھی ساتھ لے گئے۔

---

[1] النظرات : مقالہ : الملاعب الهزلية۔

جو شہروں میں رہ گئے وہ آوارگی اور بے راہ روی میں اس قدر غرق ہو گئے کہ ہر وہ شخص انھیں اپنا گرویدہ بنا سکتا تھا، جو ان کی گھٹیا خواہشوں کو اپیل کرتا۔ اس طرح عوام الناس کے اندر دینی غیرت اور دینی اقدار کے احترام کا جذبہ مفقود ہو گیا۔ اور چونکہ اسلامی محاذ کمزور سے کمزور تر ہو چکا تھا اس لیے اس گھٹیا فضا میں اباحیت پسندوں کو اپنے افکار و نظریات پھیلانے کا خوب موقع مل گیا۔ اور انھوں نے اسلام کی ایک ایک چیز کو "قدامت" کی فہرست میں درج کر کے اسے ختم کرنے اور یورپ سے درآمدہ "جدت" کو اختیار کرنے کی مہم چلا دی۔ خود مغربی مصنفین نے بھی اس معرکے میں خوب حصہ لیا اور مصری معاشرے کو منہدم کرنے کے لیے پورا زور لگایا۔ WHITHER ISLAM کا مطالعہ مغرب کے اس کردار کو پوری طرح بے نقاب کر دیتا ہے۔ یہ کتاب مختلف مستشرقین کے مضامین کا مجموعہ ہے، جسے R.A.R. GIBB نے مرتب کیا ہے۔

مغربیت کا سب سے بڑا علمبردار سلامہ موسیٰ تھا۔ اس نے اپنی کتاب "الیوم والغد" (امروز و فردا) میں صاف صاف لکھا کہ "ہمیں ایشیا سے قطع تعلق ختم کر کے یورپ سے وابستہ ہو جانا چاہیے۔ میرا مسلک یہی ہے۔ میں زندگی بھر خفیہ بھی اور علانیہ بھی اس کے لیے سرگرم رہوں گا۔ میں مشرق کا کافر اور مغرب کا مومن ہوں"۔ اس عقیدے کو بنیاد بنا کر یہ شخص ادب و ثقافت، معاشرت و اقتصاد اور سیاست و مذہب ہر چیز کو اسلام اور مشرقیت سے پاک کرنے کی دعوت لے کر اٹھتا ہے۔ بلکہ اسلام کا کھلم کھلا تمسخر اڑاتا ہے۔ ذیل کے پیراگراف میں اس کا انداز بیان ملاحظہ ہو:

> "ہم اپنے آپ کو مشرق و مغرب کے مابین تردد و تامل کی حالت میں پاتے ہیں۔ ہماری حکومت بے شک یورپ کے طرز پر منظم ہو چکی ہے۔ لیکن حکومت کے اندر ابھی کچھ مشرقی ڈھانچے باقی ہیں جو ملک کی ترقی میں حائل ہو رہے ہیں۔ مثلاً وزارت اوقاف اور شرعی عدالتیں۔ ہمارے پاس ایسی

یونیورسٹی بھی ہے جو ہمارے اندر متمدّن دنیا کی ثقافت کو فروغ دے رہی ہے
مگر اس کے دوش بدوش ازہر یونیورسٹی دورِ تاریک کی ثقافت پھیلا رہی ہے۔
ہمارے اندر مسٹروں کی کھیپ تیار ہو چکی ہے جو پوری طرح مغربیت کو اپنا چکے ہیں۔
لیکن ساتھ ہی ملّاؤں کا ایک ٹولہ بھی ابھی دکھائی دیتا ہے جو جبّے اور عمامے کو
چمٹا ہوا ہے۔ اور سڑکوں پر وضو کرنے سے باز نہیں آتا۔ اور جو ابھی تک قبطیوں
اور یہودیوں کو "کفّار" کہتا ہے۔ جس طرح ۱۳سو سال قبل عمر بن خطاب (رضی اللہ عنہ)
نے انھیں یہ لقب دیا تھا۔"

سلامہ موسیٰ اسلام اور اسلامی اقدار اور اسلامی تاریخ پر پوری ڈھٹائی سے حملے کرتا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۲۷ء میں منظرِ عام پر آتی ہے اور برسوں تک نوجوان نسل کے ذہن و فکر کو اباحیت کے زہر سے مسموم کرتی رہتی ہے۔ اس کتاب کے اثرات ابھی ذہنوں سے محو نہیں ہو پاتے کہ ایک اور کتاب ایک نئی تحریک کی شکل میں ظہور پذیر ہو جاتی ہے۔ یہ طٰہٰ حسین کی تالیف مستقبل الثقافۃ فی مصر (مصر کا تعلیمی مستقبل) تھی۔ یہ کتاب ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی۔ یعنی اس معاہدے کے دو سال بعد جو مصر اور برطانیہ کے مابین ۱۹۳۶ء میں طے ہوا تھا۔ اس کتاب میں طٰہٰ حسین نے وہ تعلیمی نقشہ پیش کیا ہے جس پر آئندہ مصر کو گامزن ہونا چاہیے۔ یہ کتاب سلامہ موسیٰ کی کتاب الیوم والغد سے زیادہ خطرناک تھی۔ کیونکہ سلامہ موسیٰ محض ایک قلم کش تھا۔ مگر طٰہٰ حسین مختلف اہم مناصب پر بھی فائز تھا۔ اور ان مناصب کی بدولت وہ اپنی تعلیمی اسکیم کو نافذ کرنے کی قدرت رکھتا تھا۔ وہ قاہرہ کے آرٹس کالج میں پرنسپل رہا۔ وزارت تعلیم کا ڈائرکٹر جنرل بنا، وزارت تعلیم کا فنّی مشیر رہا، اسکندریہ یونیورسٹی کا چانسلر رہا، اور آخر کار وزارت تعلیم کا قلمدان بھی اس کے ہاتھ میں آگیا۔ اس کے شاگردوں اور عقیدت مندوں کی کثیر تعداد تھی جو اس کے افکار سے متاثر ہوتے تھے۔ اپنی کتاب میں طٰہٰ حسین نے تین بنیادی باتوں پر زور دیا ہے:

۱۔ مصر کو مغربی تہذیب کی طرف لے جایا جائے۔ اور اسلام اور قدیم ورثے سے اس کا تعلق کاٹ دیا جائے۔

۲۔ وطنیت کو فروغ دیا جائے۔ اور ملک میں ایسا نظامِ حکومت قائم کیا جائے جس میں مذہب کا کوئی دخل نہ ہو۔

۳۔ عربی زبان کو تغیراتِ زمانہ کے تابع کر دیا جائے اور اُسے ایسے راستے پر ڈال دیا جائے کہ وہ فصیح عربی ختم ہو جائے جس میں قرآن کریم نازل ہوا ہے۔ عربی زبان محض سریانی، قبطی، لاطینی اور یونانی زبانوں کی طرح ایک دیومالائی زبان بن کر رہ جائے۔

طٰہٰ حسین کی ایک اور کتاب " فی الشعر الجاہلی " نے بھی اس باب میں اباحیت پسندوں کو بڑی مدد پہنچائی۔ اس کتاب میں بھی مؤلف نے شعر و ادب کے ان پیمانوں کو جو آج تک مروّج چلے آ رہے تھے رد کر دیا۔ اور اس کی آڑ میں قرآن و حدیث پر لوگوں کے اعتماد کو متزلزل کرنے کی کوشش کی۔ مصطفٰے صادق الرافعی مرحوم نے اس معرکے میں قابل قدر کارنامے سرانجام دیئے ہیں۔ اس کی کتاب " المعرکۃ بین القدیم والجدید " ـــــــ اور " تحت رایۃ القرآن " میں طٰہٰ حسین جیسے لوگوں کا دندان شکن جواب ہے۔

یہ تحریک جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا ہے بے حیائی کو فروغ دینے کے لیے برپا ہوئی۔ اور اس نے جو مختلف محاذ کھول رکھے تھے وہ چار تھے۔ عورت، لباس، تعلیم اور ادب و زبان۔ ان میں سے ہر ہر محاذ پر اس نے دل کھول کر الحاد و اباحیت اور آزادی و آوارگی کا پرچار کیا۔ عورت کے میدان میں اسے غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔ عورت کی آزادی کا دروازہ تو قاسم امین کھول گیا تھا۔ مگر اب یہ آزادی لباس کے معاملے میں بے حجابی نہیں عریانی تک پہنچ گئی تھی۔ اور عورت نے نہ صرف اپنا چہرہ اور ہاتھ ننگے کیے بلکہ آہستہ آہستہ اس نے ساق و سینہ بھی عریاں کر دیئے۔ اور ایسا تنگ لباس اپنے لیے اختیار کر لیا کہ اس پر عریانی بھی شرما جائے۔ سیاسی میدان میں بھی عورت نے قدم رکھ دیا۔ اور اس

کی قیادت تین نامور خواتین کے ہاتھ میں آگئی۔ ایک سعد زغلول پاشا کی بیوی صفیہ زغلول۔ یہ خاتون مصطفیٰ فہمی پاشا کی لڑکی تھی، جو انگریزوں کے بہترین دوست شمار ہوتے تھے اور انگریزوں کے دور میں کئی مرتبہ وزارت عظمیٰ کے عہدے پر متمکن ہوئے۔ دوسری خاتون ہدیٰ شعراوی تھی۔ یہ علی شعراوی پاشا کی بیوی اور سلطان پاشا کی صاحبزادی تھی۔ سلطان پاشا مصر کے ان نمایاں فوجی افسروں میں سے تھا جنہوں نے انگریزوں سے بھرپور تعاون کیا اور بوقت ضرورت مصریوں کی تحریک آزادی کو کچلا۔ ہدیٰ شعراوی خاص طور پر اس میدان کی شہسوار تھی۔ اُس نے آزادی نسواں کے نام سے ایک تنظیم قائم کی، اور پھر اجتماعات اور اخبارات کے ذریعہ سے عورتوں کے اندر آزادی اور بے باکی کا صور پھونکا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اُس نے عورت کو اس قدر بے گانۂ غیرت کر دیا کہ اس پر مصر کا باضمیر انسان چلّا اٹھا۔

ہم نے مصر کا وہ دورِ تاریخ تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے جس میں حسن البنّا رحمۃ اللہ پیدا ہوئے اور پروان چڑھے اور تعلیم پائی اور آخر کار وہ عظیم الشان تحریک برپا کی جسے الاخوان المسلمون کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ حسن البنّا کی شخصیت اور ان کی خدمات کا صحیح اندازہ لگانے کے لیے اس دور کی فکری و ذہنی کیفیت، سیاسی حالت اور اخلاقی و ادبی زندگی کا مطالعہ ضروری تھا۔ یہ مطالعہ ہم گذشتہ صفحات میں شرح و بسط کے ساتھ کر چکے ہیں۔

امام حسن البنّا کے خاندانی حالات

حسن البنّا کے دادا شیخ عبدالرحمٰن البنّا مصر کے ایک دور افتادہ گاؤں شمشیرہ کی معزز شخصیت سمجھے جاتے تھے۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ ایک کا نام احمد تھا اور دوسرے کا محمد۔ احمد ازہر کی تعلیم کی طرف متوجہ ہوگیا، اور محمد اپنی بستی میں کاشت کاری میں باپ کا

ہاتھ بٹانے لگا۔ والد کے انتقال کے بعد دونوں بھائیوں کے اندر وراثت کی تقسیم پر اختلاف برپا ہوگیا۔ محمد یہ چاہتا تھا کہ والد کی اکثر وبیشتر زمین اس کی ملکیت میں ہو کیونکہ زمین کی دیکھ بھال کے لیے اُس نے غیر معمولی خدمات سرانجام دی ہیں۔ قریب تھا کہ یہ اختلاف جھگڑے کی صورت اختیار کرلیتا۔ مگر احمد نے اسے فوراً ختم کردیا۔ اس نے ساری زمین اپنے بھائی کے لیے چھوڑ دی اور خود اپنی بستی سے ہجرت کرکے محمودیہ میں آکر بس گیا۔

احمد بن عبدالرحمٰن البنا ـــــــــ حسن البنّا شہید کے والد ـــــــــ نے محمودیہ میں اقامت پذیر ہونے کے بعد گھڑی سازی کا کام شروع کردیا۔ وہ ازہر کے تعلیم یافتہ تھے۔ دن کا ایک حصّہ روزی کمانے کے لیے گھڑی سازی میں صرف کرتے اور بقیہ اوقات فقہ وحدیث کے مطالعے اور قرآن کی تدریس میں صرف کرتے۔ ان کی اپنی ذاتی لائبریری تھی۔ جس میں مختلف اسلامی علوم وفنون پر مشتمل کتابوں کا قیمتی ذخیرہ موجود تھا۔ جب اہلِ قریہ نے اپنی مسجد تعمیر کی تو انھوں نے احمد عبدالرحمٰن البنا کو سب سے پہلا جمعہ کی نماز پڑھانے کی تکلیف دی۔

موصوف کی عالمانہ تقریر اور فصیح زبان نے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ چنانچہ وہ لوگوں کی فرمائش پر مسجد کے مستقل امام اور خطیب بن گئے۔ مگر ان کی یہ خدمات کسی مادّی لالچ کی بنیاد پر نہ تھیں بلکہ محض فی سبیل اللہ تھیں۔ انھوں نے اپنی روزی کا مدار گھڑی سازی پر رکھا ہوا تھا۔ اور جیسا کہ اوپر عرض کیا جاچکا ہے وہ اپنے اوقات کا ایک حصّہ فقہ وحدیث کے مطالعہ میں گزارتے۔ اس مطالعہ کے نتیجے میں انھوں نے حدیث پر متعدد کتابیں مدوّن کی ہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ کی مسند کو انھوں نے فقہی ابواب کے تحت مرتّب کیا۔ اور اس کا نام " الفتح الرّبانی فی ترتیب مسند الامام احمد بن الشیبانی " رکھا۔ پھر اس کی نہایت جامع شرح تحریر کی، جس میں احادیث کی تخریج کی۔ رجال وسند پر کلام کیا۔ مشکل مقامات کو حل کیا، اور احادیث کے اندر پنہاں علم وحکمت کے گوشے واکیے، ان کی

شرح کا نام " بلوغ الامانی من اسرار الفتح الربانی " ہے۔ ابوداؤد الطیالسی کی مسند کو "منحۃ المعبود" کے نام سے نئی تبویب اور تشریح سے مزیّن کیا۔ امام شافعی کی مسند اور سنن کو بھی مرتب کیا اور اس پر گراں قدر حواشی لکھے۔ ان کا یہ مجموعہ " بدائع المنن فی جمع وترتیب مسند الشافعی والسنن " کے نام سے چھپا ہے۔ اسی طرح موصوف نے مسانید ائمہ اربعہ کا ایک حصّہ بھی مرتّب کیا۔ ان کے اس تحقیقی کام کو دیکھ کر انسان بے اختیار یہ پکار اٹھتا ہے کہ احمد عبدالرحمٰن البنّا کی تنہا ذات نے وہ کام سرانجام دیا ہے جسے ایک اکیڈمی ہی سرانجام دے سکتی تھی۔

شیخ احمد عبدالرحمان کی علم دوستی، اخلاص اور درویشی کا یہ ثمرہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں جو رفیقۂ حیات دی وہ بھی تقویٰ اور نیکوکاری کا ایک مجسّم پیکر تھی۔ یہ خاتون ابوقورہ نامی خاندان کی چشم وچراغ تھی۔ اس خاتون سے احمد عبدالرحمٰن البنّا کی سات اولادیں ہوئیں۔ پانچ لڑکے اور دو لڑکیاں۔ ان کے نام عمر کی ترتیب کے لحاظ سے یہ ہیں:
حسن البنّا، عبدالرحمٰن، فاطمہ، محمّد، عبدالباسط، جمال اور فوزیہ۔ شیخ احمد نے دوسری شادی بھی کی۔ دوسری بیوی سے صرف ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام فریدہ تھا۔

حسن البنّا کی پیدائش، تربیت اور تعلیم

حسن البنّا شہید اپنے باپ کے سب سے بڑے لڑکے تھے۔ محمودیہ میں اکتوبر ۱۹۰۶ء کو ان کی پیدائش ہوئی۔ یہ سنّتِ الٰہی کا ایک حیرت انگیز کرشمہ ہے کہ بیسویں صدی کے عشرۂ اول میں مصر کے جانفروش اور محبوب رہنما مصطفیٰ کامل (وفات ۱۹۰۸ء) دنیا سے رخصت ہو رہے تھے اور قدرت اس خلاء کو حسن البنّا کے ذریعہ بطریقِ احسن پُر کرنے کا انتظام فرما رہی تھی۔ محمودیہ کا ماحول خالصتہً دیہاتی تھا۔ یہ فلّاحین کی بستی تھی۔ اور ان سب روایات کی حامل تھی جو بالعموم دیہاتی زندگی کا خاصہ ہوتی ہیں۔ حسن البنّا کا گھرانہ اس دیہاتی بود وباش کے اندر علم وفضل اور اعلیٰ اسلامی ماحول سے آراستہ تھا۔ حسن البنّا کی ابتدائی تعلیم میں ان کے والد کا بہت بڑا حصّہ ہے۔ والد نے بچپن میں انھیں قرآن

حفظ کرا دیا۔ اور ان کی توجہ دینی علوم کی طرف مبذول کر دی۔ گھریلو تعلیم و تربیت کے ساتھ ہی محمودیہ کی ایک ابتدائی درس گاہ 'مدرستہ الرشاد الدینیہ'، میں داخل ہو گئے۔ اس درس گاہ سے بھی انھوں نے اپنے استاذ محمد زہران رحمۃ اللہ علیہ سے اخلاقی تربیت کا بہرۂ وافر حاصل کر لیا۔ اور جب مدرستہ الرشاد الدینیہ کے انتظام میں تبدیلی ہو گئی اور اس کے بانی شیخ محمد زہران اسے ترک کر کے دوسرے کاموں میں مشغول ہو گئے، تو حسن البنّا شہید مدرسۂ اعدادیہ میں منتقل ہو گئے۔ یہ مدرسہ تعلیمی معیار کے لحاظ سے پرائمری اسکول سے فائق تر تھا۔ ۱۹۲۰ء میں حکومت نے مدارس اعدادیہ کا نظام ختم کر دیا۔ اور ان مدارس کو وزارت تعلیم کی تحویل میں دے دیا۔ اب شہید کے سامنے دو راستے تھے۔ ایک یہ کہ اسکندریہ چلے جائیں اور وہاں کے معہد دینی (دینی درس گاہ جو جامعہ ازہر کے تابع تھی) میں داخلہ لے لیں اور ازہر کی تعلیم حاصل کر لیں اور علمائے ازہر میں شامل ہو جائیں، اور دوسرے یہ کہ دمنہور کے ٹیچرز ٹریننگ سنٹر میں داخل ہو جائیں۔ اور معلمی کی سند حاصل کر لیں۔ قدرت اُن سے جو کام لینا چاہتی تھی اس کے لیے مؤخر الذکر صورت زیادہ موزوں تھی۔ چنانچہ کافی سوچ بچار کے بعد انھوں نے دمنہور کے ٹیچرز ٹریننگ اسکول میں داخلہ لے لیا۔ اس وقت ان کی عمر ۱۴ برس تھی۔ ٹیچرز ٹریننگ اسکول میں انھوں نے سہ سالہ کورس پاس کر لیا۔ امتحان میں وہ اپنے اسکول میں اوّل اور پورے مصر میں پانچویں نمبر تھے۔ اس کے بعد انھیں ضلعی بورڈ کی طرف سے معلمی کے فرائض سونپے گئے لیکن انھوں نے تعلیم کی تکمیل کو ترجیح دی، اور قاہرہ کے دار العلوم (موجودہ قاہرہ یونیورسٹی) میں داخلہ لے لیا۔ اس وقت ان کی عمر ۱۶ برس سے متجاوز نہ تھی۔ اور اس لحاظ سے وہ دار العلوم میں داخل نہ ہو سکتے تھے۔ مگر ان کی غیر معمولی صلاحیت اور برتر قابلیت کی وجہ سے دار العلوم کے اساتذہ نے انھیں داخل کر لیا۔ اس زمانے میں دار العلوم چھوٹا ازہر کہلاتا تھا۔ اس میں جدید علوم مثلاً تربیت، علم النفس فلسفہ، سیاسیات، اجتماع اور ریاضی کے ساتھ ساتھ لسانیات پر خاص

توجہ دی جاتی تھی۔ طریقۂ تدریس بھی جدید طرز کے مطابق تھا۔

دارالعلوم میں داخلہ کے بعد حسن البنّا قاہرہ منتقل ہو گئے، اور ان کے ساتھ ان کا خاندان بھی محمودیہ کی محدود فضا سے نکل کر قاہرہ کے وسیع ماحول میں آکر آباد ہو گیا۔ جولائی ۱۹۲۷ء میں انھوں نے دارالعلوم کا ڈپلوما حاصل کر لیا۔ دارالعلوم کے امتحان میں بھی وہ اوّل آئے۔ دارالعلوم کی تعلیم کے دوران انھوں نے اپنے اوقات کو ۲ دو حصّوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ایک حصّہ وہ تعلیم و مطالعہ پر صرف کرتے اور دوسرا حصّہ دعوت و تبلیغ اور گھڑی سازی کے کام میں والدِ محترم کا ہاتھ بٹاتے۔ دارالعلوم سے فراغت کے بعد بھی وہ اس پس و پیش میں رہے کہ آیا وہ بیرونی اسکالر شپ لے کر اپنے علم میں مزید اضافہ کر لیں محکمہ تعلیم میں ملازمت کر لیں۔ اور دن کو بچّوں کو تعلیم دیں اور اسکول سے فارغ اوقات میں بچّوں کے والدین کو امورِ دین سے آگاہ کریں۔ اسی پس و پیش میں تھے کہ دارالعلوم کی طرف سے یہ اعلان کر دیا گیا کہ اس سال ملک کے اندر معلمین کی زیادہ مانگ کی وجہ سے دارالعلوم کسی طالب علم کو بیرونی اسکالر شپ نہیں دے گا۔ اس اعلان کے بعد حسن البنّا یکسو ہو گئے اور اسماعیلیہ میں مدرس لگا دیئے گئے۔ تاریخ انھیں مصر اور اہلِ مصر کی اصلاح کی مہم سونپنا چاہتی تھی۔ لہٰذا ایسے عوامل و اسباب خود بخود پیدا ہوتے گئے کہ حسن البنّا مصر ہی کے اندر ٹھیرا رہے، اور بلا تاخیر اپنی مہم کا آغاز کر دے۔ جب انھوں نے اسماعیلیہ کے مدرسہ امیریہ (گورنمنٹ اسکول) میں معلّمی کا منصب سنبھالا اس وقت ان کی عمر ۲۱ سال تھی۔ ۱۹۳۳ء تک وہ اسماعیلیہ رہے۔

معلّمی کا کام اور دعوت کی ابتداء

۱۹ ستمبر ۱۹۲۷ء کو وہ اسماعیلیہ روانہ ہوئے تھے۔ جہاں انھیں تعلیم کے میدان میں اپنی نئی ذمہ داریوں کو سنبھالنا تھا۔ اسماعیلیہ کے قیام میں وہ شروع میں تعلیم و تدریس سے فارغ اوقات میں کچھ عرصہ تک تو اسماعیلیہ کے معاشرتی حالات کا مطالعہ کرتے رہے۔

تاکہ دعوت و تبلیغ کے لیے ایسا اسلوب اور طریق کار اختیار کریں جو زیادہ نتیجہ خیز ہو۔ اور اس نئے شہر کے اندر ایک کامیاب معلم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک کامیاب داعی بھی ثابت ہوں۔ ابتدائی مطالعہ و تفکّر کے بعد انھوں نے مسجدوں کے بجائے قہوہ خانوں کے اندر اشاعت دعوت اور اصلاح فکر کا کام شروع کر دیا اور اجتماعات کے لیے تکیوں اور زاویوں کو منتخب کیا۔ اس طرح انھوں نے مختصر عرصہ کی جدوجہد کے بعد عقیدت مندوں اور صاحب حمیت لوگوں کی اتنی تعداد جمع کر لی کہ اس سے ایک باقاعدہ تنظیم کی داغ بیل ڈالی جا سکے۔ چنانچہ مارچ ۱۹۲۸ء کو حسن البنّا شہید کے گھر پر چھ نمایاں افراد جمع ہوئے اور انھوں نے باہم یہ عہد کیا کہ ان کا مرنا اور جینا اسلام کے لیے ہوگا۔ اور انھوں نے اپنی اس نئی تنظیم کے لیے جو بیک ایک ہی اجتماع میں وجود پذیر ہو گئی "الاخوان المسلمون" کا نام منتخب کیا۔

۵ محرم ۱۳۴۸ھ (۱۹۲۹ء) کو اسماعیلیہ میں "الاخوان المسلمون" نے مرکز اور مسجد کا سنگ بنیاد رکھا۔ اور اس کے بعد نہ صرف اسماعیلیہ کے اندر اخوان کی شاخیں کھلنا شروع ہو گئیں بلکہ سوئز کے علاقے اور اسکندریہ میں بھی جگہ جگہ شاخیں قائم ہو گئیں اور یہ قافلہ پورے نظم و ضبط کے ساتھ منزل مقصود کی جانب تیزی سے روانہ ہو گیا۔

اکتوبر ۱۹۳۳ء میں حسن البنّا اسماعیلیہ سے قاہرہ تبدیل کر دیے گئے۔ اسماعیلیہ میں انھوں نے جو چھ سال گزارے وہ نتیجہ اور کام کے لحاظ سے الاخوان المسلمون کا اصل سرمایہ ثابت ہوئے۔ قاہرہ منتقل ہونے سے پیشتر قاہرہ میں الاخوان کا مرکز کھل چکا تھا۔ قاہرہ میں "جمعیت تہذیب اسلامی" کے نام سے ایک تنظیم پہلے سے موجود تھی جس نے مخلص نوجوانوں کا ایک گروہ اسلام کے گرد جمع کر رکھا تھا۔ اس جمعیت نے اسماعیلیہ کے اندر "الاخوان المسلمون" کے کام اور دعوت سے متاثر ہو کر اپنے آپ کو الاخوان کے اندر مدغم کر لینے کا فیصلہ کر دیا۔ چنانچہ اس فیصلے کے بعد قاہرہ کے اندر "جمعیت تہذیب اسلامی" کا مرکز اور اس

کی شاخیں الاخوان کے مرکز اور شاخوں میں تبدیل ہوگئیں۔ ۱۹۳۳ء میں جب حسن البنّا قاہرہ آئے تو وہاں جماعت کا کام اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ تھوڑے عرصہ کے بعد امام کو معلّمی کا منصب ترک کر کے ہمہ تن تحریک کے لیے وقف ہونا پڑا۔

شادی اور اولاد

اسماعیلیہ کے لوگ امام حسن البنّا کے بے حد گرویدہ تھے۔ اسماعیلیہ کے اہل ایمان کا گروہ تو ان کی ذات کو اپنے لیے روحانی سکون کا ذریعہ گردانتا تھا۔ ان لوگوں میں سے ایک صاحب الحاج حسین الصولی تھے۔ یہ اسماعیلیہ کے شرفاء میں شمار ہوتے تھے۔ انھوں نے امام البنّا کی دعوت اور اخلاق سے متاثر ہو کر امام کے ساتھ اپنی رفاقت کو نہایت مضبوط اور مستحکم کرلیا۔ بہت سے معاملات میں یہ امام البنّا کی مدد و نصرت اور پشت پناہی کرتے رہے۔ الحاج حسین الصولی کے تمام لڑکے بھی امام البنّا کے عقیدتمند تھے۔ چنانچہ الحاج حسین الصولی نے روحانی رشتہ پر اکتفاء نہ کیا بلکہ الفت و مودّت کا تعلق استوار کرنے کے لیے اپنی لڑکی لطیفہ سے حسن البنّا کی شادی کردی۔ یہ شادی رمضان المبارک ۱۳۵۱ھ کی ۲۷ تاریخ (۱۹۳۲ء) کو منعقد ہوئی۔ آئندہ چل کر حالات نے بتا دیا کہ یہ خاتون کس درجہ ایمان و احتساب کی دولت اور تقویٰ و طہارت کی صفت سے مالامال تھی۔ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بالکل برحق ہے کہ "الطیبّات للطیبین" (پاک مردوں کو پاک عورتیں ملتی ہیں)۔ اس نیک نہاد خاتون نے تکلیف و آرام میں ہر طرح سے امام البنّا کا ساتھ دیا اور جس فقر و قناعت سے امام نے زندگی بسر کی اسی فقر و قناعت کا اُس نے مظاہرہ کیا۔ اس خاتون سے اللہ تعالےٰ نے امام البنّا کو چھ اولادیں عطا فرمائیں۔ پانچ لڑکیاں اور ایک لڑکا۔ لڑکیوں کے نام سناء، وفا، رجا، ہاجرہ اور استشہاد ہیں۔ یہ آخری لڑکی جس کا نام استشہاد رکھا گیا، اس روز پیدا ہوئی جس روز امام البنّا شہید کیے گئے۔ اسی شہادت کی مناسبت سے اس کا نام بھی والدہ نے استشہاد رکھا۔ لڑکے کا نام احمد سیف الاسلام ہے۔ یہ حال

ہی میں میڈیکل کالج سے فارغ ہوا ہے۔ظاہری شکل وصورت اور اخلاق وعادات میں اپنے والدمحترم کے ساتھ گہری مشابہت رکھتا ہے تعلیم میں ہمیشہ یہ اوّل رہا ہے۔ دارالعلوم قاہرہ سے اس نے ایک ہی سال میں دو ڈگریاں حاصل کیں۔ ایک قانون میں اور دوسری آرٹس میں۔ جمال عبدالناصر کے عہد میں احمد سیف الاسلام کو تمام ملازمتوں سے محروم کر دیا گیا تھا اور پھر اُسے ۲۵ سال قید بامشقّت کی سزا سُنائی گئی تھی۔عربی کا یہ محاورہ احمد سیف الاسلام پر پوری طرح منطبق ہوتا ہے:۔" ھذا الشبل من ذاك الاسد" (شیر کا بچّہ شیر ہوتا ہے)۔

تصنیف وتالیف

امام حسن البنّا صحیح معنوں میں ایک داعی اور مصلح تھے۔ انھوں نے تحقیق وکاوش کا وہ راستہ اختیار نہیں کیا جوان کے پیشرو علامہ رشید رضا اختیار کر چکے تھے۔ ان کے پیشِ نظر اسلام کے لیے کام کرنے والے جانبازوں کی ایک تحریک برپا کرنا تھا جو اپنی زندگیوں کو اسلام کے عملی سانچہ میں ڈھال سکیں اور دنیا کے سامنے اسلام کے مثالی کردار کا نمونہ ہوں۔یہی وجہ ہے کہ موصوف علمی پہلو کے بجائے اپنی توجہ زیادہ تر عملی پہلو پر دیتے رہے۔ اور تحریک کے علمبرداروں اور حامیوں کی اخلاقی اور روحانی تربیت کے لیے وقف رہے۔ ایک مرتبہ ان سے پوچھا گیا کہ "آپ کتابیں کیوں تصنیف نہیں کرتے ہ"۔ امام صاحب نے جواب دیا:۔ " اصنف الرّجال " (میں انسان تصنیف کرتا ہوں) امام شہید کا تصنیفی سرمایہ جو ہمارے سامنے اس وقت ہے وہ یہ ہے:۔

۱۔ مذکرات الدعوۃ والداعیۃ (دعوت اور داعی کی ڈائری)۔ یہ کتاب اس وقت قارئین کے سامنے ہے۔ اسے امام شہید کی تصنیف کے بجائے امام کے "پارہ ہائے جگر" کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ یہ ڈائری دو حصّوں پر مشتمل ہے۔ ایک حصّہ ان کی اپنی سرگزشت اور واردات قلبی سے عبارت ہے، اور دوسرا حصّہ تحریک کی مختلف سرگرمیوں،

پروگراموں اور رودادوں پر مشتمل ہے۔

۲۔ رسائل الامام الشہید : یہ چند رسائل کا ایک مجموعہ ہے۔ یہ رسائل مختلف اوقات میں امام شہید نے تالیف کیے ہیں ان کی تفصیل یہ ہے :

۱۔ رسالۃ التعالیم : یہ رسالہ ان ہدایات پر مشتمل ہے جو امام البنّا نے جماعت " الاخوان المسلمون " سے باقاعدہ منسلک ہونے والوں کو دی تھیں ۔ ان میں ان کے مخاطب وہ کارکن ہیں جن سے بیعت لی گئی ہے اور اب وہ اس امر کے محتاج ہیں کہ جماعت سے ان کے تعلق کو مثالی بنایا جائے ۔ چنانچہ ہدایات میں امام البنّا شہید نے انھیں واضح کر دیا ہے کہ " جماعتی بیعت کی بنیادیں دس ہیں : "

۱۔ تدبر ، ۲۔ اخلاص ، ۳۔ عمل ۔ ۴۔ جہاد ، ۵۔ قربانی ، ۶۔ اطاعت ، ۷۔ ثابت قدمی ، ۸۔ یکسوئی ، ۹۔ اخوت ، ۱۰۔ باہمی اعتماد۔

آخر میں یہ بتایا گیا ہے کہ اس بیعت کے بعد ارکانِ جماعت پر زندگی کے تمام پہلوؤں میں کیا کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ انھیں انفرادی اور اجتماعی زندگی میں کن باتوں کا پابند اور کن امور سے مجتنب رہنا چاہیئے ۔

۲۔ رسالۃ الجہاد : یہ رسالہ جہاد کی فرضیت ، جہاد کے فضائل اور جہاد کی ضرورت واہمیت پر مشتمل ہے ۔ امام البنّا نے یہ رسالہ اس دور میں تحریر فرمایا تھا جب اخوان المسلمون کے رضا کار مجاہدین فلسطین میں یہودیوں کے خلاف جہاد کے لیے نکلے تھے ۔ یہ رسالہ گویا ایک علمی و فکری کاوش نہیں بلکہ جانباز دستوں کے لیے کتاب ہدایت تھا ۔

۳۔ دعوتنا فی طور جدید : (ہماری دعوت نئے مرحلے میں) یہ رسالہ امام البنّا نے اس دور میں تحریر کیا تھا جب الاخوان کی تحریک تیزی سے

پھیل رہی تھی، اور ایک طرف نوجوان جوق در جوق اس میں شامل ہو رہے تھے، اور دوسری طرف معترضین کی طرف سے اس کے خلاف شکوک وشبہات پھیلائے جا رہے تھے۔ چنانچہ امام البنّا نے اس رسالے میں ان تمام پہلوؤں کو واضح کر دیا ہے جن پر انگشت نمائی کی جا رہی تھی۔ پہلے انھوں نے یہ بتایا ہے کہ ہماری دعوت کوئی محدود دعوت نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک عالمی اور انسانی دعوت ہے اور پھر یہ بتایا ہے کہ یہ دعوت عقل اور ایمان دونوں کے امتزاج پر قائم ہے۔ اس وقت مصر میں جو چار نوعیت کے نظریات پھیل رہے تھے ان نظریات کے بارے میں اخوان کی دعوت کا موقف بیان کیا گیا ہے۔ وہ چار نظریات یہ تھے:

۱۔ مصری نیشنلزم۔
۲۔ عرب نیشنلزم۔
۳۔ مشرقیت اور
۴۔ عالمگیریت

اسی ضمن میں انھوں نے الاخوان کا نصب العین بیان کیا ہے:

"ہم مصر کے اندر ایک اسلامی ریاست قائم کرنا چاہتے ہیں جو اسلام کی دعوت کو اپنائے۔ عرب اقوام کو متحد کرے اور ان کی فلاح وبہبود کی کوشش کرے۔ نیز وہ دنیا بھر کے مسلمانوں کو ظالم طاقتوں کی جارحیت سے نجات دلائے اور دنیا میں اللہ کا کلمہ بلند اور اللہ کے دین کی اشاعت کرے۔ حتی لا تکون فتنة ویکون الدین کله لله"

آخر میں انھوں نے جماعت کے طریق کار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ ہم ایک مسلمان فرد، ایک مسلمان گھرانہ اور ایک مسلمان معاشرہ تعمیر

کرنا چاہتے ہیں ۔

۴ - الرسائل الثلاث : یہ تین رسالے یکجا ہیں ۔ اس میں پہلے رسالے کا عنوان ہے دعوتنا (ہماری دعوت کیا ہے) دوسرے کا عنوان ہے : الی ای شئی ندعو الناس (ہم لوگوں کو کس چیز کی طرف بلاتے ہیں) تیسرے رسالے کا عنوان ہے : نحو النور (روشنی کا پیغام) ۔ یہ تیسرا رسالہ درحقیقت ایک خط ہے جو امام البنّا نے ۱۹۳۶ء میں مصر و سوڈان کے بادشاہ فاروق اور وزیر اعظم نحاس پاشا اور تمام عالمِ اسلامی کے فرمانرواؤں کو لکھا تھا ۔ اس خط میں انھوں نے بڑے ایجاز و بلاغت کے ساتھ پہلے اسلام کے اصول و مبادی اور اسلامی تہذیب و تمدّن کو بیان کیا ہے ۔ اور صاف صاف لکھا ہے کہ اس قدر عظیم نظریۂ حیات کی موجودگی میں مغربی طرز زندگی اور طرز تمدّن و معاشرت اختیار کرنا بڑے خسارے کی بات ہے ۔ اس ابتدائی بحث کے بعد اسلامی نظریۂ حیات اور مغربی نظریۂ زندگی کا موازنہ کیا گیا ہے اور دونوں راستوں کی خصوصیات واضح کی گئی ہیں اور یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ اسلام ہر پہلو سے خواہ عسکری تنظیم ہو یا صحت و تعلیم ، اقتصادی اور معاشرتی اصلاحات ہوں یا ملکی قوانین ، ہر شعبے میں ملتِ اسلامیہ کی ترقی کا ضامن ہے ۔ آخر میں پچاس شقوں پر مشتمل اصلاحی تجاویز پیش کی گئی ہیں ان میں سے دس سیاسی ، عدالتی اور ملکی نظم و نسق سے متعلق ہیں تیس معاشرتی اور تعلیمی امور سے متعلق ہیں اور دس اقتصادی مسائل سے متعلق ہیں ۔

۵ - بین الامس والیوم (ماضی اور حال کا موازنہ) یہ امام البنّا کا سب سے پہلا رسالہ ہے ۔ یہ دوسری عالم گیر جنگ شروع ہونے سے تھوڑی مدّت پہلے انھوں نے تحریر کیا تھا ۔ اس رسالے میں انھوں نے اسلام کے اصول و مبادی اور

ملی اصلاح کے وسائل بیان کیے ہیں ۔ شروع میں اس پہلی اسلامی ریاست کے خدوخال بیان کیے ہیں جو قرآن کی روشنی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں قائم ہوئی تھی ۔ اور ضمناً ان عوامل و محرکات کا تجزیہ کیا ہے جو مسلمانوں کے زوال کا باعث بنے ہیں ، اور آخر میں دعوت اخوان کو اس عنوان سے بیان کیا ہے کہ یہ اسلام کے احیاء اور انسانیت کی نجات کی دعوت ہے"۔

۶ ۔ رسالۃ المؤتمر الخامس : یہ وہ خطاب ہے جو امام البنّا نے الاخوان کی پانچویں سالانہ کانفرنس کے موقع پر پیش کیا تھا ۔ اس کانفرنس میں الاخوان کی دس سالہ جدوجہد (۱۳۴۷ھ مطابق ۱۹۲۸ء تا ۱۹۳۸ء) کا جائزہ لیا گیا تھا ۔ اس خطاب میں تین بڑے عنادین کے تحت کلام کیا گیا ہے :

۱ ۔ الاخوان کے مقاصد اور ان کی دعوت کی خصوصیات ۔

۲ الاخوان فروغ دعوت کے لیے کن وسائل سے کام لیتے ہیں اور ان کا طریق کار کیا ہے ۔

۳ ۔ مختلف ملکی اداروں اور تنظیموں اور نظریات کے بارے میں الاخوان کا موقف ۔

امام البنّا کا یہ خطاب اخوان کی دعوت کو سمجھنے کے لیے بے حد ضروری ہے ۔

۷ ۔ الاخوان المسلمون تحت رایۃ القرآن (اخوان المسلمون قرآن کے جھنڈے تلے) ۔ یہ بھی ایک تقریر ہے جو امام البنّا نے ۴ر اپریل ۱۹۳۹ء کو قاہرہ میں دارالاخوان میں ایک زبردست اجتماع کے سامنے کی ۔ اس میں جماعت کے مقاصد اور نوجوانوں کے فرائض بیان کیے ہیں ۔ اور ان مفاسد کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی دعوت دی گئی ہے جو تقلید افرنگ کے نتیجے میں مصری معاشرے کو گھن کی طرح چاٹ رہے ہیں ۔

۸۔ مشکلاتنا فی ضوء النظام الاسلامی (اسلامی نظام کی روشنی میں قومی مسائل کا جائزہ)۔ یہ رسالہ امام البنّاؒ نے قیام پاکستان کے بعد تحریر کیا ہے۔ اس رسالے میں پہلے مصر اور دوسرے مسلم ممالک کے سیاسی حالات کا بھرپور تجزیہ کیا گیا ہے (اس تجزیہ میں یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ پاکستان جو ایک نوخیز اسلامی ریاست ہے وہ بُت پرست ہندو قوم کی مسلح جارحیت سے دوچار ہے اور تمام استعماری ممالک جن میں روس بھی شامل ہے اس جارح طاقت کی اسلحہ سے امداد کر رہے ہیں)۔ قومی مسائل کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ان کی اصلاح کی تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ پہلے حصے میں نظامِ حکومت سے متعلق تمام خرابیوں کا تجزیہ کیا گیا ہے اور پھر اسلامی نظریہ کی بنیاد پر ان کی اصلاح کی صورت بیان کی گئی ہے۔ دوسرے حصے میں اقتصادی نظام پر بحث کی گئی ہے اور اسلام کے اقتصادی نظام کے خصائص بیان کر کے اقتصادی فساد کا علاج تجویز کیا گیا ہے۔

۳۔ خطب حسن البنّاؒ (امام حسن البنّاؒ کے خطبے) امام موصوف وقتاً فوقتاً مختصر تقریریں کرتے اور درس دیتے رہے ہیں۔ ان مختصر تحریروں کو کتابی شکل میں شائع کر دیا گیا تھا۔ ان خطبوں کے بارے میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ امام البنّاؒ نے سمندر کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔

۴۔ مقالات حسن البنّاؒ: امام صاحب اخوانی رسائل و جرائد میں مختصر اور جامع انداز میں اپنے کارکنوں اور رفیقوں کو حالات و ظروف کے مطابق ہدایات اور مشورے دیتے رہتے تھے۔ ان چھوٹے چھوٹے شذرات کو جو درحقیقت "شذرات الذہب" ہیں۔ اس کتاب میں جمع کر دیا گیا ہے۔ بلاغت و ایجاز

اور تاثیر کے قابل تعریف نمونے ہیں۔

۵۔ الماثورات: یہ مسنون دعاؤں کا ایک مجموعہ ہے جسے امام شہید نے خود مرتب کیا ہے۔ اس مجموعے کے آخر میں " وردالرابطة " کے نام سے ایک طویل دُعا ہے جو خود امام البنّا کی تصنیف کردہ ہے۔ یہ دعا اخوان کے کارکن نماز مغرب شروع کرنے سے پہلے یک زبان ہو کر پڑھتے ہیں۔ اور اس میں اس عہد کا اعادہ کرتے ہیں۔ جو اسلام، تحریک اور خدا کے ساتھ انھوں نے استوار کر رکھا ہے۔

اور بھی متعدد تحریریں ملتی ہیں جو حسن البنّا کے قلم سے سیاسی، اخلاقی اور معاشرتی تقاضوں کے تحت منظر عام پر آتی رہی ہیں۔ ان تحریروں میں یہ بات قدر مشترک ہے کہ وہ مختصر ہیں۔ اور ادب و بلاغت کا اچھا نمونہ ہیں۔ اور مضمون و مدعا کے لحاظ سے نہایت صحت مندانہ سوچ کی عکاسی کرتی ہیں۔

شہادت

جب ہم امام حسن البنّا کی زندگی پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ بچپن سے لے کر آخری لمحات تک انھوں نے زندگی کی جتنی ساعتیں دنیا میں گزاری ہیں ان میں آرام اور سکون کے اوقات بہت کم اور حرکت و عمل کے اوقات بہت زیادہ ہیں۔ وہ ہمیں ایک سیماب وش، محو تب و تاب اور ناآشنائے سکون انسان نظر آتا ہے۔ اس کے دن اسلام کی دعوت اور انسان کی خدمت میں گزر رہے ہیں راتیں خدا کے سامنے حاضری اور آہ و زاری کے لیے وقف ہیں۔ موصوف اکتوبر ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے اور ۱۲ر فروری ۱۹۴۹ء کو قاہرہ کی سب سے بڑی شاہراہ پر شہید کر دیئے گئے۔ اس لحاظ سے ان کی عمر ۴۳ سال کے لگ بھگ ہوتی ہے۔ اس مختصر سی عمر میں انھوں نے ایک عظیم الشان تحریک کو قائم کیا اور پھر اسے اس قدر ترقی دی کہ وہ عالمِ عرب کی سب سے بڑی اسلامی

تحریک کہلائی ۔ اس تحریک نے فکر و عمل کی دنیا میں اس قدر عظیم انقلاب برپا کر دیا کہ آج تک اس کے اثرات نہیں مٹائے جا سکے ۔ عمر اور کام کا جب موازنہ کیا جاتا ہے تو عمر کی کمی اور کام کی وسعت دیکھ کر یہ کہے بغیر چارہ نہیں رہتا کہ حسن البنّا ایک موہوب ہستی کا کانام ہے ۔ ان کی حیات دنیا کی ایک ساعت کئی سالوں پر بھاری تھی ۔ اور یہ خصوصیت اللہ تعالیٰ نے انھیں اس بے پناہ روحانیت ، بے کراں جذبۂ عشق اور بے نہایت اخلاص و عزیمت کی بدولت عطا فرمائی تھی جس کا مظاہرہ وہ زندگی کے ہر سانس میں کرتے رہے ۔ چنانچہ ان کی شہادت کے واقعہ پر مصر کے نامور عالم دین شیخ محمد الغزالی نے ان الفاظ میں اظہارِ خیال کیا

> " قاتل کی گولی نے ایک ایسے جسم کو چیرا جسے خشوع اور خضوع سے لبریز عبادت نے چکنا چور کر رکھا تھا جو طول قیام اور طول سجود کے سبب بے حد گھُل چکا تھا ، جو راہِ خدا میں مسلسل سفروں سے غبار آلود ہو چکا تھا ، جس کی پیشانی پے در پے دوروں کی وجہ سے بے خستگی کی غمازی کر رہی تھی ۔"

گو قاتل نے ایسے آرام نا آشنا وجود پر گولی چلا کر جس جرم کا ارتکاب کیا اس کی شناعت میں کوئی شبہ نہیں ہے مگر اس وجود کے لیے یہ گولی ایک ابدی آرام کا پیغام لے کر آئی ، وہ ابدی آرام جس کی خبر رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے دیتے ہوئے فرمایا کہ :

> " مومن جب دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو تکالیف و آلام سے نجات پاکر آرام وراحت کی دنیا میں منتقل ہو جاتا ہے ۔"

حسن البنّا کی عظمت میں گھریلو تربیت کا حصّہ

اللہ تعالیٰ اپنے دین کے لیے جس بندے کو منتخب کرتا ہے اس کے لیے ہر لحاظ سے ایسے اسباب فراہم کر دیتا ہے جو اُسے بچپن سے اس کارِ عظیم کے لیے تیار کرنا شروع کر دیتے ہیں ۔ دورِ جدید میں اس کی سب سے بڑی مثال امام حسن البنّا کی پیش کی جا سکتی ہے ۔ ہم دیکھتے ہیں

کہ ایک طرف حسن البنّا کا بچپن اور جوانی کا ماحول ان کے اندر وہ قوّتِ عزم اور روحانی پاکیزگی کو نشو ونما دے رہا ہے جو مصلح کے لیے لازمی سرمایہ ہے اور دوسری طرف ان کے اندر دینی غیرت وحمیّت، منکر سے نفرت اور معروف کی اشاعت کا وہ جذبہ فروزاں بیدار کر رہا ہے جو انھیں حالات سے برسرِ پیکار رکھنے کے لیے ضروری تھا۔

حسن البنّا جس گھرانے میں پیدا ہوئے وہ ایک سادہ دیہاتی گھرانہ تھا۔ یہ گھرانہ اور یہ ماحول اُن بہت سے عیوب و مفاسد سے پاک تھا جن میں شہری زندگی مبتلا ہوتی ہے۔ شجاعت و مردانگی، اخوت و تعاون، غیرت وحمیّت، سادگی و بے لوثی، وفاشعاری و راست بازی یہ وہ عمومی صفات ہیں جو حسن البنّا کو اخلاقی لحاظ سے اپنے دیہاتی گھرانے میں ورثے میں ملیں۔ چونکہ ان کے والد ازہر کے تعلیم یافتہ تھے۔ فقہ و حدیث پر گہری نظر رکھتے تھے۔ غربت کے باوجود ان میں استغنا کی شان موجود تھی اور مزید برآں یہ کہ انھوں نے جو علم دین حاصل کیا تھا اسے روزی کمانے کا ذریعہ نہ بنایا بلکہ گھڑی سازی کا پیشہ اختیار کر کے گزراوقات کا انتظام کیا، اس لیے حسن البنّا کو علم نافع کے ساتھ ساتھ عمل صالح کے مثالی نمونے کا مشاہدہ ماں کی گود اور باپ کی صحبت ہی میں نصیب ہو گیا تھا، اور پھر خود ان کے اندر بھی ان چیزوں کی رغبت جنم لینے لگی۔ اس گھریلو تعلیم و تربیت کا نقشہ ملاحظہ کرنے کے لیے حسن البنّا مرحوم کے چھوٹے بھائی عبدالرحمٰن البنّا کا یہ بیان کافی ہے وہ اپنے شہید بھائی کو خطاب کر کے کہتے ہیں:

> "برادر بزرگ! تم عمر کے نویں سال میں تھے، اور میں ساتویں سال میں۔ ہم دونوں مکتب میں قرآن کریم حفظ کرتے تھے، اور تختیاں لکھا کرتے تھے۔ تمہیں قرآن کا دو تہائی حفظ ہو چکا تھا اور مجھے صرف ایک ثلث سورۂ بقرہ سے سورۃ التوبہ تک یاد ہوا تھا۔ ہم مکتب سے لوٹتے تو ہمارے والد کا دستِ شفقت ہمیں لپک کر لیتا۔ اور ہماری ساخت و پرداخت میں لگ جاتا۔ والد محترم ہمیں سیرۃ النبیؐ

کے اوراق مطہرہ اور فقہ، اصول فقہ اور نحو کے اسباق زبانی حفظ کراتے۔ والد بزرگوار نے ہمارے لیے ایک گھریلو نصاب تعلیم وضع کر رکھا تھا۔ جسے وہ ہمیں پابندی سے پڑھاتے تھے۔ آپ ان سے فقہ احناف پڑھتے تھے اور میں فقہ مالکی پڑھتا تھا۔ آپ نحو میں الفیہ پڑھتے تھے اور میں ملحمۃ الاعراب "۔

" ہمارے اسباق کا تقاضا ہوتا تھا کہ ہم دونوں مل کر انھیں دہرائیں اور انتھک محنت سے کام لیں۔ لہذا ضروری تھا کہ ہم اوقات کو منضبط کرلیں۔ اور تمام کاموں کی ایک فہرست بنالیں۔ اے میرے پیارے بھائی میں نے تم سے بڑھ کر زندگی میں کثرت سے روزے رکھنے والا اور کثرت سے نمازیں پڑھنے والا نہیں دیکھا۔ آپ سحری کے وقت بیدار ہو جاتے تھے۔ اور قیام اللیل کرتے تھے۔ پھر مجھے نماز فجر کے لیے جگاتے، اور نماز کے بعد میرے سامنے کاموں کی فہرست تلاوت کرتے۔ آپ کے پیارے الفاظ ابھی تک میرے کان میں گونج رہے ہیں۔ آپ فرماتے: پانچ بجے سے چھ بجے صبح تک قرآن کریم پڑھنے کا وقت ہے۔ چھ سے سات تک تفسیر اور حدیث۔ سات سے آٹھ تک فقہ اور اصولِ فقہ۔ یہ ہماری گھر کی تعلیم تھی۔ اور پھر ہم مکتب کی راہ لیتے تھے "۔

" والد بزرگوار کی لائبریری میں کتابوں کی بہتات تھی۔ ہم اپنی ننھی ننھی آنکھوں سے کتابوں کا جائزہ لیتے۔ کتابوں کے نام سنہری حروف میں نقش تھے۔ ہم کبھی " نیسابوری " لے لیتے، کبھی " قسطلانی " اور کبھی " نیل الاوطار " والد ہمیں اجازت مرحمت فرماتے، بلکہ ہمیں ترغیب دیتے کہ ہم ان کی لائبریری کو دیکھا کریں۔ آپ اس بارے میں گوئے سبقت لے جاتے تھے۔ میں آپ کا ہم قدم بننے کی کوشش کرتا لیکن میں کہاں اور آپ کہاں۔ آپ غیر معمولی

انسان تھے۔ میری اور آپ کی عمر کا فرق تو صرف دو سال کا تھا۔ مگر مشیتِ الٰہی آپ کو ایک امرِ عظیم کے لیے تیار کر رہی تھی۔"

" والدِ محترم کی مجلسوں میں علمی بحثیں اور گفتگوئیں جاری رہتی تھیں، ہم یہ بحثیں سنتے تھے۔ والدِ محترم اور علماء کے درمیان بعض اوقات خوب مناظرے ہوتے جنہیں ہم کان لگا کر سُنتے۔ ان مجلسوں میں شیخ محمد زہران آتے۔ استاذ محترم حامد محیین آتے اور علم و تحقیق کی گرم بازاری ہو جاتی۔ مثلاً ہم نے انھیں استواء علی العرش کے مسئلے پر بحث کرتے سُنا۔ یعنی اللہ تعالےٰ عرش پر مستوی ہے۔ کیا یہاں استواء سے مراد بیٹھنا ہے یا متمکن ہونا ہے؟۔ اس بارے میں غزالیؒ کی کیا رائے ہے، زمخشریؒ کیا کہتا ہے اور امام مالکؒ بن انسؓ سے جو قول مروی ہے اس کی کیا حقیقت ہے؟ یہ بحثیں ہم مزے سے سنتے تھے۔ جو بات ہماری فہم میں آجاتی تھیں وہ محفوظ کر لیتے تھے، اور جو باریک و دقیق ہوتی تھیں اس کے بارے میں والد سے رجوع کرتے یا پھر تفسیر کی کتابوں میں انھیں تلاش کرتے۔"

" میں وہ دن نہیں بھلا سکتا جب محمودیہ میں ہمارے گھر کا صحن ننھے بچوں سے بالکل بھر گیا تھا، یہ بچے مکتب کے طلبہ تھے، ان کے ساتھ ان کا مانیٹر بھی تھا اور میاں جی بھی تھے اور ان کی زوجہ محترمہ بھی ہاتھ میں پنجہ لیے ہوئے موجود تھیں۔ بچوں نے زرق برق کپڑے پہن رکھے تھے۔ ہر بچے کے ہاتھ میں کھجور کی ٹہنی تھی جسے اوپر سے چیر اگیا تھا اور اس کے اندر ایک رنگین کاغذ لٹکایا ہوا تھا۔ اس پر کشتی کی تصویر تھی یا درخت کی۔ یہ ٹہنیاں بچوں نے ہاتھ میں اٹھا رکھی تھیں اور بآوازِ بلند وہ یہ نغمہ گا رہے تھے:

صَلُّوا یَا حُضَّار   درود پڑھیے حاضرین۔

علی النّبی المختار نبی پاک پر۔

میاں جی یہ شعر پڑھتے :

لانتصرف حتی تجینا الفضة

فی طاسة مجلوة مبیضة

" اس وقت تک ہم نہ جائیں گے جب تک نہ آجائے

کھنکتی چاندی ایک چمک دار شفاف رکابی میں "

میاں جی کے اس شعر کے بعد بچّے اپنا سابقہ نغمہ دہراتے۔ ہماری امّی جان "کھنکتی چاندی" کو ایک چمکدار شفاف رکابی میں رکھ کر لے آئیں۔ ساتھ ایک کیک اور کچھ پیڑے بھی تھے۔ جن سے استانی صاحبہ کا تھیلا بھر گیا اور میاں جی واپس لوٹ گئے۔ یہ تقریب اس خوشی میں منعقد ہوئی تھی کہ آج آپ نے قرآن کریم مکمل حفظ کر لیا تھا "

(الامام الشہید حسن البنّا۔ صہ ۱۰، ۱۱)

حسن البنّا کی اس گھریلو تربیت کے بارے میں جمعیتہ الشبان المسلمین مصر کے پہلے صدر جنرل محمد صالح حرب پاشا لکھتے ہیں :

" میری رائے میں مرشد شہید کی شخصیت تیار کرنے میں ان کے ماحول کا بہت بڑا حصّہ ہے۔ موصوف ایک نیکوکار، دین دار اور صاحب فضل و علم خاندان میں پیدا ہوئے۔ مرشد کی ذات پر اس خاندانی ماحول نے گہرے اثرات ڈالے۔ پھر مرشد نے جو تعلیم بھی حاصل کی وہ اسلام اور اخلاق حسنہ کی روح سے لبریز تھی۔ تصوّف و سلوک کی دنیا میں وہ آغاز سفر ہی میں داخل ہو گئے۔ مرشد جلیل اسلام کے فہم، قرآن کے حفظ، قرآن کے ذوق، رموز قرآنی کے ادراک اور سنّت پر گہری نظر اور فقہ میں مہارت تامہ کے باب میں بے پایہ اور بے نظیر تھے،

ان کا یہ علمی خزانہ ایک ایسے چشمے کی مانند تھا جو نہ خشک ہوتا اور نہ اس کے
بہاؤ میں رکاوٹ پیدا ہوتی۔ چنانچہ دعوت و ارشاد کی راہ میں یہ علمی خزانہ ان
کے لیے بڑا مددگار ثابت ہوا۔ وہ اپنی گفتگو میں، اپنی تقریریں اور اپنی تحریر
میں اسی وسیع سمندر سے خود بھی سیراب ہوتے تھے اور دوسروں کو بھی سیراب
کرتے تھے۔" (امام الشہید حسن البنّا ص ۱۲۸)

اپنی بستی کا ننّھا داعی

اللہ تعالیٰ نے حسن البنّا کو دعوت و اصلاح اور جہاد و نصیحت کا جو جذبہ ودیعت کیا تھا وہ زندگی کے ہر مرحلہ میں ظہور پذیر ہوتا رہا۔ " الاخوان المسلمون " کی تشکیل مارچ ۱۹۲۸ء میں انھوں نے اسماعیلیہ میں کی۔ مگر اس کی قبل حسن البنّا کی زندگی بتا رہی تھی کہ یہ شخصیت غیر معمولی عزائم لے کر دنیا میں وارد ہوئی ہے اور یہ نہ صرف مصر بلکہ پورے عالم عرب پر اثر انداز ہونے والی ہے۔ وہ جب اپنی بستی کے محدود معاشرے میں تھے اور ابھی مکتب کی تعلیم حاصل کر رہے تھے اس وقت بھی ان کے اندر یہ جذبۂ اصلاح موجزن تھا۔ مدرسے کے اندر انھوں نے اپنے ہم عمر چند کمسن بچّوں کو ساتھ ملا کر ایک بزم قائم کی جس کا نام "جمعیت اخلاق ادبیہ" رکھا۔ اس بزم کے وہ خود ہی صدر منتخب ہوئے۔ اور اس کے مقاصد ننھے طلبہ کے اندر اچھی عادات کو فروغ دینا تھا۔ جب اس بزم اور اس کے محدود کام سے اس نوخیز داعی کے ولولۂ اصلاح کو تسکین نہ ملی تو اس نے مدرسہ کی حدود سے باہر ایک اور انجمن تشکیل کی جس کا نام تھا "جمعیت انسداد محرمات"۔ یہ جماعت بستی کے باشندوں کو منکرات سے اجتناب کی دعوت دیتی اور خطوط کے ذریعہ اُن کو نیکیوں کی تلقین کرتی۔

حسن البنّا جس زمانے میں مدرسۃ الرشاد الدینیہ کے ایک معصوم طالب علم تھے ان کا گزر ایک دن محمودیہ کی ندی پر ہوا۔ کنارے کے پاس ایک بادبانی کشتی کھڑی تھی۔ جس پر لکڑی کی ایک عریاں مورتی آویزاں تھی۔ اس جگہ عورتوں کا بھی بکثرت آنا جانا رہتا تھا۔ اس ننھے

داعی نے جب اس منکر کا مشاہدہ کیا تو اس سے نہ رہا گیا۔ وہ فوراً مقامی پولیس چوکی میں گیا، اور پولیس افسر کے سامنے اس مورتی کے خلاف احتجاج کیا۔ پولیس افسر معصوم طالب علم کی غیرتِ ایمانی سے بڑا متاثر ہوا، اور وہ فوراً ملّاح کے پاس گیا اور مورتی کو مستول سے اتروا دیا۔ اور پھر اگلے روز اس پولیس افسر نے مدرسۃ الرشاد الدینیہ میں جاکر مدرسہ کے صدر مدرس کے سامنے معصوم طالب علم کے جذبۂ غیرت کی بڑی ستائش کی۔

دمنہور کے اسکول میں دعوت و تبلیغ

دمنہور کے ٹیچرز ٹریننگ اسکول میں جب حسن البنّا پہنچے تو اپنے ساتھ اصلاح کے فطرتی ولولے کو بھی لے گئے۔ اسکول کے اندر بھی ان کا سب سے پہلا تعلق اس چھوٹی مسجد کے ساتھ ہوا جو اسکول کے پہلو میں واقع تھی۔ اس مسجد میں انھوں نے باقاعدہ نماز باجماعت کا نظام قائم کیا۔ اور اسی مسجد کے اندر سلسلۂ حصافیہ کے پیروکاروں سے ان کا تعارف ہوا اور وہ ان کی مجالسِ ذکر میں شریک ہونے لگے۔ ان مجلسوں میں حسن البنّا کے جذبۂ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو مزید غذا ملی۔ قدرت نے ان کے روحانی پہلو کو زیادہ سے زیادہ جِلا دینے کے لیے تربیت کا خاص انتظام فرما دیا۔ ایک صوفی تاجر سے ان کی راہ و رسم بڑھی۔ یہ تاجر اسکول کے لڑکوں کو ہفتہ عشرہ میں ایک مرتبہ قبور کی زیارت کو لے جاتا اور وہاں ان کے اندر زندگی کے فانی ہونے کا تصوّر جاگزیں کرتا۔ انھیں صلحاء و اتقیاء کی حکایات سُناتا جس سے ان کے دل گداز اور ان کی آنکھیں اشک بار ہو جاتیں اور ان کے اندر خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا جذبہ اُمڈ آتا۔ سلسلۂ حصافیہ خیریہ (حصافی بھائیوں کی رفاہی انجمن) قائم کر دی۔ اس انجمن کے دو مقاصد تھے:

ایک اخلاق فاضلہ کی دعوت اور منکرات و محرمات کا سدباب۔

اور دوسرا عیسائی مشنریوں کا سدباب جو علاج اور خانہ داری کی تعلیم اور یتیم خانوں کی آڑ میں عیسائیت پھیلا رہے تھے۔

دمنہور میں حسن البنّا نے ایک یہ کام بھی شروع کر دیا کہ وہ سحری کے وقت بیدار ہوتے اور مسجد میں نماز تہجد گزارنے کے بعد دمنہور کے موذنوں کو خواب سے بے دار کرنے کے لیے نکل جاتے اور جب مؤذن اُٹھ کر اذانیں دیتے تو حسن البنّا ان کی آوازمیں ایک سرور سرمدی محسوس کرتے ۔ اور اس وقت ان کی روحانی کیفیت بلندی کی اعلیٰ ترین منازل کو چھو رہی ہوتی تھی ۔ جو لوگ دنیا کے اندر رشد و ہدایت کا کام کرنے کے لیے اُٹھے ہوں انھیں حسن البنّا شہید کی زندگی کے اس پہلو کا خاص طور پر مطالعہ کرنا چاہیے ۔ دمنہور کے زمانے میں انھوں نے ضبطِ نفس اور صبر و قناعت کا فراواں توشہ اپنے لیے جمع کر لیا جو ان کی آئندہ زندگی میں قدم قدم پر ان کے کام آیا ۔

حسنُ البنّا قاہرہ میں

دار العلوم قاہرہ میں جب انھوں نے داخلہ لے لیا تو وہ محدود معاشروں سے نکل کر اب ایسے نئے معاشرے میں آ گئے جو سابقہ معاشروں کی نسبت کمیّت اور کیفیت دونوں لحاظ سے وسیع تھا ۔ محمودیہ اور دمنہور کی زندگی اور قاہرہ کی زندگی میں کوئی مماثلت ہی نہ تھی ۔ قاہرہ سیاسی تحریکوں کا مرکز تھا ۔ یہاں علم و ثقافت کے دائرے وسیع الاطراف تھے ۔ یہاں قدیم طرز کے نیک نفس انسانوں کے نمونے بھی ملتے تھے ، اور اخلاقی و اجتماعی فساد کی لہریں بھی نئے نئے زاویے بدل کر اُمڈ رہی تھیں ۔ ان باتوں نے حسن البنّا کے اندر دعوت و اصلاح کے جذبے کو مہمیز لگائی اور ان کے اندر اُسی پیمانے پر کچھ کرنے کا عزم اُبھر آیا جس پیمانے کا فساد تھا ۔ ایک طرف خارجی ماحول اور دوسری طرف داخلی احساسات نے انھیں بے چین کر دیا ۔ قاہرہ کی تنظیم " جمعیت مکارمِ اخلاق " میں شریک ہو گئے ۔ جو اس وقت قاہرہ کے فساد زدہ ماحول میں واحد اصلاحی انجمن تھی ۔ اس جمعیت کے درسوں میں وہ پابندی سے شریک ہوتے رہے ۔

قہوہ خانوں میں دعوت کا کام

لیکن قاہرہ بے راہ روی، فسادِ اخلاق اور مغربیت میں جس بُری طرح ڈوبا جا رہا تھا، حسن البنّا کی نظر میں اس کا تدارک مسجد کے وعظوں سے نہیں ہو سکتا تھا۔ اس غرض کے لیے حسن البنّا نے دار العلوم اور ازہر کے طلبہ پر مشتمل ایک گروہ تیار کیا اور انھیں قہوہ خانوں میں (جہاں سینکڑوں لوگ روزانہ شام کو تفریح کے لیے جمع ہوتے ہیں) اور پبلک اجتماعات میں درس و تدریس اور وعظ و نصیحت کا سلسلہ شروع کیا۔ یہ گروہ جس کے سرخیل حسن البنّا تھے۔ قہوہ خانوں میں جا کر قرآن و حدیث کے درس دیتا اور نرد بازی، قہوہ نوشی، شیشہ کشی اور قصہ خوانی کے بجائے جمہور کو دین کے تقاضوں کی جانب توجہ دلاتا۔ اس طریقۂ وعظ پر مشائخ کی طرف سے بار بار انگشت نمائی کی گئی مگر یہ کامیاب رہا، اور شہروں سے گزر کر قصبوں اور دیہاتوں میں بھی تجربہ کیا گیا۔ اسی گروہ کے اندر ایک کمیٹی تشکیل کی گئی جو دعوتِ اسلامی کی اشاعت کی نگراں قرار پائی۔ گرمائی تعطیلات میں یہ گروہ غیر معمولی طور پر سرگرم ہو جاتا اور شہر اور دیہات اس کی جولان گاہ ہوتے۔ حسن البنّا کو اس طریقۂ دعوت سے دو چیزیں حاصل ہوئیں: ایک خود اعتمادی اور دوسری عوامی نفسیات کا صحیح فہم۔

علماء کی خدمت میں

لیکن ترکی کی لادینی کی تحریک کے جو اثرات مصر پر پڑ رہے تھے اور الحاد و اباحیت کا جو طوفان امڈ رہا تھا اس کے سامنے یہ محدود دو ناتواں "واویلا" بے اثر تھا۔ اور حسن البنّا کی نظر میں "حالات کسی بڑے اور ٹھوس کام کا تقاضا کر رہے تھے"۔ چنانچہ وہ بے چین ہو کر علماء اور مشائخ کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کو فرائض کا احساس دلانے لگے۔ سید رشید رضا مرحوم سے ملے۔ ازہر کے نامور عالمِ دین شیخ یوسف دجوی کی خدمت میں گئے اور انھیں بیباکی کے ساتھ جھنجھوڑا اور انھیں ترغیب دی کہ جہاں قاہرہ ملحدانہ نظریات کے حامل مجلات و جرائد سے بھرا پڑا ہے۔ وہاں کم از کم کوئی اعلیٰ پیمانے کا اسلامی مجلہ ہی جاری کرنا چاہیے جو ـــ

" جاہلیت جدیدۃ " کے بُت کدے میں نعرۂ حق بلند کرے۔ المکتبۃ السلفیۃ کے مالک محب الدین خطیب سے رابطہ قائم کیا۔ شیخ محمد خضر حسین شیخ الازہر کے آگے حالات کی شکایت کی۔ فرید وجدی کی محفلوں میں شرکت کی۔ یہ حضرات اس وقت مصر کے چوٹی کے اہل علم تھے۔ حسن البنّا ایک ایک سے ملے اور انھیں الحاد واباحیّت کے طوفان بلاخیز کا سدّباب کرنے کے لیے اکسایا۔ اس تگ وتاز کا نتیجہ زیادہ حوصلہ افزا برآمد نہ ہوا۔ البتہ محب الدین الخطیب نے الفتح کے نام سے ایک ہفت روزہ جاری کر دیا۔ اس ہفت روزہ نے اس دور میں اسلام کے محاذ پر نہایت قابل قدر کردار ادا کیا۔

حسن البنّا خود داعی اور مصلح کے تمام اوصاف سے متصف تھے۔ اخلاق وکردار کی پاکیزگی عزم وہمّت کی مضبوطی، ذوق وولولہ کی آگ اور علم وآگہی کا سرمایہ یہ سب اوصاف داعی کے لیے ضروری ہیں۔ چنانچہ حسن البنّا ان تمام اوصاف سے بدرجۂ اتم بہرہ مند تھے۔ وہ اگر دوسروں کو دعوت واصلاح کے لیے اکسا رہے تھے تو صرف اس وجہ سے کہ ان پر اتمامِ حجت کریں ورنہ ان کے عزائم اور صلاحیتیں اس امر کے لیے کافی تھیں کہ وہ پہلے ہی روز اپنے کام کا آغاز کر دیتے۔ شیخ محمد الغزالی جو حسن البنّا کے ساتھیوں میں سے تھے لکھتے ہیں کہ:

> " کامیاب قائد وہ ہوتا ہے جو پہلے سے موجود وسائل کا صحیح استعمال کر سکے۔ اور کامیاب تر قائد وہ ہے جو خود وسائل کو بھی عدم سے وجود میں لائے۔ حسن البنّا دوسری قسم کے قائد تھے۔"

دار العلوم کی طرف سے امتحان کے لیے جو مقالہ حسن البنّا کو دیا گیا اس کا عنوان تھا:

" تعلیم کے بعد آپ کیا کام کرنے کی خواہش رکھتے ہیں اور اس کے لیے کیا وسائل اختیار کریں گے؟"

حسن البنّا نے اس کے جواب میں لکھا: " میں داعی اور معلّم بننا چاہتا ہوں۔ دن کو سال کے اکثر و بیشتر ایّام میں مصر کی نئی نسل کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کروں گا۔ اور راتوں کو اور چھٹیوں کی فرصتوں میں ان کے والدین کو مقصدِ دین سے آگاہ کروں گا۔ انھیں بتاؤں گا کہ سعادت کا سرچشمہ کہاں

ہے اور زندگی کی حقیقی مسرتیں کیسے دستیاب ہو سکتی ہیں۔ اس غرض کے لیے ہر وہ وسیلہ اختیار کروں گا جو میرے بس میں ہوگا۔ تقریر سے، گفتگو سے، تالیف و تصنیف سے، کوچہ گردی اور بادیہ پیمائی سے الغرض ہر مؤثر ہتھیار سے مدد لوں گا"۔

یہ ہیں اُس نوجوان کے جذبات جس نے ابھی عمر کے دو عشرے بھی مکمل نہیں کیے اور جسے نہ صرف اپنے دامن کو بچانے کی فکر ہے بلکہ دوسروں کے دامن کو بھی بچانے کا عزم رکھتا ہے۔ حسن البنّا کے بھائی عبدالرحمٰن البنّا لکھتے ہیں کہ "بچپن میں ایک روز میرے بھائی حسن البنّا نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے کہا: عبدالرحمٰن! کیا ہم دونوں نے اللہ تعالےٰ کا یہ ارشاد سورۂ آلِ عمران میں حفظ نہیں کیا "وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ" (تم میں سے ایک گروہ ایسا ہونا چاہیے جو بھلائی کی دعوت دے، معروف کا حکم کرے اور منکر سے روکے)۔ میں نے کہا: ہاں ہم نے یہ آیت حفظ کر رکھی ہے۔ میرے بھائی نے فوراً مجھے کہا کہ پھر اٹھیے، کوئی کام کریں۔ چنانچہ انھوں نے قصبے کے اندر "جمعیت منع المحرمات" (انجمن انسداد محرمات) قائم کی۔ جس ہستی کی نوعمری میں یہ کیفیت تھی وہ عالم جوانی میں داخل ہو کر کب تک وسائل کی فراہمی اور حالات کی سازگاری کا انتظار کر سکتی تھی۔

اسماعیلیہ میں الاخوان المسلمون کا قیام

حسن البنّا دارالعلوم قاہرہ سے فارغ ہوئے تو اسماعیلیہ میں ایک اسکول میں معلّم بنا دیے گئے۔ یہ ۱۹۲۷ء کی بات ہے۔ اسماعیلیہ کا سفر وہ جن جذبات سے کر رہے تھے ان سے بھی صاف عیاں ہوتا ہے کہ وہ اس شہر کو اپنی امنگوں کا آئینہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس شہر سے اگر انھیں کوئی دلچسپی ہے تو صرف اس پہلو سے کہ یہ ان کے ارادوں کی تکمیل اور ان کے اصلاحی مشن کو بروئے کار لانے کے لیے کس حد تک ممد و معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ شہر میں پہنچتے ہی انھوں نے ایک زیرک داعی اور ناصح حکیم کی طرح مقامی حالات کا

اس نظر سے جائزہ لینا شروع کر دیا کہ یہاں دعوت کے لیے کون سا اسلوب زیادہ کارگر اور مؤثر ہوگا اس جائزے کی روسے انھوں نے مسجدوں کے عوام کو اپنا مخاطب نہیں بنایا۔ بلکہ قہوہ خانوں کے عوام کی طرف رُخ کیا اور غیر آباد زاویوں کو اپنی اجتماع گاہ بنایا۔ اور اپنی آتش بیانی اور شیریں نوائی سے اسماعیلیہ کے کوچہ و بازار کو دیکھتے ہی دیکھتے آشنائے تب وتاب کر دیا۔ اسماعیلیہ میں انھیں یہ بھی دیکھنے کا موقع ملا کہ کس طرح استعمار مصری عوام کی گردنوں پر کوس حکمرانی بجا رہا ہے۔ اسماعیلیہ انگریزی فوج کی چھاؤنی تھا۔ اس ماحول نے حسن البنّا کے اندر استعمار کے خلاف جذبۂ نفرت کو مزید گہرا کر دیا۔ اور اب ان کے سامنے اسلامی بیداری کی روح پھونکنے کے ساتھ ساتھ مصری عوام کو استعمار کے پنجوں سے آزاد کرانے کا مسئلہ تھا۔ انہی ملے جلے جذبات میں ڈوب کر وہ اسماعیلیہ کے اندر اپنے مشن کی تکمیل میں لگ گئے۔ ان کی کوششوں کے نتیجے میں مارچ ۱۹۲۸ء میں اسماعیلیہ میں ان کے مکان پر "الاخوان المسلمون" کے نام سے ایک تنظیم قائم ہوئی جس کا مقصد اسلام کا احیاء اور انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اسلامی انقلاب برپا کرنا قرار پایا اور اس عظیم کام کے لیے انھوں نے جو طریق کار اختیار کیا وہ چار مرحلوں پر مشتمل تھا۔ ایک "الفرد المسلم" (فرداً فرداً ہر مسلمان کو سچا اور حقیقی مسلمان بنانا)۔ دوسرے "الأسرة المسلمة" (اسلامی گھرانہ وجود میں لانا) تیسرے "الامۃ المسلمۃ" (صحیح معنوں میں اسلام کی پیرو ملت تیار کرنا) چوتھے "الحکومۃ المسلمۃ" (اسلامی حکومت قائم کرنا)۔ اس جماعت کی تاسیس کے بعد حسن البنّا ۱۹۳۳ء تک تقریباً پانچ سال اسماعیلیہ میں رہے۔ ان پانچ سالوں کے اندر ان کی مساعی کا جو ثمرہ نمودار ہوتا ہے اس کی ایک جھلک یہ ہے:-

پہلے دو سالوں میں اسماعیلیہ کے اندر دارالاخوان کے نام سے ایک مرکز اور ایک مسجد تعمیر کی گئی۔ ابوصویر، پورٹ سعید، بلاح اور شبراخیت کے مقامات پر شاخیں قائم ہوگئیں۔ تیسرے سال سویز میں بھی ایک شاخ وجود میں آگئی۔ چوتھے سال دس شاخیں قائم ہوگئیں۔ اسماعیلیہ میں ایک لڑکوں کے لیے اسلامی درس گاہ (درس گاہ حراء کے نام سے) دوسری لڑکیوں

کے لیے درس گاہ (امہات المومنین اسکول) کھول دی گئی۔ اخوان کی دوسری شاخوں کے ساتھ ایک ایک مسجد اور بعض جگہ ایک ایک کلب بھی تعمیر کیے گئے۔

اسماعیلیہ سے قاہرہ منتقلی

۱۹۳۳ء کو حسن البنّا نے اسماعیلیہ سے قاہرہ تبدیلی کروالی تاکہ اس مرکزی شہر کو الاخوان کی دعوت و تحریک کا مرکز بنایا جائے۔ چنانچہ قاہرہ آنے کے بعد حسن البنّا کی سرکردگی میں الاخوان نے جو جدوجہد کی اُس کا خلاصہ خود امام حسن البنّا نے ۱۹۳۴ء میں یعنی قاہرہ میں مقیم ہوجانے کے ایک ہی سال بعد اپنے ایک مضمون میں ان الفاظ میں بیان کیا :

"اخوان کی دعوت اور نظریہ مصر کے پچاس سے زائد شہروں اور قصبوں تک پھیل گیا ہے۔ ان شہروں میں نہ صرف اخوان کی شاخیں قائم ہوچکی ہیں بلکہ ان شاخوں کے ساتھ ہر جگہ کوئی نہ کوئی مفید اسکیم بھی عمل میں آگئی ہے۔ مثلاً : اسماعیلیہ میں اخوان نے ایک مرکز اور ایک مسجد بنائی ہے۔ ایک کلب بنایا ہے۔ بچوں کی تعلیم کے لیے درس گاہ حراء کے نام سے اور بچیوں کی تعلیم کے لیے درس گاہ امہات المؤمنین کے نام سے مدرسے کھول دیئے ہیں۔ شبراخیت میں مسجد اور کلب اور بچوں کا اسکول اور ایک دارالصناعت قائم ہوچکا ہے۔ جو بچے تعلیم مکمل نہیں کرسکتے وہ دارالصناعت میں داخل ہوجاتے ہیں۔ اسی طرح محمودیہ (البحیرۃ) میں کپڑے اور قالین بافی کی ایک فیکٹری اخوان نے کھول لی ہے، اور ساتھ ہی قرآن پاک کی حفظ و ناظرہ تعلیم کی درس گاہ جاری کردی ہے۔ وتھلیہ (المنزلۃ) میں حفظ و ناظرہ کی تعلیم کا مدرسہ جاری ہوگیا ہے۔ الغرض ادفو سے لے کر اسکندریہ تک ہر شاخ نے کوئی نہ کوئی مفید اسکیم جاری کرلی ہے۔ قاہرہ کے اندر متعدد شاخیں قائم ہوچکی ہیں، جو آپ کے سامنے ہیں۔"

ایک جامع تحریک

اب تک تو حسن البنّا کی دعوت صرف عمومی اصلاح تک محدود تھی۔ مگر ۱۹۳۵ء سے انھوں نے سیاسی میدان میں براہ راست قدم رکھ دیا۔ اور اپنی تقریر و اجتماعات میں سیاسی اصلاحات کو بیان کرنے پر اکتفا نہ کیا، بلکہ حکومتوں کو خطوط بھی پے در پے لکھے اور انھیں اصلاح احوال کی طرف توجہ دلائی۔ یہ خطوط بتاتے ہیں کہ اصلاح احوال سے ان کا مدعا صرف دینی یا اخلاقی اصلاح کا نہ تھا بلکہ وہ نظامِ حکومت، اقتصادی، تعلیمی اور تربیتی نظام، ملکی قوانین اور داخلی اور خارجی سیاست تک میں بنیادی اصلاحات چاہتے تھے۔ محمد محمود پاشا کے عہد سے لے کر دوسری جنگ عظیم کے چھڑنے تک حسن البنّا نے نہایت مثبت اور ناصحانہ انداز میں اس طریقِ کار کو اپنائے رکھا۔ ۱۹۳۸ء میں تحریک اخوان ہر لحاظ سے ایک ہمہ گیر انقلابی دعوت بن گئی۔ اور اس نے مصر اور عالمِ عرب کے حساس مراکز تک بھی اپنا پیغام پہنچا دیا۔ ۱۹۳۸ء میں امام البنّا نے تحریک کا تعارف کراتے ہوئے کہا:

> "یہ تحریک ایک جامع نظریہ پر قائم ہے اور اصلاح کے تمام گوشوں اور حقیقتوں کو حاوی ہے۔ یہ ایک سلفی دعوت ہے۔ کیونکہ یہ کتاب و سنّت کی علمبردار ہے۔ اور اسلام کو اس کے اصل چشمۂ صافی کی طرف لوٹا دینا چاہتی ہے۔ یہ ایک طریقہ سنّت ہے۔ کیونکہ اخوان ہر چیز میں سنّت مطہرہ پر عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ ایک سلسلۂ تصوف ہے۔ اس لیے اخوان یہ سمجھ چکے ہیں کہ ہر بھلائی کی بنیاد پاکیزگی نفس صفائے دل اور محبتِ الٰہی ہے۔ یہ ایک سیاسی تنظیم ہے۔ اس لیے کہ ہم ملک کے اندر بھی اور باہر بھی نظامِ حکومت کی اصلاح چاہتے ہیں، اور قوم کو عزّت و وقار کی تربیت دینا چاہتے ہیں۔ یہ ایک ریاضیاتی گروپ ہے۔ اس لیے کہ اخوان ورزشی ٹیموں کے ذریعے سے اپنی جسمانی تربیت کرتے ہیں اور دوسری کھلاڑی ٹیموں کے ساتھ میچ کھیلتے ہیں۔ یہ ایک علمی اور ثقافتی انجمن ہے اس لیے کہ اخوان کے کلب اور مراکز فی الحقیقت تعلیم و تربیت کے

مدرسے اور عقل و روح کو جِلا دینے کے ادارے ہیں۔ یہ ایک اقتصادی کمپنی ہے۔ اس لیے کہ اسلام مالی اُمور بھی سلجھاتا ہے۔ اخوان اسلامی کمپنیاں کھول کر قومی اقتصادیات کو مضبوط کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ ایک معاشرتی نظریہ ہے۔ اس لیے کہ اخوان معاشرے کی بیماریوں کو معلوم کرتے ہیں اور امّت کو ان سے شفایاب کرنے کے لیے علاج تجویز کرتے ہیں[۵۱]۔"

تحریک میں وسعت و ترقی

ایک مصری محقق محمد شوقی زکی لکھتے ہیں:

"۱۹۳۹ء سے لے کر ۱۹۴۵ء تک سیاسی لحاظ سے الاخوان کی دعوت ایک نئے مرحلے میں داخل ہوگئی۔ اس کی سرگرمیوں اور پروگراموں میں غیر معمولی وسعت پیدا ہوگئی۔ اب اخوان کے اندر قاہرہ یونی ورسٹی اور ازہر یونیورسٹی کے نوجوان جوق در جوق شامل ہونے لگے۔ مختلف پیشہ ور عناصر جن میں مزدور، تاجر، صنعت کار کاروباری لوگ، انجینئر، ڈاکٹر، ٹیچر اور وکیل شامل تھے، اس جماعت سے وابستہ ہوگئے۔ اور مصری معاشرے کے تقریباً تمام گروہوں کی نمائندگی ہونے لگی۔ اخوان نے ایک طرف اقتصادی زندگی میں بڑھ چڑھ کر سرگرمی دکھائی اور دوسری طرف ریاضیاتی پہلو اور اسکاؤٹنگ میں انھوں نے حصّہ لیا۔ اخوان کی شاخیں جو مصر کے کونے کونے میں پھیل چکی تھیں بڑے منظم طریقے سے ہر کام کو سر انجام دینے لگیں، اور دیکھتے ہی دیکھتے اخوان ایک ایسی طاقت بن گئے جسے اب نظر انداز نہ کیا جا سکتا تھا[۵۲]۔"

---

۵۱ مجموعہ رسائل الامام الشہید۔ صہ ۲۴۹ - ۲۵۰ -

۵۲ الاخوان المسلمون والمجتمع المصری۔ صہ ۱۶

آزمائشوں کی آمد آمد

لیکن یہی وہ دور تھا جب اخوان کے لیے آزمائشوں اور آلام کے دروازے بھی کھل گئے۔ اخوان کی پہلی آزمائش حسین سرّی پاشا کے عہدِ وزارت میں شروع ہوئی۔ اخوان کی طاقت کو دیکھ کر برطانوی سفارت خانے اور انگریزی ہائی کمان نے حکومت پر دباؤ ڈالا کہ وہ کسی طریقے سے اخوان کے سیلاب کو روکے۔ چنانچہ سری پاشا نے اخوان کے دونوں ہفت روزے التعارف اور الشعاع بند کر دیئے۔ ان کا ماہانہ رسالہ المنار بھی ممنوع قرار دے دیا۔ ان کا پریس بھی ضبط کر لیا۔ اور ملکی اخبارات کو ہدایات بھیج دی گئیں کہ اخوان کے بارے میں کوئی چیز اخبارات میں نہ چھاپی جائے۔ اخوان کو اجتماعات کرنے کی اجازت نہ دی گئی۔ اس کے بعد تحریک کے قائدین کو تتر بتر کرنے کی اسکیم پر عمل درآمد کیا گیا۔ حسن البنّا کو قاہرہ سے قنا تبدیل کر دیا گیا۔ (موصوف ابھی تک محکمۂ تعلیم سے وابستہ تھے) اور سکریٹری جنرل کو دمیاط بھیج دیا گیا۔ اور بعد میں پارلیمنٹ کے شدید احتجاج پر انھیں واپس بلا لیا گیا۔ مگر قاہرہ پہنچتے ہی انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ حالات کی نزاکت کو دیکھ کر انھیں کچھ مدّت کے بعد رہا کر دیا گیا۔ جب نحاس پاشا کی وزارت قائم ہوئی تو نحاس پاشا نے اخوان کے بارے میں نرم پالیسی اختیار کی۔ ۱۹۴۴ء میں نحاس پاشا کی حکومت برطرف کر دی گئی، اور احمد ماہر پاشا نے وزارت بنائی۔ اور اس نے اخوان پر دوبارہ تشدّد شروع کر دیا۔ احمد ماہر نے (انگریزوں کے دباؤ کے تحت) جرمنی اور اٹلی کے خلاف جنگ میں شمولیت کا اعلان کر دیا۔ اخوان نے اس فیصلے کی مخالفت کی۔ اور احمد ماہر سے اس فیصلے کو منسوخ کرنے کا مطالبہ کیا۔ اسی دوران العیسوی نامی ایک شخص نے احمد ماہر پر حملہ کر کے اسے قتل کر دیا۔ احمد ماہر کے بعد نقراشی پاشا کی حکومت آگئی جس نے اپنے عہد کا آغاز ہی حسن البنّا اور اخوان کے سکریٹری جنرل اور دوسرے اخوانی لیڈروں کی گرفتاری سے کیا۔

انگریزی استعمار کے خلاف پُرزور تحریک کا قیام

۱۹۴۵ء میں جب دوسری عالمگیر جنگ ختم ہوگئی تو الاخوان اب ایک اور شدید تر

آزمائش میں داخل ہوئے۔ انگریزوں نے جنگ کے دوران مصری قوم سے یہ وعدہ کیا تھا کہ مصر اگر جنگ میں انگریزوں کا ساتھ دے گا تو جنگ کے بعد برطانیہ مصر کو آزاد کر دے گا چنانچہ جنگ ختم ہوتے ہی الاخوان نے ملک کے اندر ایک زوردار عوامی تحریک برپا کر دی اور انگریزوں سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے وعدے کو پورا کریں۔ دوسری طرف انھوں نے ان نئے حالات کا سامنا کرنے کے لیے اپنی تنظیمِ نو شروع کر دی۔ ۸ ستمبر ۱۹۴۵ء کو انھوں نے الاخوان کی جنرل کونسل کا اجلاس منعقد کیا۔ اور اپنے دستور میں نئے تقاضوں کے تحت ضروری تبدیلیاں کیں۔ نیز نئی تجارتی فرمیں کھولیں جن سے ان کی آمدنی میں بھی اضافہ ہوا اور مزدوروں کے اندر بھی اثر و نفوذ بڑھا۔ انھوں نے "الاخوان" کے نام سے اپنا ایک روزنامہ بھی جاری کر لیا جس کا پہلا شمارہ ۵ مئی ۱۹۴۶ء کو نکلا۔ رضاکار تنظیمیں قائم کیں اور فوجی تربیت کے لیے جگہ جگہ عوامی مراکز کھول دیئے۔ اور مصر اور دوسرے عرب ممالک کے اندر انھوں نے عوام کو نہایت مستحکم انداز میں منظم کیا۔ جماعت کے اندر تقسیم کار کا طریقہ اختیار کیا گیا۔ الاخوان نے اپنے مرشد حسن البنّا سے از سرِ نو تجدید بیعت کی اور انھیں تاحیات اپنا سربراہ منتخب کر لیا۔

تحریک کا عروج

اس دور میں تحریک جس عروج کو پہنچی اس کے متعلق محمد شوقی زکی لکھتے ہیں:

> "صرف مصر کے اندر الاخوان کے فعّال کارکنوں کی تعداد ۵ لاکھ تک پہنچ گئی۔ رہے حامی اور مددگار اور متفق تو ان کی تعداد فعال کارکنوں سے کئی گُنا زیادہ تھی۔ اسی طرح مصر کے اندر الاخوان کی شاخوں کی تعداد ۲ ہزار اور سوڈان کے اندر ۵۰ ہوگئی۔ دوسرے عرب ممالک میں بھی متعدد شاخیں کھولی گئیں۔"[1]

---

[1] الاخوان المسلمون والمجتمع المصری - ص ۲۱

جنگ فلسطین میں اخوان کا حصّہ اور اس کا ثمرہ

نقراشی پاشا کے دَور میں حسن البنّا نے انگریزوں کے خلاف اعلان جہاد کر دیا اور پورے ملک کے اندر آزادی کی آگ بھڑکا دی۔ نقراشی پاشا کی حکومت اس تحریک کا سامنا نہ کر سکی اور مستعفی ہوگئی۔ اسماعیل صدقی پاشا نے حکومت سنبھال لی۔ اس نے بھی الاخوان پر شدید تروار کیا۔ اور ایک ہنگامۂ دار و گیر برپا ہوگیا۔ اسماعیل صدقی بھی مستعفی ہوگیا۔ اور نقراشی پاشا نے دوبارہ ۱۰ر دسمبر ۱۹۴۶ء کو وزارت کی تشکیل کی۔ ایک طرف الاخوان کی تحریک جہادِ آزادی تھی اور دوسری طرف نقراشی پاشا اور انگریز تھے۔ دونوں فریقوں میں کش مکش ہوتی رہی۔ اس کشمکش میں مسئلۂ فلسطین نے مزید تلخی پیدا کر دی۔ اخوان مسئلہ فلسطین میں پیش پیش تھے۔ ایک طرف یہ مسئلہ ان کے نفوذ و اثر کی کسوٹی بن چکا تھا۔ اور دوسری طرف مصر اور بیرونِ مصر ان کی محبوبیت اور سرخروئی کا موجب بن گیا۔ ۱۲ر دسمبر ۱۹۴۷ء کو الاخوان نے زبردست احتجاجی جلوس نکالا۔ یہ جلوس ازہر سے نکلا۔ اس کی قیادت خود امام حسن البنّا نے کی۔ وہ موٹر میں سوار تھے اور لاؤڈ اسپیکر سے ہدایات جاری کر رہے تھے۔ ۶ر مئی ۱۹۴۸ء کو الاخوان کی مجلس اساسی کا اجلاس ہوا۔ اس میں حکومتِ مصر اور تمام عرب حکومتوں سے مطالبہ کیا گیا کہ اسرائیل کے خلاف اعلان جہاد کیا جائے اور فلسطین کو بچانے کے لیے تمام ممکن تدابیر اختیار کی جائیں۔

الاخوان نے دوسروں کا انتظار کیے بغیر اپنے ہزاروں رضا کار مجاہدین فلسطین میں بھیج دیئے۔ انھوں نے اس جنگ میں جواں مردی اور شجاعت کے ایسے حیرت انگیز کارنامے دکھائے کہ انگریز اور یہودی دونوں کے اوسان خطا ہو گئے۔ اس صورت حال سے نقراشی پاشا شدید پریشان ہوا۔ فاروق الگ ان "ملاّؤں" کے بڑھتے ہوئے اثرات سے پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ چند غیر ملکی سفارت خانوں نے فاید (برطانوی فوج کے مصری مستقر) میں کانفرنس کی اور بالاتفاق نقراشی پاشا سے الاخوان کو خلافِ قانون قرار دینے کا مطالبہ کیا۔

الاخوان اُس وقت یہودیوں کے خلاف میدانِ جنگ میں اُترے ہوئے تھے حسن البنّا مسلسل رضا کاروں کو منظم کر کے جہاد کے لیے بھیج رہے تھے۔ مگر نقراشی پاشا نے اپنے آقاؤں کی خوشنودی کی خاطر ۸ دسمبر ۱۹۴۸ء کو ہنگامی قوانین کی دفعہ نمبر ۶۳ کے موجب الاخوان کو خلافِ قانون قرار دے دیا۔

اس اقدام کے بعد پورے مصر میں الاخوان پر ظلم کا بازار گرم ہو گیا۔ جماعت کے تمام مراکز اور ادارے ضبط کر لیے گئے۔ ہزارہا پڑھے لکھے نوجوان جیلوں میں بند کر دیئے گئے۔ اور ان پر طرح طرح کے مظالم توڑے گئے۔ جنھیں سُن کر بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں خود نقراشی پاشا بھی انہی ہنگاموں کے دوران ایک نوجوان کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ اس کے بعد ابراہیم عبدالہادی پاشا وزارت عظمیٰ کی گدّی پر بیٹھا۔ اس نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی یہ ابراہیم عبدالہادی پاشا کا دورِ وزارت تھا کہ ۱۲ فروری ۱۹۴۹ء کی شام کو حسن البنّا ــــــ ایک پیکرِ صدق و صفا، کوہِ عزم و وفا، مشعل بردارِ دینِ مبین اور داعی ایمان و یقین کو شبان المسلمین کے مرکز کے سامنے سرِ بازار شہید کر دیا گیا۔ اس کے بعد انگریزوں اور یہودیوں اور اسلام دشمن طاقتوں نے گھی کے چراغ جلائے۔

حسن البنّا کے کام کا خلاصہ

حسن البنّا ۱۹۰۶ء میں مصر کی ایک دُور افتادہ بستی میں ایک غریب دیہاتی گھرانے کے اندر پیدا ہوئے اور ۱۹۴۹ء میں وہ قاہرہ کی سب سے بڑی سڑک پر شہید کر دیئے گئے۔ انھیں شہید کرنے کے لیے انگریز، یہودی، مصر کی کٹھ پتلی حکومت اور شاہ فاروق سب طاقتوں کو مل جل کر سازش تیار کرنا پڑی۔ ان کی کل عمر ۴۳ سال ہوئی ہے۔ الاخوان کی تاسیس ۱۹۲۸ء میں عمل میں آئی۔ گویا ۲۰ سال کے اندر اس مردِ قلندر نے ایک ایسی تحریک ملک کے اندر کھڑی کر دی جس نے تاریخ کا دھارا بدل کر رکھ دیا۔ وہ قوم جو "جاہلیت" کے نرغے میں جا چکی تھی اسے دوبارہ اسلام کی طرف موڑ دیا۔ وہ نوجوان جو الحاد وا باحیت

میں ڈوب رہا تھا اور وطنیت، قومیت اور دوسرے جاہلی افکار کا علم بردار بن چکا تھا اس تحریک کی بدولت اس کی ایسی کایا پلٹی کہ اب اس کی زبانوں پر یہ نعرہ تھا "اللہ غایتنا" (اللہ کی خوشنودی ہمارا اصل مدعا ہے) الرسول زعیمنا (رسول ہمارا قائد ہے) القرآن دستورنا (قرآن ہمارا دستور ہے) الجہاد سبیلنا (جہاد ہمارا راستہ ہے) الموت فی سبیل اللہ اسمیٰ امانینا (اللہ کی راہ میں جان دے دینا ہماری بلند ترین آرزو ہے)۔

صرف ۲۰ سال کے اندر ایسا ذہنی و فکری انقلاب برپا کر دینا اس ہستی کا کام ہو سکتا ہے جسے اللہ تعالےٰ نے غیر معمولی صلاحیتیں دے کر دنیا میں بھیجا ہو۔

عام اخلاق واوصاف

اب ہم ذیل میں امام حسن البنّا کے اخلاق و عادات کا مختصر جائزہ لیتے ہیں جنہوں نے ایک پوری نسل کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔

ذکر و عبادت

عبدالرحمٰن البنّا حسن البنّا کے چھوٹے بھائی تھے۔ دونوں کی عمر میں صرف ۲ سال کا فرق تھا۔ تعلیم و تربیت اور دعوت و تبلیغ میں دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مل کر رہنے کا طویل موقع ملا۔ عبدالرحمٰن البنّا لکھتے ہیں کہ حسن البنّا کو بچپن ہی میں نماز، روزے اور ذکر اللہ کا بے حد شوق تھا۔ ہم دونوں "چھوٹی مسجد" (جو مدرسہ اعدادیہ کے جوار میں تھی) عشاء کے وقت چلے جاتے اور نماز عشاء کے بعد حصافی اخوان کی مجلس ذکر میں شریک ہو جاتے۔ دیر تک ہم اس مجلس میں بیٹھے رہتے اور اہلِ ذکر کے ساتھ ذکر الٰہی میں مشغول رہتے۔ اس وقت مسجد میں اہلِ ذکر کے سوا اور کوئی انسان موجود نہ ہوتا۔ رات پر پردۂ سکوت چھا جاتا۔ صرف دعاؤں اور مناجاتوں کی دھیمی دھیمی صدائیں کانوں میں پڑتیں۔ حسن البنّا کی زبان پر یہ اشعار بار بار جاری رہتے:۔

اللہ قل وذر الوجود وماحوی

ان کنت مرتادا بلوغ کمال

فالکل دون اللہ ان حققتہ

عدم علی التفصیل والاجمال

ترجمہ: ایک اللہ کو پکار، اور باقی تمام موجودات کو ترک کر اگر تجھے درجہ کمال تک پہنچنے کا شوق ہے۔

اگر تو تحقیق کرے گا تو معلوم ہو جائے گا کہ اللہ کے سوا ہر چیز نیست ہے، تفصیلاً بھی اور اجمالاً بھی۔

فقر و درویشی سے محبّت

حسن البنّا کو فقیروں اور درویشوں اور نیک سیرت انسانوں سے بڑی محبت تھی۔ بچپن ہی میں وہ ایسے انسانوں کی صحبت میں جایا کرتے تھے۔ اپنے اس شوق کو وہ اس شعر کے ذریعے اپنے دوستوں کے سامنے بیان کیا کرتے تھے:

مالذة العیش الاصحبة الفقرا

ھم السلاطین والسّادات والامرا

" زندگی کی لذت صرف فقیروں کی صحبت میں حاصل ہوتی ہے۔ یہی بادشاہ ہیں یہی سردار ہیں۔ یہی امراء ہیں۔"

علامہ اقبال نے اسی مضمون کو یوں بیان کیا ہے:

تمنّا دردِ دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی

نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

جود و غنا سے لبریز طبیعت

ان کی طبیعت میں انتہائی غنا تھا۔ اخوان کی انتظامیہ کے رکن امین اسمٰعیل جو

سفروں اور دوروں میں مرحوم کے ساتھ رہتے تھے۔ وہ اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں :

" ان کی شانِ استغنا رکا یہ حال تھا کہ ایک مرتبہ مجھے اپنے ساتھ ایک درزی کے پاس لے گئے، جسے انھوں نے اپنی عبا سلنے کے لیے دے رکھی تھی۔ ہم دونوں ایک تنگ و تاریک گلی میں داخل ہوئے۔ یہ المغربلین محلہ تھا۔ درزی ہمیں دیکھتے ہی اُٹھا اور روایاتی طریقے سے خیر مقدم کا تکلف کیے بغیر اس نے عبا حاضر کردی اور تین مصری پونڈ اُجرت طلب کی۔ امام نے اسے پانچ پونڈ دیئے اور عبا لے کر چل دیئے۔ میں متردد تھا کہ درزی سے زائد رقم واپس لوں۔ مگر امام نے مجھے کھینچ لیا۔ اور میں سمجھ گیا کہ وہ یہ رقم واپس نہیں لینا چاہتے۔ آگے چل کر ایک بد حال گدا گر نظر آیا۔ امام نے مجھے ارشاد فرمایا کہ میں اسے ایک ریال پیش کردوں۔ مجھے معلوم ہوا کہ امام کے پاس صرف وہی پانچ پونڈ تھے جو انھوں نے درزی کو دیدیئے اور اب وہ خالی ہاتھ تھے۔ ان کا یہ جود و غنا تادم آخر ان کے ساتھ رہا۔"[1] الامام الشہید حسن البنّا ص ۱۰۱

دنیا پرستی سے نفرت اور کردار و ضمیر کی پختگی

ایک نامور اخوانی بہی الخولی لکھتے ہیں :

" ۱۹۳۲ء کی بات ہے کہ الاخوان کی تاسیس کو چند سال گزرے تھے کہ امام حسن البنّا کو ایک اعلیٰ سرکاری منصب پیش کیا گیا۔ مقصد یہ تھا کہ انھیں دعوت الی اللہ کے کام سے ہٹا دیا جائے۔ مگر امام نے منصب پیش کرنے والے کو ایسا مؤثر جواب دیا کہ وہ شرم کے مارے زمین میں گڑا جا رہا تھا۔ اگر امام حسن البنّا اس کی پیش کش قبول کر لیتے تو آج ان کی اولاد اس حال میں ہوتی کہ دوسرے دیکھ کر حسد کرتے۔ مگر حسن البنّا نے دنیا پرستی کا راستہ ٹھکرا دیا۔"

" دوسری جنگِ عظیم کا آغاز ہی ہوا تھا کہ انگریزوں نے بھی حسن البنّا کو ہزاروں

پونڈ کی پیشکش کی۔ بلکہ یہاں تک کہہ دیا کہ انگریزوں کے خزانے حسن البنّا کے ایک اشارے پر قربان کر دیئے جائیں گے۔ لیکن اس درویش صفت انسان نے بڑی درشتی اور تعلّی کے ساتھ انگریزوں کے فرستادہ کو جو ان کے ضمیر و ایمان کو خریدنے کے لیے آیا تھا گھر سے نکال دیا۔ انگریزوں نے خائب و خاسر ہو کر یہ سمجھ لیا کہ سونے اور چاندی سے اس شخص کا علاج نہیں کیا جا سکتا۔"

"الاخوان المسلمون نے ملک کے اندر کثیر تعداد میں تجارتی کمپنیاں قائم کیں۔ امام البنّا ان تمام کمپنیوں کی مجالس انتظامیہ کے رکن تھے۔ اور ان کمپنیوں کے معاملات کو درست رکھنے پر انھیں سخت محنت کرنا پڑتی تھی۔ الاخوان نے انھیں اس محنت کا بارہا معاوضہ پیش کیا بلکہ کوشش کی کہ ماہانہ وظیفہ جاری کر دیں۔ لیکن انھوں نے کوئی چیز قبول نہ کی اور یہی کہتے رہے کہ "میں انسانوں سے نہیں اللہ سے اجر طلب کروں گا۔" اقتصاد و تجارت کی دنیا میں یہ ایک نرالی مثال ہے۔"[1]

"دشمنوں کی طرف سے امام البنّا پر طرح طرح کے الزامات تراشے گئے۔ انھیں کہا گیا کہ یہ شخص کرائے کا ایجنٹ ہے۔ یہ رشوت خور ہے۔ اس نے ہزارہا پونڈ کی بیرونی مدد حاصل کی ہے۔ اس کے پاس کئی کئی کاریں ہیں۔ اس نے لاتعداد کمپنیوں میں اپنے حصص مقرر کر رکھے ہیں۔ یہ سب کچھ کہا گیا۔ مگر جب الزام تراشی کرنے والوں نے اسے سرِعام شہید کروا دیا تب دنیا کو پتہ چلا کہ وہ اس قدر قلاش انسان تھا کہ اس کے پاس قاہرہ میں اپنا ذاتی مکان بھی نہیں تھا۔ بلکہ اُس نے ایک قدیم طرز کے محلے میں پرانا اور بوسیدہ مکان کرائے پر لے رکھا تھا۔ جس کا وہ ایک پونڈ ۸۰ قرش ماہانہ کرایہ ادا کرتا تھا، اور اس کی شہادت کے بعد اس کے بچے ذرائع آمدنی سے کلیۃً محروم ہو گئے۔"[2]

---

[1] الامام الشہید۔ صہ ۱۲۲ [2] الامام الشہید حسن البنّا ص ۷۶، ۷۷

اعلیٰ خصائل کا پیکر

مفتی اعظم فلسطین الحاج امین الحسینی بیان کرتے ہیں :

" جب میں ۱۹۴۶ء کو یورپ سے مصر لوٹا تو میں نے پہلی مرتبہ حسن البنّا کو بچشم سر دیکھا۔ میں نے ان کی گفتگوئیں سنیں۔ مجھے ان کے اندر صاف وشفاف روح نظر آئی۔ بعد میں ہمارے تعلقات خوب مستحکم ہوگئے۔ اور مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ اس عظیم انسان کو اللہ تعالیٰ نے بڑی نادر خوبیاں، اعلیٰ خصائل اور کریمانہ صفات سے نواز رکھا ہے۔ ان کی نمایاں صفات یہ تھیں :

گہرا اخلاص، عقل سلیم اور عزم قوی۔ ان تینوں خوبیوں کو ان کے مضبوط عقیدے اور محمدی اخلاق نے مزیّن کر رکھا تھا۔ وہ بڑے بلند ہمت اور ایثار پیشہ انسان تھے۔ قربانی ثابت قدمی، سادگی وتقشف اور مادّی منفعت سے گریز اور پاک وشفاف سیرت سے بہرہ ور تھے۔ اور یہی وہ اوصاف تھے جن کی بنا پر وہ قیادت کے منصب عظیم پر فائز ہوگئے۔ میں حلمیہ میں ان کے مکان پر گیا۔ گھر کا ساز و سامان بالکل سادہ اور گھر کی ہر چیز تقشف وقناعت کی غماز ہے"

خاکسارانہ مزاج

" مجھے یاد ہے کہ ایک دعوت میں میری اُن کے ساتھ ملاقات ہوئی۔ اس دعوت کا اہتمام عرب لیگ کے سابق سکریٹری جنرل عبدالرحمٰن عزام نے مرحوم قائد اعظم محمد علی جناح کے اعزاز میں کیا تھا۔ قائد اعظم کے ساتھ لیاقت علی خاں مرحوم بھی تھے۔ صاحب دعوت کے گھر میں سب سے پہلے پہنچنے والوں میں مَیں اور مرحوم شہید حسن البنّا تھے۔ ہم دونوں ان پاکستانی قائدین کے ساتھ دیر تک محوِ گفتگو رہے۔ اس کے بعد دیگر مدعوئین بھی یکے بعد دیگرے پہنچنا شروع ہوگئے۔ میں نے دیکھا کہ جب کوئی نیا مہمان آتا تو حسن البنّا اپنی نشست اس کے لیے چھوڑ کر پیچھے ہو جاتے۔ یہاں تک کہ وہ پیچھے ہوتے ہوتے دروازے کے پاس والی

نشست تک چلے گئے۔ جب مدعوئین کی تعداد پوری ہوگئی تو عبدالرحمٰن عزام نے حاضرین کو کھانے کے کمرے میں چلنے کی درخواست کی۔ شہید مرحوم اپنی آخری نشست کی وجہ سے کھانے کے کمرے سے قریب تر تھے۔ عزام نے انھیں کھانے کے کمرے میں تشریف لے جانے کے لیے کہا لیکن وہ دوسرے مہمانوں کو ترجیح دیتے رہے اور خود پیچھے ہٹتے رہے۔ چنانچہ سب سے آخر میں جو شخص کھانے کے کمرے میں داخل ہوا وہ حسن البنّا تھے۔ میں یہ منظر دیکھتا رہا، مجھے یقین ہوگیا کہ یہ شخص انتہائی متواضع اور صاحبِ اوصافِ کریمانہ ہے۔ علاوہ ازیں موصوف معاملات میں اور مشکلات کو حل کرنے میں بڑی غیر معمولی لچک دکھاتے ہیں۔ میں جب انھیں یاد کرتا ہوں تو بے ساختہ یہ شعر میری زبان پر آجاتا ہے:

هيهات ان ياتى الزمان بمثله

ان الزمان بمثله لبخيل[1]

(کاش زمانہ اس جیسی شخصیت پھر ہمیں فراہم کرتا لیکن یہ زمانہ ایسے انسان پیدا کرنے میں بڑے بخل سے کام لیتا ہے)"۔

مرحوم شہید کی عام زندگی اور طریقہ گفتگو کا ذکر کرتے ہوئے عبدالرحمٰن البنّا لکھتے ہیں:۔

"اگر مجلس زمینی ہوتی تو مرحوم شہید بوریے پر ہی بیٹھ جاتے۔ اور آخری نشستوں میں بیٹھنا پسند کرتے۔ جہاں انھیں اور کوئی علامت پہچاننے کی اس کے سوا نہ ہوتی کہ ان کے چہرے سے علم کی تابانی اور روح کی نورانیت ٹپک رہی ہوتی۔ بالعموم وہ معمولی قسم کا جلباب (لمبا کرتہ جسے عام طور پر عرب پہنتے ہیں) جو انتہائی سستے کپڑے کا ہوتا تھا زیب تن کرتے۔ اوپر عبا پہن لیتے۔ سر پر عمامہ باندھ لیتے جس کے نیچے ایک روشن جبیں اور ذہانت

---

[1] الامام الشہید ص ۱۲۸، ۱۲۹

سے لبریز چہرہ دمک رہا ہوتا تھا۔ گفتگو میں وہ تصنّع سے کام نہ لیتے تھے۔ بلکہ نہایت سلیس اور رواں زبان اختیار کرتے۔ بات بات پر وہ قرآن کریم کی آیات سے استدلال کرتے۔ قرآن کریم انھیں بڑی پختگی کے ساتھ حفظ تھا اور اس کی تلاوت بھی وہ نہایت لطف و لذت میں ڈوب کر کرتے۔"

معیارِ پسند و ناپسند

بہی الخولی لکھتے ہیں:

"حسن البنا کی درویشی کا یہ حال تھا کہ انھیں جو کچھ کھانے کو مل جاتا کھا لیتے۔ پہننے کے لیے جو میسر آتا پہن لیتے۔ مکان بھی انھوں نے ایسا لے رکھا تھا جو قلت و کفی کی تعریف میں آتا تھا۔ ان کی زندگی کفاف پر تھی۔ انھیں اس بات کی کبھی فکر نہ لاحق ہوئی کہ وہ اپنے بچوں کے لیے کیا چھوڑ رہے ہیں۔ ان کو جس چیز سے آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کا چین نصیب ہوتا وہ صرف یہ تھی کہ وہ لوگوں کے سامنے کلمۂ حق کہہ دیں۔"

محبّت کا سفیر

وہ ایک وسیع الظرف انسان تھے۔ محبّت و مؤدت کا پرچار ان کا مشن تھا۔ ایک مرتبہ وہ بالائی مصر کے دورے پر گئے۔ اور وہاں ان کے پاس عیسائی پادریوں کی ایک جماعت، عیسائی پیروکاروں کی ایک بڑی تعداد کے ہمراہ ملنے کے لیے آئی۔ چنانچہ امام شہید نے ان کے ساتھ جو گفتگو کی وہ تمام تر اُن قرآنی آیات پر مبنی تھی جن پر حضرت عیسیٰ اور مریم علیہما السلام کا ذکر آیا ہے۔ انھوں نے ان آیات کی تلاوت کی اور پھر ان کی تفسیر بیان کی۔ مسیحی یہ محسوس کرنے لگے کہ یہ اجتماع گویا خاص طور پر انھیں کے لیے منعقد کیا گیا ہے۔ کیونکہ اس میں مسلمانوں کے کسی مسئلے کو نہیں چھیڑا گیا۔ اس رویّے کا عیسائیوں پر گہرا اثر ہوا۔ خاص طور پر اس لیے کہ عام مسلمان علماء ہمیشہ قبطیوں کے خلاف متعصبانہ رویہ اختیار کرتے رہتے تھے۔

رفقائے تحریک کے ساتھ برتاؤ کی نوعیت

دفتر کے رفقاء کے ساتھ ان کا طرز ایسا تھا کہ ان کی ہر بات ساتھیوں کے دل میں محبت کی ایک نئی لہر پیدا کر دیتی۔ ابن اسماعیل ان کے رفیق حضر و سفر بیان کرتے ہیں کہ :۔

"دفتر میں وہ میرے کام پر نظر ثانی کرتے اور بڑی اٹھکھیلیوں کے ساتھ میری غلطیوں کی تصحیح کر دیتے۔ مجھے یہ محسوس نہ ہوتا کہ میں نے کوئی غلطی کی ہے۔ بلکہ میرا احساس صرف یہ ہوتا کہ جو کچھ وہ فرمارہے ہیں وہی درست ہے۔ اور میرا کام مجھے واپس کرتے ہوئے بڑی شفقت کے ساتھ کہتے: آپ میری تصحیح پر نظر ثانی کرلیں اور اگر کوئی حذف و اضافہ کرنا چاہیں تو کرلیں۔ لیکن میں حلفاً کہتا ہوں کہ میں نے ان کی اصلاح میں کبھی حذف و اضافہ کو پسند نہ کیا۔"[1]

"میرے ہاں اگر کوئی پیدائش ہوتی تو میرے گھر تشریف لاتے، بیمار ہو جاتا تو میری تیمارداری کرتے۔ کبھی مجھے کوئی تکلیف پیش آجاتی تو گھر پر آکر مجھے دلاسا دیتے۔ حالانکہ میں دفتر کا ایک معمولی کلرک تھا۔ اور وہ بڑے مشغول انسان تھے۔ شب و روز میں صرف چند منٹ سوتے، اور دونوں وقت چند لقموں پر گزارا کرتے۔"

"دوروں میں جماعت کے رفقاء سے جب ملتے تو ایک ایک کو سلام کرتے۔ اور نام لے لے کر ان کے بچوں کی خیریت دریافت کرتے۔ اور ان کی تعلیم کی حالت پوچھتے۔ بلکہ میں نے تو یہ بھی دیکھا کہ وہ فلاحین کے ساتھ تخلیہ میں ملتے، اور ان کے جانوروں تک کی صورتِ حال دریافت کرتے۔ اس معاملے میں ان کا حافظہ بے پناہ مضبوط تھا۔ اور چھوٹی چھوٹی باتیں بھی انھیں یاد رہتی تھیں۔"

---

[1] الامام الشہید۔ ص ۱۰۰

" میں مرحوم سے بڑا مانوس تھا۔ ایک مرتبہ میں نے ان سے عرض کیا: " استاد محترم! اللہ تعالےٰ نے ابھی مجھے معاف نہیں فرمایا، اور وہ مجھ سے خوش نہیں ہوا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ میں رات بھر کوشش کرتا رہا ہوں کہ قرآن کریم کا ایک صفحہ حفظ کرلوں۔ مگر کامیاب نہیں ہوسکا۔ یعنی میں توفیقِ خداوندی سے ابھی تک محروم ہوں " مرحوم نے مجھے حیرت و قلق میں مبتلا پاکر تھپکی دی اور اپنے ہاتھ سے میرے آنسو پونچھے۔ اور فرمایا: " جب کوئی بندہ اللہ کی رضا میں آنسو بہاتا ہے تو اللہ تعالےٰ اسے معافی سے محروم نہیں کرتا۔ اور جہاں تک حفظ قرآن کا تعلق ہے تو اس بارے میں آپ پریشان نہ ہوں۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو بھی پورا قرآن حفظ نہ تھا۔ ان کا جواب سُن کر مجھے انتہائی روحانی تسکین حاصل ہوئی "

" ایک بار مجھ سے ایک غلطی سرزد ہوگئی۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی غلطی کا اعتراف کرنے لگا۔ مگر انھوں نے کوئی دوسری بات چھیڑ دی جس کا اس موضوع سے کوئی تعلق نہ تھا۔ میں بار بار اپنے موضوع کی طرف رجوع کرتا۔ مگر وہ مجھے کوئی جواب نہ دیتے۔ ان کے چہرے پر بھی میں نے ملال کا کوئی اثر نہ دیکھا۔ میں نے ان سے پھر تنہائی میں ملنا چھوڑ دیا۔ ایک روز یکایک انھوں نے مجھے اپنے گھر طلب فرمایا۔ اور مجھے دیکھتے ہی میرا ہاتھ پکڑ لیا اور فرمایا: " آیئے ہم بیعت کی تجدید کرلیں۔ چنانچہ میں نے اُن کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر خدا اور رسولؐ کی وفاداری کا از سرِ نو عہد کیا۔ اس کے بعد وہ مجھے فرمانے لگے: " میں نے تمہیں مکتب الارشاد (انتظامی کونسل) کا رکن نامزد کر دیا ہے"[1]

قیادت کی شان

" جب فلسطین کے مسئلے پر اخوان نے قاہرہ میں جلوس نکالا تو اس جلوس کی قیادت خود

[1] الامام الشہید، ص ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱۔

مرحوم شہید نے کی۔ ہم لوگ جب "العتبۃ الخضراء" کے میدان میں پہنچے تو پولیس نے مظاہرین پر حملہ کر دیا۔ امام شہید آگے بڑھے اور پولیس والوں کو فائرنگ کرنے سے روکا۔ جب انھوں نے دیکھا کہ مظاہرین پر فائر ہو رہا ہے تو مظاہرین کو بچانے کے لیے فوراً اپنے ہاتھ آگے کر دیئے۔ اس سے ان کے دونوں ہاتھ بُری طرح خون آلود ہو گئے۔ مگر وہ ہمیں دلاسا دیتے رہے کہ معمولی بات ہے ہم لوگ پریشان نہ ہوں۔ لیکن ہم لوگ یہ محسوس کرتے تھے کہ یہ گولی حسن البنّا کے ہاتھوں کو نہیں لگی بلکہ ہمارے ہاتھ مجروح ہوئے ہیں۔"

"الحلیمۃ کے میدان میں موصوف ہر بدھ کو درس دیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک نوجوان نے بڑا دلچسپ سوال کیا۔ مرحوم شہید سوال پر بہت مسکراتے رہے۔ اور بڑی لطافت کے ساتھ اُسے جواب سے نوازا۔ سوال یہ تھا کہ "کیا محبت کرنا حلال ہے یا حرام؟" آپ نے اُسے جواب دیا: "حلال محبّت حلال ہے اور حرام محبّت حرام ہے۔"

"دار الاخوان کے معاونین سے انھیں بڑی محبت تھی۔ جب لوگ کھانے کے لیے گھروں کو چلے جاتے تو وہ دفتر کے چپراسی کے ساتھ بیٹھ کر وہیں کھانا کھا لیتے۔"[1]

دعوت سے شغف

عبدالرحمٰن البنّا کا بیان ہے:

"حسن البنّا پر دعوت کا فریضہ ایک بخار بن کر سوار تھا۔ ہم ان کی مجلس میں بیٹھتے۔ اس بخار کے اثرات ہم تک بھی پہنچ جاتے، اور ہم بھی دنیا و مافیہا سے غائب

---

[1] الامام الشہید، ص ۷۱

ہوجاتے۔ وہ لوگوں کو اس انداز میں پکارتے: لوگو! ہماری طرف آؤ، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں پاسکا وہ ہمیں آملے۔ ہم اسی ذات پاک کے قافلے میں شامل ہیں جو آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری نہیں دے سکا وہ ہماری جانب رُخ کرے ہم مدّتوں سے آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے کے بھکاری بن کر کھڑے ہوئے ہیں۔ جس نے آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک نہیں سُنی وہ ہم سے یہ سُن لے کہ:

ان النّبی لحیّ فی ضمائرنا

علی الزمان منہا ویستمع

ففی قلوب یقوم الدّین یحرسہا

وفی قلوب یقوم الحب والولع

(آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ضمیروں کے اندر ہمیشہ سے زندہ ہیں اور وہ سب کچھ سُن رہے ہیں۔ وہ ایسے دلوں کے اندر پائے جاتے ہیں جو دین کی رکھوالی کرتے ہیں۔ وہ ایسے دلوں کے اندر موجود ہیں جو ان کی محبّت وعقیدت سے لبریز ہیں)۔"

"وہ جب کبھی تبلیغی دورے پر جاتے تو سیدھے مسجد میں جا اُترتے ــــــ رمضان المبارک میں وہ اکثر دورے پر ہوتے اور روزے کی حالت میں مسجد کے اندر ٹھہر جاتے اور پانی اور کھجور سے روزہ افطار کرلیتے۔ جب لوگ اپنے گھروں سے کھا پی کر نماز کے لیے مسجد میں آتے تو اس نووارد کو دیکھتے۔ یہ نووارد نماز کے بعد اپنے سادہ لباس میں ملبوس کھڑا ہوجاتا اور نہایت مؤثر وعظ شروع کر دیتا۔ اور انھیں بعد میں معلوم ہوتا کہ یہ شیخ حسن البنّا تھا۔"[1]

---

[1] الامام الشہید۔ ص ۱۷۔

مختلف مذہبی فرقوں سے حکیمانہ رویّہ

حسن البنّا جب اسماعیلیہ گئے تو وہاں دیکھا کہ اسماعیلیہ کے باشندے مذہبی جھگڑوں میں اُلجھے ہوئے ہیں۔ اور سلفی کیمپ اور صوفی کیمپ کے نام سے دو مختلف گروہ وجود میں آچکے ہیں۔ جن میں تصادم انتہا کو پہنچ چکا ہے۔ اور ایک فریق کے حامی دوسرے فریق کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے۔ ان کشیدہ حالات میں حسن البنّا نے وہاں دعوت کا کام شروع کیا اور مسجدوں کے بجائے قہوہ خانوں کو اپنی مہم کے لیے منتخب کیا اور پھر انھوں نے اس اختلافی فضا میں کام کے جو اصول اختیار کیے وہ یہ تھے:

۱۔ امّت کے اتحاد کو ہر قیمت پر برقرار رکھا جائے۔

۲۔ اصولوں پر سب گروہ اتفاق کریں۔

۳۔ دوسرے کے بارے میں حسن ظن سے کام لیا جائے۔ اور غلطی اپنی ذات کی طرف منسوب کرلی جائے اور اس بارے میں امام شافعیؒ کے اس قول کو بنیاد بنایا جائے کہ:

"میں نے جس شخص سے بھی بحث و مجادلہ کیا تو میری آرزو رہی کہ اللہ تعالےٰ میرے بجائے اس کی زبان سے حق کو واضح کرے۔"

۴۔ اختلاف و نزاع میں ادب کا پہلو اختیار کیا جائے۔

۵۔ جدل و مکابرت سے پرہیز کیا جائے۔

۶۔ یہ خیال رکھا جائے کہ امرِ صواب ایک ہی نہیں مختلف ہوسکتے ہیں۔

۷۔ متفق علیہ پر تعاون ہو اور مختلف فیہ امور میں ایک دوسرے کو معذور سمجھا جائے۔

۸۔ مشترک دشمن کے سامنے متحد رہا جائے۔

۹۔ آفاقِ عمل کو وسعت دی جائے۔

۱۰۔ گمراہوں کے حق میں افسوس کا اظہار کیا جائے، ان پر تشنیع نہ کی جائے۔

مومنانہ بصیرت

اس ذات کو اللہ تعالیٰ نے مومنانہ بصیرت کا بہرہ وافر عطا کر رکھا تھا۔ انہوں نے دوسری جنگ عظیم سے پیشتر ہی اپنے ساتھیوں کو بتا دیا تھا کہ وہ جس دعوت کو لے کر اُٹھے ہوئے ہیں اس کا راستہ کہاں کہاں سے ہو کر گزرتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ابھی اخوان آزمائشوں میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ اور ان کی تحریک اپنا ابتدائی سفر طے کر رہی تھی۔ انھوں نے اسی زمانے میں اپنے ساتھیوں کو فرما دیا تھا:

" ایہا الاخوان! میں تمہیں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ تمہاری دعوت سے ابھی اکثر لوگ ناواقف ہیں، اور جس روز یہ اس حقیقت سے آگاہ ہو جائیں گے اور اس کے اغراض و مقاصد کو سمجھ جائیں گے اس روز تمہیں ان کی طرف سے شدید مخالفت کا بلکہ تند و تیز عداوت کا سامنا ہوگا۔ اس روز تم اپنے سامنے طرح طرح کی تکالیف کا مشاہدہ کروگے۔ اور بے شمار رکاوٹیں تمہارے رستے میں حائل ہو جائیں گی۔ اس وقت ہی تم صحیح معنوں میں دعوت حق کے علم برداروں میں داخل ہو گے۔ آج تو تم گمنام ہو، لیکن تمہیں دعوت کے لیے برابر راستہ ہموار کرتے رہنا چاہیے۔ اور یہ دعوت جس جہاد و قربانی کی طالب ہے اس کے لیے تیاری کرنی چاہیے۔ عوام الناس کو اسلام سے ناواقفیت بھی تمہارے راستے کا روڑا بنے گی۔ سرکاری علماء تمہارے اسلامی تصور پر حیرت کا اظہار کریں گے۔ راہِ حق میں تمہارا جہاد ناپسند کیا جائے گا۔ حکام اور زعماء، اور اصحاب جاہ و اقتدار تم سے جلیں گے۔ تمام حکومتیں تمہارے آگے دیوار بن کر کھڑی ہو جائیں گی۔ ہر حکومت تمہاری سرگرمیوں کو محدود کرنے کی کوشش کرے گی۔ اور تمہارے راستے میں کانٹے بچھائے گی۔ لٹیرے تمہاری مخالفت کے لیے اور تمہاری شمع دعوت کو گل کرنے کے لیے ہر ہتھکنڈا استعمال کریں گے۔ اور کمزور و بزدل حکومتوں کو اس غرض کے لیے استعمال کریں گے۔ گھٹیا اخلاق اور ہر وقت سوال کے لیے دراز رہنے والے ہاتھ تمہارے خلاف استعمال ہوں گے۔

ایک گروہ تمہاری دعوت پر شکوک و شبہات کی گرد اڑائے گا۔ افترا پردازیاں کرے گا۔ اور کوشش کرے گا کہ ہر عیب تم پر چسپاں کیا جائے اور اس دعوت کو بڑی سے بُری شکل میں لوگوں کے سامنے لایا جائے۔ ان کے پاس طاقت ہوگی، اقتدار ہوگا، مال ہوگا، نفوذ و اثر ہوگا۔ ان حالات میں تم لوگ بے شک تجربہ اور امتحان کے مرحلے میں داخل ہو جاؤ گے۔ تمہیں جیلوں میں ڈال دیا جائے گا، جلا وطن کیا جائے گا، گھروں سے نکالا جائے گا، تمہاری جائدادیں ضبط کی جائیں گی۔ تمہارے گھروں کی تلاشیاں لی جائیں گی اور ہو سکتا ہے کہ امتحان کا یہ مرحلہ درازتر ہو جائے۔ احسب النّاس ان یترکوا ان یقولوا امنا وھم لا یفتنون۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا تم سے یہ وعدہ ہے کہ وہ مجاہدین کی مدد کرے گا اور محسنین کو نیک صلہ عطا کرے گا۔[۱]"

مترجم

---

[۱] رسائل امام البنّا، ص ۲۲۹، ۲۳۰

حسنُ البنّا شہیدؒ کی ڈائری

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ
بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ
وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ط

اپنے رَبْ کے راستے کی طرف
حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ بُلاؤ اور
بھلے طریقے سے گفتگو کرو۔

(القرآن الحکیم)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مدرسۃ الرشاد الدینیہ کی یادیں

اللہ تعالےٰ ہمارے استاد شیخ محمد زہران پر اپنی رحمت کی بارش فرمائے، موصوف مدرسۃ الرشاد الدینیہ کے مالک و مہتمم تھے۔ بڑے ذکی اور روشن دماغ تھے۔ بڑے خدا پرست عالم اور نہایت فطین حاضر دماغ اور نکتہ سنج انسان تھے۔ لوگوں کے درمیان ایک روشن چراغ تھے جو علم و فضل کے نور سے ہر جگہ روشنی بکھیر رہا تھا۔ گو باقاعدہ تعلیم کے لحاظ سے آپ سنّد بند علماء کے درجے تک نہ پہنچ سکے تھے۔ مگر اپنی ذکاوت و استعداد اور ادب و جہاد کی بدولت علوم و معارف میں اور رفاہ عامّہ کے کاموں میں غیر معمولی سبقت حاصل کر چکے تھے۔ عوام النّاس کے لیے انھوں نے ایک مسجد میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری کر رکھا تھا، اور گھروں میں خواتین کو فہم دین سے بہرہ ور کرتے تھے۔ بایں ہمہ انھوں نے ۱۹۱۵ء کے لگ بھگ نوخیز نسل کی تعلیم کے لیے ـــــ "مدرسۃ الرشاد الدینیہ" کے نام سے ایک دینی و اصلاحی درس گاہ قائم کر دی۔ یہ مدرسہ گو ان مکاتب کے طرز پر تھا جو اس زمانے میں دیہی آبادیوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ اور عوام النّاس کی اعانتوں کے بل پر چلتے تھے۔ لیکن شیخ کا یہ مدرسہ عمدہ درس گاہ ہوں

کی سی شان و شوکت رکھتا تھا۔ نہ صرف دانش کدہ علم تھا بلکہ گہوارۂ تربیت بھی تھا۔ نصابِ تعلیم اور طریقۂ تدریس دونوں پہلوؤں میں منفرد تھا۔ اس وقت کے مدارس میں جو مروجہ نصاب تھا وہ تو پڑھایا ہی جاتا تھا مزید برآں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو زبانی حفظ کرنا اور ان کا فہم وادراک حاصل کرنا بھی نصاب میں شامل تھا۔ طلبہ پر لازم تھا کہ وہ ہر ہفتے جمعرات کو آخری درس کے اختتام پر ایک نئی حدیث کا درس لیں۔ اس حدیث کی تشریح بھی ان کے سامنے کر دی جاتی تھی تاکہ اس کے مطالب و معانی سے واقف ہو جائیں۔ طلبہ مل جل کر حدیث کو اس قدر دہراتے کہ وہ انھیں حفظ ہو جاتی۔ پھر وہ اس کے ساتھ سابقہ حدیث کا اعادہ کرتے جسے وہ گزشتہ ہفتے پڑھ چکے ہوتے تھے۔ یوں ایک سال بھی نہ گزرپاتا کہ طلبہ کو احادیثِ رسولؐ کا معتدبہ ذخیرہ حفظ ہو چکا ہوتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ آج مجھے جو احادیث اصل متن کے ساتھ زبانی یاد ہیں ان میں سے اکثر و بیشتر وہ ہیں جو ان دنوں لوحِ ذہن پر نقش ہو گئی تھیں۔ اسی طرح انشاء پردازی، قواعد صرف ونحو عملی مشق، منتخب مطالعۂ ادب، املاء اور عمدہ نظم ونثر کے قابل حفظ حصے بھی مدرسے کے نصاب میں شامل تھے۔ حالانکہ اس طرز کے دوسرے مکاتب میں ان مضامین میں سے کسی کا رواج نہ تھا۔

شیخ موصوف کا طرزِ تدریس اور اسلوبِ تربیت بڑا اثر انگیز اور نتیجہ خیز تھا۔ حالانکہ انھوں نے فنونِ تربیت پڑھے تھے نہ علم النفس کے نظریات واصول سیکھے تھے۔ ان کا زیادہ تر زور اس بات پر ہوتا تھا کہ ذوق ووجدان کے لحاظ سے ان میں اور اُن کے شاگردوں میں مشارکت اور ہم آہنگی قائم رہے۔ وہ طلبہ کے تمام افعال وحرکات کا نہایت باریک بینی سے محاسبہ کرتے مگر ساتھ ہی انھیں یہ بھی بھرپور طریقے سے محسوس کراتے کہ ان پر انھیں پورا پورا اعتماد ہے۔ وہ طلبہ کو ان کے اچھے اور بُرے کاموں کا اخلاقی صلہ بھی دیتے۔ اگر اچھا کام ہوتا تو اس کا صلہ بھی ان کی طرف سے ایسا ملتا جو طالب علم

کے دل کو شادمانی و مسرت کے نشے سے مخمور کر دیتا اور اگر بُرا کام ہوتا تو اس کی سزا بھی ایسی شدید ہوتی کہ طالب علم کو رنج و افسوس کے تلخ جام پلاتی ۔ اکثر اوقات ان کا یہ صلہ چبھتی ہوئی پھبتی یا نیک دعا یا شعر (وہ کبھی کبھار شعر گوئی کا شغل بھی کر لیتے تھے) کی صورت میں ہوتا۔ مجھے ابھی تک ایک شعر یاد ہے ۔ ایک صاحب نے عملی مشق کے وقت ایک سوال کا ایسا جواب دیا جو انھیں بے حد پسند آیا۔ چنانچہ اُسے یہ فرمایا کہ وہ اپنی کاپی پر جہاں متعلقہ موضوع کے نمبر درج ہیں یہ شعر لکھ لے :

حسن اجاب وفی الجواب اجاد	خوب جواب دیا اور جواب میں کمال دکھایا
فاللہ یمنحہ رضا ورشاد	خدا اُسے رشد و رضا سے نوازے

ایسا ہی ایک اور شعر بھی میرے حافظے میں محفوظ ہے جو موصوف نے ہمارے ایک اور ساتھی کو ناپسندیدہ جواب پر "تحفۃً" پیش کیا تھا اور اسے بھی یہی حکم دیا تھا کہ وہ اپنے جواب کے نیچے اسے درج کر لے ۔ وہ شعر یہ ہے :

یا غارۃ اللہ جدی السیر مسرعۃ	اے غارۃ اللہ (خدا کی گرفت) جلدی سے
فی اخذ ھذا الفتی یا غارۃ اللہ	لپک اور اس چھوکرے کو چنگل میں لے ۔

یہ شعر ضرب المثل بن گیا اور "غارۃ اللہ" کا لقب اس طالب علم پر بطور نام چسپاں ہوگیا۔ ہم بسا اوقات جب اُسے چڑانا چاہتے تو اُسے غارۃ اللہ کہہ کر پکارتے ۔ استاذ محترم طالب علم کو ہدایت کرتے کہ اُسے جو کچھ وہ املاء کرائیں وہ خود اپنے ہاتھ سے اپنی کاپی پر تحریر کرے۔ اس لیے کہ استاذ رحمۃ اللہ بصارت سے محروم تھے۔ لیکن ان کی بصیرت کا نور اکثر آنکھوں والوں سے بڑھ کر تھا ۔ فانھا لا تعمی الابصار ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور (نابینا وہ نہیں ہے جس کی آنکھوں کی بینائی ختم ہو چکی ہو، نابینا وہ لوگ ہیں جن کے دل سینوں کے اندر روشنی سے محروم ہو چکے ہیں) ۔

مجھے اسی لحظہ سے استاذ اور شاگرد کے مابین روحانی ہم آہنگی اور جذباتی اشتراک

کا اندازہ ہو گیا تھا گو اس کا پورا پورا احساس نہ ہوا تھا۔ چنانچہ ہمیں اپنے استاذ سے بے پناہ محبّت تھی۔ بایں ہمہ کہ وہ ہمیں کمر توڑ اور اعصاب شکن کاموں میں لگائے رکھتے تھے۔ میرا یہ بھی اندازہ ہے کہ میں نے روحانی جذبہ کے ساتھ ساتھ استاذ رحمہ اللہ سے ذوق تحقیق اور کثرت مطالعہ کا شوق بھی اخذ کیا ہے۔ کیونکہ مرحوم مجھے اکثر اپنے کتب خانے میں لے جاتے جس میں نہایت مفید تالیفات کی فراوانی تھی۔ ان کی ضرورت کے مطابق میں کتابوں کو کھنگالتا اور جن جن مسائل کی وہ ضرورت محسوس کرتے، میں انھیں کتابوں میں سے پڑھ پڑھ کر سُناتا۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ ان کی مجلس میں اہل علم حضرات آجاتے اور کسی نہ کسی موضوع پر بحث ومناظرہ اور مذاکرہ ومناقشہ شروع ہو جاتا۔ میں یہ تمام گفتگو بغور سنتا رہتا۔ استاذ اور شاگرد کے درمیان اس نوعیت کا بلا واسطہ تعلق نہایت اچھے اثرات چھوڑتا ہے۔ کیا اچھا ہو کہ معلّم اور مربّی حضرات ایسے بلا واسطہ تعلق کی اہمیت کو سمجھیں، اسے ذریعۂ تربیت بنائیں اور اس پر خصوصی توجہ دیں۔ ان شاء اللہ اس طرز تربیت میں وہ بکثرت خیر کے پہلو پائیں گے۔ اس مبارک درس گاہ میں میں نے اپنی عمر کے آٹھویں سال سے لے کر بارہویں سال تک کا عرصہ گزارا۔

مڈل اسکول میں داخلہ

اس کے بعد استاذ مرحوم اپنے مدرسہ کو ترک کر کے دوسرے کاموں میں مشغول ہو گئے۔ مدرسہ دوسرے منتظمین کے سپرد کر دیا گیا۔ یہ نئے منتظمین استاذ محمد زہران رحمہ اللہ جیسی تاباں روحانیت، بے پایاں علم، فراواں ادب اور پُرکشش اخلاق سے بہرہ ور نہ تھے۔ اس نوخیز طالب علم کو، جو استاذ زہران کی خوبیوں کی حلاوت کا لذّت آشنا ہو چکا تھا۔ نئے حضرات کی صحبت کا یارا نہ رہا۔ اس مدرسہ میں ابھی اس نے قرآن بھی پورا حفظ نہ کیا تھا اور والد کی یہ آرزوئے بے تاب کہ وہ اپنے بیٹے کو کتاب اللہ کا حافظ دیکھیں، ابھی شرمندۂ تکمیل نہ ہوئی تھی۔ کیونکہ ابھی تک اس نے صرف سورۂ بقرہ سے لے کر سورۂ

الاسراء تک یاد کیا تھا جو تقریباً قرآن کریم کا نصف ہوتا ہے۔ ایک روز یکایک میں نے پُرعزم لہجے میں واشگاف طور پر والد محترم سے یہ کہہ دیا کہ اب میرے لیے ان مکتبوں میں مزید پڑے رہنا ناقابل برداشت ہوگیا ہے۔ اب مجھے لازماً مدرسہ اعدادیہ (مڈل اسکول) میں چلے جانا چاہیے۔ ان دنوں میں مدرسہ اعدادیہ موجودہ مدرسہ ابتدائیہ (پرائمری اسکول) کے نہج پر ہوتا تھا۔ بس اتنا فرق ہے کہ اس وقت غیر ملکی زبان نہیں پڑھائی جاتی تھی۔ اس کی جگہ قوانین اراضی اور قوانین مالی اور باغبانی کے مضامین کا اضافہ ہوتا تھا۔ نیز قومی زبان اور دینیات کے مضامین بھی قدرے وسعت کے ساتھ پڑھائے جاتے ہیں۔

باپ نے، جس کی یہ شدید خواہش تھی کہ اس کا بیٹا کتاب اللہ زبانی یاد کرے، بیٹے کی مذکورہ تجویز کی مخالفت کی۔ لیکن جب اسکول کی تعلیم کے خواہش مند بیٹے نے اسے یہ یقین دلا دیا کہ وہ قرآن کریم کا بقیہ حصہ گھر پر حفظ کرے گا تو والد نے بیٹے کی تجویز پر صاد کر دیا۔ اسی ہفتے یہ خاکسار مڈل اسکول کا طالب علم ہوگیا۔ اُس کا دن اسکول کی تعلیم میں گزرتا۔ اور مدرسے سے لوٹنے کے بعد عشاء کی نماز تک وہ گھڑی سازی کا فن سیکھتا جس کا وہ بے حد شائق تھا۔ اور عشاء کے بعد سے لے کر بستر خواب میں داخل ہونے تک وہ اسکول کے اسباق کا اعادہ کرتا اور جب صبح کی نماز کے لیے اٹھتا تو اس وقت سے لے کر اسکول روانگی تک کا وقفہ وہ قرآن کریم حفظ کرنے میں گزارتا۔

انجمن اصلاح اخلاق

اسکول کے اساتذہ میں سے ایک بزرگ محمد آفندی عبدالخالق رحمۃ اللہ تھے۔ حساب اور ریاضی کے استاد تھے۔ بڑے بااخلاق اور صاحبِ فضل انسان تھے۔ انھوں نے سال سوم کے طلبہ کو یہ تجویز کیا کہ وہ اپنی ایک انجمن تشکیل کریں جس کا نام "جمعیت اخلاق ادبیہ" ہو۔ انجمن کا لائحۂ عمل انھوں نے خود ہی وضع کر دیا اور وہی اس کے نگراں بن گئے۔ اور طلبہ کو اس کی انتظامی کونسل منتخب کرنے کی ہدایت کی۔ انجمن کے اغراض وضوابط کا

خلاصہ یہ تھا کہ :-

" جو اپنے بھائی کو گالی دے گا اسے ایک ملیم جرمانہ ہوگا، جو اپنے والد کو بُرا بھلا کہے گا اسے دو ملیم جرمانہ ادا کرنا ہوگا۔ جو ماں سے گستاخی کرے گا اس پر ایک قرش جرمانہ عائد ہوگا۔ جو دین کے متعلق نازیبا کلمات کہے گا اسے دو قرش جرمانے میں دینے ہونگے اور جو دوسرے ساتھی سے دنگا فساد کرے گا اسے بھی دو قرش جرمانہ دینا ہوگا۔ انتظامی کونسل کے ارکان اور صدر پر مذکورہ افعال کا دوگنا جرمانہ عاید کیا جائے گا۔ اور جو طالب علم ان ضوابط پر عمل درآمد نہیں کرے گا اُس کے رفقاء اس کا مقاطعہ کریں گے، اور یہ مقاطعہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک، وہ ضوابط پر عمل درآمد نہ کرے گا۔ جرمانوں سے جو رقم جمع ہوگی اسے رفاہی کاموں پر صرف کیا جائے گا۔ نیز ارکان جمعیت کا فرض ہوگا کہ وہ اتباع دین کی باہم نصیحت کریں، نمازوں کو بروقت ادا کرنے کی تلقین کریں۔ اللہ تعالےٰ کی اطاعت، والدین کی پیروی اور مرتبے کے لحاظ سے بڑے اشخاص کی فرمانبرداری کا زیادہ سے زیادہ شوق پیدا کریں "

رشاد کی دینی درس گاہ سے اس نوخیز نے جو روحانی سرمایہ حاصل کیا تھا اس کی برکت سے وہ طلبہ کی برادری میں ایسے کاموں میں گو۔ئے سبقت لے گیا۔ اور تھوڑے ہی عرصہ کے اندر ان کی نگاہوں کا مرکز بن گیا۔ یہاں تک کہ جب جمعیت اخلاق ادبیہ کی مجلس عاملہ کا انتخاب ہوا تو اس مجلس کی صدارت کا قُرعہ اس کے نام نکلا۔ جمعیت نے اپنی کارروائیوں کا آغاز کر دیا۔ چنانچہ جمعیت کی طرف سے بکثرت رکن طلبہ سے قواعد جمعیت کی خلاف ورزیوں پر باز پُرس کی گئی۔ اور جرمانوں کی بدولت معتد بہ رقم جمع ہو گئی۔ جس میں سے کچھ رقم ایک طالب علم ساتھی لبیب اسکندر کے اعزاز میں دی جانے والی الوداعی پارٹی پر صرف کی گئی۔ یہ صاحب وزارت صحت کے ایک ڈاکٹر کے سگے بھائی تھے۔ اور جب ڈاکٹر صاحب کا تبادلہ ہوا تو انھیں بھی ساتھ ہی منتقل ہونا پڑا۔ رقم کا کچھ حصہ ایک غریب الوطن

شخص کی میت کی تجہیز وتکفین پر خرچ کر دیا گیا۔ جو دریائے نیل میں ڈوب گیا تھا اور نیل کی موجوں نے اس کی لاش کو فصیلِ مدرسہ کے پاس لاکر پھینک دیا تھا۔ چنانچہ جمعیت نے اپنے بیت المال سے اس کی تجہیز وتکفین کے مصارف ادا کیے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نوعیت کی انجمن، اصلاح کے معاملے میں وہ نتائج برآمد کر سکتی ہے جو بیسیوں نظری وعظوں سے بھی نہیں پیدا ہو سکتی۔ مدرسوں اور درس گاہوں کو چاہیے کہ وہ اس طرز کی انجمنوں کے قیام پر زیادہ سے زیادہ توجہ دیں۔

ساحلِ نیل پر

اس جمعیت نے اپنے نوعمر ارکان کے دلوں پر غیر معمولی اثرات چھوڑے۔ یہ اُسی کا فیض تھا کہ مجھے یاد ہے کہ ایک روز میرا دریائے نیل کے کنارے اس جگہ گزر ہوا جہاں مزدوروں کی بہت بڑی تعداد بادبانی کشتیاں بنانے میں مصروف ہوتی ہے۔ محمودیہ میں یہ صنعت بہت پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ایک صاحب نے اپنی تیار شدہ کشتی کے مستول پر چوبی مورتی لٹکا رکھی ہے جو بالکل عریاں حالت میں ہے اور اخلاق عامّہ کے سراسر منافی ہے، اور خاص طور پر یہ خرابی اس لیے بھی اہمیت اختیار کر رہی ہے کہ ساحل کے اس حصّے میں خواتین اور دوشیزائیں بکثرت آمد و رفت رکھتی ہیں اور پانی بھرتی ہیں۔ یہ دیکھ کر میرا دل لرز گیا۔ میں فوراً پولیس چوکی کے انچارج کے پاس گیا (محمودیہ میں اس وقت ابھی پولیس اسٹیشن قائم نہیں ہوا تھا) میں نے اُس کے سامنے یہ کہانی بیان کی اور اس قبیح منظر پر صدائے احتجاج بلند کی۔ افسر مذکور نے میری غیرت و حمیت کو بہت وزن دیا، اور فوراً میرے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ اور آکر کشتی کے مالک کو زجر و توبیخ کی اور اُسے بلا تاخیر مورتی اُتار پھینکنے کا حکم دیا۔ ملاّح نے فی الفور حکم کی تعمیل کی۔ مذکورہ افسر نے میری اس امداد پر اکتفاء نہ کی بلکہ وہ اگلے روز اسکول آگیا اور اس نے ہیڈ ماسٹر صاحب کے سامنے یہ واقعہ بڑی مسرت و خوشگوار حیرت کے ساتھ بیان کیا۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر

جناب استاذ محمود آفندی بھی ایک صاحب فضل وصلاح مربّی تھے۔ اور اب موصوف وزارت تعلیم کے سرکردہ حکّام میں سے ہیں۔ وہ بھی یہ حکایت سُن کر پھولے نہ سمائے۔ اور اگلے روز انھوں نے صبح کی اسمبلی میں یہ کہانی تمام طلبائے مدرسہ کو سُنائی اور انھیں اُکسایا کہ ان میں سے ہر طالب علم کو لوگوں کو اچھی بات کی نصیحت کرتے رہنا چاہیئے۔ اور جہاں کہیں وہ کوئی بُرائی دیکھیں اس پر نکیر کریں۔ مگر اب معلوم ہوتا ہے کہ اس طرز کے امور پر دھیان دینے کا زمانہ لدگیا ہے۔ درس گاہوں کے سربراہ اور پولیس کے حکّام دونوں اس فرض سے مُنہ موڑ چکے ہیں، حیف صد حیف!!

مسجد صغیر کی چٹائیوں پر

اسکول کے اکثر طلبار کی عادت تھی کہ وہ "مسجد صغیر" میں نماز ادا کرتے۔ یہ مسجد اسکول کے جوار میں تھی۔ نماز ظہر میں وہ خصوصیت کے ساتھ یہاں آتے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد انھیں یہاں کشادہ جگہ مل بیٹھنے کو مل جاتی۔ یہ مسجد اوقاف کے تحت نہ تھی۔ مجھے ایک دلچسپ لطیفہ یاد ہے۔

اس مسجد کے امام شیخ محمد سعیدؒ ایک روز جو آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ طلبہ میں سے ایک صاحب اذان دیتے ہیں، پھر جماعت کھڑی ہوتی ہے۔ ایک امام صاحب آگے بڑھتے ہیں اور طلبہ کی بہت بڑی تعداد کو جو تین یا چار صفوں سے بھی زائد تھی نماز پڑھاتے ہیں۔ انھیں ڈر ہوا کہ مسجد کا پانی اسراف کی نذر ہوگا اور چٹائیاں بھی ٹوٹ پھوٹ جائیں گی۔ چنانچہ وہ کھڑے انتظار کرتے رہے یہاں تک کہ لوگ اپنی نماز مکمل کر چکے۔ پھر آگے بڑھ کر انھوں نے بزور بازو لڑکوں کو منتشر کرنا شروع کر دیا۔ انھیں خوب ڈرایا دھمکایا اور خوفناک وعیدیں سُنائیں۔ کچھ لڑکے تو ان "ارشادات" پر لبیک کہتے ہوئے بھاگ گئے اور کچھ ڈٹ گئے اور وہاں سے نہ ہلے۔ میرے اندر بچکانہ خیال نے چٹکی لی، میں نے ٹھان لیا کہ امام صاحب سے اس حرکت کا ضرور بدلہ لوں گا۔ چنانچہ میں نے انھیں ایک خط لکھا جس

میں یہ آیت تحریر کر دی : وَلَا تَطْرُدِ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ بِالْغَدٰوۃِ وَالْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْھَہٗ ط مَا عَلَیْکَ مِنْ حِسَابِھِمْ مِّنْ شَیْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِکَ عَلَیْھِمْ مِّنْ شَیْءٍ فَتَطْرُدَھُمْ فَتَکُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ۔ (الانعام : ۵۲)۔ میں نے انھیں یہ خط بیرنگ بھیجا اور خیال کیا کہ ایک قرش جرمانہ ہی بطور قصاص کافی ہے ۔ موصوف رحمہ اللہ کو جب یہ خط وصول ہوا تو تاڑ گئے کہ یہ ضرب ان پر کہاں سے لگی ہے ۔ چنانچہ وہ والد محترم سے ملے اور ان سے میرا بڑا شکوہ کیا اور خفگی کا اظہار کیا ۔ مگر والد صاحب نے انھیں نصیحت فرمائی کہ انھیں طلبہ کے ساتھ حسن سلوک رکھنا چاہیے اور ان کے بارے میں بہتر رویہ اختیار کرنا چاہیے ۔ اس کے بعد موصوف ہمارے ساتھ ہمیشہ خوشدلی سے پیش آئے اور اچھا برتاؤ رکھا ۔ انھوں نے ہم پر یہ شرط عائد کر دی تھی کہ مسجد سے نکلنے سے پہلے ہم ان کی پانی کی ٹنکی بھر دیا کریں ۔ اور جب چٹائیاں شکستہ ہو جایا کریں تو ہم ان کے لیے چندہ جمع کیا کریں ۔ ہم ان کی شرائط کے پابند رہے ۔

انجمن انسداد محرّمات

معلوم ہوتا ہے کہ مدرسہ کی حدود تک محدود رہنے والی اصلاحی سرگرمیاں اس نوخیز گروہ کی آتش شوق کو فرو نہ کر سکیں ۔ چنانچہ ان میں سے چند اصحاب جمع ہوئے ۔ مثلاً استاذ محمد علی بُدَیْر جو اب محکمۂ تعلیم میں مدرس ہیں ۔ لبیب آفندی نوار جو آج کل تجارت میں مگن ہیں ۔ اخ عبدالمتعال سنکل آفندی ، استاذ عبدالرحمٰن ساعاتی جو آج کل ریلوے میں ملازم ہیں اور استاذ سعید بُدَیْر انجنیئر ۔ ان حضرات نے طے کیا کہ ایک اسلامی انجمن جمعیت انسداد محرّمات کے نام سے قائم کی جائے ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا ۔ اس انجمن کا چندہ رکنیت ہفتہ وار پانچ ملیم سے لے کر دس ملیم تک تھا ۔ مختلف کام مختلف ارکان کے درمیان بٹے ہوئے تھے ۔ کسی کے ذمے یہ تھا کہ وہ قرآن و حدیث و فقہ سے مطلوبہ آیات و احادیث اور عبارات تلاش کرے اور خطوط کے مسودے تیار کرے ۔ دوسرے کا کام تھا کہ وہ خطوط کی کتابت کرے ۔

تیسرا طباعت کے کام پر مامور تھا۔ اور باقی لوگ ان خطوط کو لوگوں میں تقسیم کرنے کی مہم سرانجام دیتے۔ یہ خطوط ان لوگوں کو بھیجے جاتے جن کے بارے میں جمعیت کو یہ اطلاع ملتی کہ وہ کسی گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں یا عبادات، خاص طور پر نماز صحیح طریقے پر ادا نہیں کرتے۔ جو شخص رمضان کا روزہ نہ رکھتا اور جمعیت کا کوئی رکن اُسے کھاتے پیتے دیکھ لیتا وہ فوراً جمعیت کو خبر دیتا۔ اور جمعیت کی طرف سے اس شخص کو ایک خط تحریر کیا جاتا جس میں ترک صوم کے بارے میں شدید نہی کی جانب توجہ دلائی جاتی۔ جو شخص نماز بے ہنگم طریقے سے ادا کرتا اور خشوع و خضوع کے شرائط پورے نہ کرتا اور اطمینان سے اس فرض عظیم کو انجام دینے میں کوتاہی برتتا اسے بھی جمعیت کی طرف سے ایک خط پہنچ جاتا جس میں اس غفلت پر اُسے توجہ دلا دی جاتی۔ جو مرد سونا پہنے نظر آجاتا اسے بھی خط بھیج کر اس فعل سے منع کیا جاتا اور اس بارے میں شرعی حکم سے اسے آگاہ کیا جاتا۔ اگر کسی عورت کو جمعیت کا رکن دیکھ لیتا کہ وہ سوگ میں چہرہ پیٹ رہی ہے یا جاہلیت کے کلمات زبان سے ادا کر رہی ہے تو اس کے خاوند یا ولی کو بذریعہ خط اس جاہلانہ رسم کے ارتکاب سے باز رہنے کی تلقین کی جاتی۔ الحاصل کوئی شخص خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا ایسا نہ تھا کہ اس کے اندر کسی گناہ کا فعل نظر آیا ہو اور اسے جمعیت نے خط کے ذریعہ نکیر نہ کی ہو۔ ارکانِ جمعیت چونکہ کمسن تھے لوگوں کی نظروں میں نہ آسکتے تھے اور نہ ان کے بارے میں کوئی شخص اس نوعیت کی کارروائی کا شبہ کر سکتا تھا اس لیے لوگ ان سے پردہ داری اور پرہیز نہ کرتے اور یوں وہ لوگوں کی ہر بات آسانی سے معلوم کر لیتے تھے۔ لوگوں کا گمان یہ تھا کہ یہ کام ہمارے استاد شیخ زہران رحمہ اللہ کا ہے۔ اس لیے لوگ ان کو آکے ملتے۔ ان کو شدید ملامت کرتے اور ان سے مطالبہ کرتے کہ جو کچھ انھیں کہنا ہو زبانی کہہ دیں یہ خطوط بازی کیوں کرتے ہیں۔ شیخ زہران رح بیچارے اس فعل سے لاتعلقی کا اظہار کرتے اور اپنی پوری صفائی پیش کرتے۔ مگر لوگ یقین نہ کرتے۔ آخر کار خود شیخ زہران کو بھی جمعیت کی طرف سے ایک خط روانہ کیا گیا جس میں

انھیں توجہ دلائی گئی کہ انھوں نے فلاں روز ظہر کے فرض ستونوں کے درمیان پڑھے ہیں۔ اور یہ مکروہ ہے۔ شیخ شہر کے نامور عالمِ دین ہیں۔ انھیں چاہیے کہ وہ مکروہات سے بھی پرہیز کریں تاکہ عوام النّاس محرّمات سے مجتنب رہیں۔ ان دنوں اگرچہ میں ان کے مکتب اور لائبریری کو ترک کر چکا تھا مگر عام درسوں کی بدولت میرا ان کے ساتھ رابطہ برابر قائم تھا۔ مجھے یاد ہے کہ شیخ رحمہ اللہ نے مجھے بُلا بھیجا تاکہ ہم دونوں مل کر مسئلہ مذکور کے بارے میں اصل حکم فتح الباری (شرح صحیح البخاری) میں تلاش کریں۔ یہ موضوع اب تک میرے ذہن میں مستحضر ہے۔ گویا آج ہی کی بات ہے۔ میں شیخ کے سامنے فتح الباری کی عبارت پڑھتا جاتا تھا اور لبوں پر مسکراہٹ طاری تھی۔ اور وہ یہ دریافت کرتے جاتے کہ یہ کون لوگ ہیں جنھوں نے یہ مسئلہ انھیں لکھ بھیجا ہے۔ تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ یہ لوگ حق پر ہیں، اور ان کی رائے درست ہے۔ میں نے یہ پورا واقعہ ارکان جمعیت کو بتایا۔ اُن کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔

چھ ماہ سے زائد عرصہ تک جمعیت یہ مہم سرانجام دیتی رہی، یہ مہم لوگوں کے لیے موجب حیرت بھی تھی اور باعثِ دہشت بھی۔ آخر کار جمعیت کا راز ایک قہوہ خانے کے مالک کے ہاتھوں افشا ہوگیا۔ دراصل اس نے ایک رقاصہ کو قہوہ خانے میں منگوایا اور ناچ گانے کا انتظام کیا۔ اس پر جمعیت کی جانب سے اسے ایک چٹھی روانہ کی گئی۔ جمعیت کے خطوط مالی بچت کے نقطۂ نظر سے بذریعہ ڈاک نہیں بھیجے جاتے تھے بلکہ ارکان انہیں دستی لے جاتے اور ایسی جگہ انھیں رکھ دیتے جہاں مکتوب الیہ کی نظر پڑے اور وہ اُسے اٹھالے۔ لیکن معلّم (قہوہ خانے کے مالک کا عُرفی نام) بڑا ہوشیار تھا اس نے حامل خط کی آہٹ محسوس کرلی، اور لپک کر اُسے بمعہ خط پکڑ لیا اور قہوہ خانے میں موجود لوگوں کے سامنے اسے عتاب شدید کا نشانہ بنایا۔ اس طرح جمعیت بے نقاب ہوگئی۔ اب جمعیت کے ارکان نے یہ طے کیا کہ اب انھیں اپنی موجودہ سرگرمیوں میں کمی کردینی چاہیے اور کسی نئے اسلوب سے

انسدادِ محرمات کا فرض انجام دینا چاہیے۔

ٹیچرز ٹریننگ اسکول کا رُخ

اس طالب علم (راقم السطور) نے اپنا وعدہ ایفا کردیا۔ وہ باقاعدگی سے قرآن کریم حفظ کرتا رہا۔ مدرسہ الرشاد میں وہ جتنا حفظ کر کے آیا تھا اس میں اس نے ایک چوتھائی کا اضافہ کرلیا اور سورۂ یٰسین تک حفظ مکمل کرلیا۔ محمودیہ کے ضلعی بورڈ نے یہ فیصلہ کیا کہ مدارس اعدادیہ کا کا نظام منسوخ کردیا جائے۔ اوران مدارس کو پرائمری اسکولوں میں تبدیل کردیا جائے۔ اس فیصلے کے بعد راقم کے سامنے دو راستے تھے جن میں سے ایک کا اُسے انتخاب کرنا تھا۔ یا تو اسے اسکندریہ کے معہد دینی (دینی درس گاہ) میں چلاجانا چاہیے تاکہ وہ ازہری شیخ بن جائے، یا دمنہور کے ٹیچرز ٹریننگ اسکول میں داخلہ لے لینا چاہیے تاکہ اس کا راستہ مختصر ہوجائے اور وہ تین سال کے بعد ٹیچر بن جائے۔ آخر کار دوسرے نقطۂ نظر کا پلڑا بھاری رہا۔ درخواستیں داخل کرنے کی تاریخ آگئی، اور اس نے بالفعل درخواست برائے داخلہ دائر کردی۔ لیکن اب اسے دو بڑی رکاوٹوں کا سامنا تھا:

ایک عمر کی رکاوٹ۔ کیونکہ وہ ابھی چودھویں سال کے نصف میں تھا۔ جب کہ داخلے کی شرط مکمل چودہ سال عمر تھی۔ اور دوسری قرآن کریم کا مکمل حفظ۔ کیونکہ یہ بھی داخلے کی ایک شرط تھی۔ اور قرآن کریم کا زبانی امتحان لازمی تھا۔ ٹیچرز ٹریننگ اسکول کے پرنسپل استاد بشیر الدسوقی موسیٰ تھے۔ جواب پنشن یافتہ ہیں۔ بڑے کریم النفس اور نرم خو تھے۔ راقم کے ساتھ انھوں نے نرمی برتی۔ عمر کی شرط بھی نظر انداز کردی۔ اور راقم کا یہ عہد بھی قبول فرمالیا کہ قرآن کریم کا جو چوتھائی حصہ باقی رہ گیا ہے اُسے وہ حفظ کرلے گا۔ چنانچہ انھوں نے داخلے کے لیے تحریری اور زبانی امتحان کی اجازت دے دی جس میں راقم کامیابی سے گزر گیا۔ اس روز سے وہ دمنہور کے ٹیچرز ٹریننگ اسکول کا ایک طالب علم بن گیا۔

سلسلۂ حصافیہ سے دلچسپی

"چھوٹی مسجد" میں، جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے، میں نے "حصافی اخوان" کو دیکھا تھا۔ وہ ہر رات نمازِ عشاء کے بعد اللہ کا ذکر کرتے تھے۔ میں بھی پابندی کے ساتھ مغرب اور عشاء کے درمیان وہاں شیخ زہران رحمہ اللہ کے درس میں حاضری دیتا تھا۔ یہ محفلِ ذکر میرے لیے بڑی پُرکشش تھی۔ اس کی ہم آہنگ آوازیں، دل کش نغمے، متلاطم روحانیت، فاضل شیوخ اور صالح نوجوانوں پر مشتمل ذاکرین اور ان کی وسیع الظرفی اور ان کمسن بچوں کے ساتھ اُن کا تواضع سے پیش آنا جو محفل میں گھس جاتے اور اللہ تبارک و تعالیٰ کے ذکر میں ان کے ساتھ شریک ہو جاتے یہ سب پہلو دامنِ دل کو کھینچ لیتے تھے۔ چنانچہ میں نے اس محفل میں بھی پابندی سے شرکت شروع کر دی۔ آگے چل کر میرے اور "اخوان حصافیہ" کے نوجوان عنصر کے مابین تعلقات بڑے مضبوط ہو گئے۔ ان میں تین حضرات سرِفہرست ہیں۔ ایک شیخ شلبی الرجال، دوسرے شیخ محمد ابوشوشہ اور تیسرے شیخ سید عثمان۔ ذاکرین میں سے جو نوجوان عمر کے لحاظ سے ہم سے قریب تر تھے۔ ان میں محمد آفندی دمیاطی، صاوی آفندی صاوی، عبدالمتعال آفندی سنکل اور ایسے ہی چند دیگر حضرات۔ اس مبارک گروہ میں پہلی بار استاذ احمد السکری (اخوان المسلمون کے موجودہ جنرل سکریٹری) کے ساتھ میری ملاقات ہوئی۔ ہم دونوں کی زندگی میں اس ملاقات نے گہرے نقش چھوڑے۔ اس گھڑی سے شیخ حصافی کا نام برابر کانوں میں پڑتا رہا، اور دل کی گہرائیوں پر خوش گوار اثر چھوڑتا رہا۔ اور شیخ کے دیدار کا عشق اور شیخ کی مجالست اور شیخ سے استفادہ کا شوق لمحہ بہ لمحہ بڑھتا رہا۔ میں نے "رزوقی وظیفہ" صبح و شام بالالتزام پڑھنا شروع کر دیا۔ اس وظیفے کے ساتھ میری دلچسپی اس لیے بھی بڑھ گئی کہ والدِ محترم نے اس کی نہایت لطیف شرح تحریر کر دی جس میں واضح کر دیا کہ اس وظیفے کے تمام الفاظ احادیثِ صحیحہ سے ماخوذ ہیں۔ اس شرح کا نام ہے: "تنویر الافئدۃ الزکیۃ بادلۃ اذکار الرزوقیۃ"۔ یہ وظیفہ سراسر قرآن کریم کی آیات اور ان مسنون اذکار

پر مشتمل ہے جو صبح اور شام کے وقت پڑھے جاتے ہیں اور یہ تمام اذکار احادیث کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ اس میں کوئی عجمی لفظ یا فلسفیانہ ترکیب یا ایسی عبارت نہیں پائی جاتی جس میں دعا کا پہلو کم اور خرافات زیادہ ہو۔

اسی دوران میرے ہاتھ کتاب "المنهل الصافي في مناقب حسنين الحصافي" لگ گئی۔ حسنین الحصافی سلسلہ حصافیہ کے بانی اور شیخ اوّل ہیں۔ اور اس سلسلہ کے موجودہ پیشوا محترم شیخ عبدالوہاب حصافی ——— اللہ ان کی عمر دراز کرے اور ان کے فیض کو عام فرمائے ——— کے باپ ہیں۔ ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ میں ان کی زیارت نہیں کر سکا۔ ان کی وفات جمعرات ۱۷ جمادی الآخرہ ۱۳۲۸ ہجری کو ہوئی اور میں اس وقت چار سال کا تھا۔ وہ بکثرت ہمارے شہر میں آتے جاتے رہے مگر میں ان سے نہ مل سکا۔

میں کتاب کے مطالعہ میں منہمک ہو گیا۔ اور اس سے مجھے معلوم ہوا کہ سیّد حسنین حصافی رحمہ اللہ ازہر کے فارغ التحصیل عالم تھے۔ مذہب شافعی میں انھیں تفقّہ حاصل تھا۔ تمام دینی علوم کو انھوں نے تعمّق و وسعت کے ساتھ پڑھا تھا۔ بڑے عبادت گزار تھے۔ ذکرِ خدا میں مستغرق رہتے۔ شیوۂ طاعت و زہد پر مداومت رکھتے۔ کئی حج کر چکے تھے۔ اور ہر حج کے موقع پر متعدّد عمرے کرتے رہے۔ ان کے رفقاء اور اصحاب یک زبان ہو کر کہتے ہیں کہ ہم نے اطاعت گزاری، ادائے فرائض اور سنن و نوافل کی پابندی میں ان سے بڑھ کر کسی کو قوی اور حریص نہیں پایا۔ زندگی کے آخری ایام تک وہ اس طریقے پر قائم رہے حالانکہ خاصے معمّر ہو گئے تھے۔ ساٹھ سال سے اوپر تھے۔ دعوت الی اللہ کا کام بھی کرتے رہے۔ اہلِ طریقت کے اسلوب پر، مگر نورانیت اور معرفت میں ڈوب کر، صحیح اور پاکیزہ اصولوں کے تحت، ان کی دعوت علم و تربیت، فقہ و عبادت اور طاعت و ذکر پر استوار تھی۔ بدعات و خرافات جو تصوف و طریقت کے متوالوں کے اندر پھیلی ہوئی تھیں ان کے وہ شدید مخالف تھے، اور ہر وقت اور ہر حالت میں وہ کتاب و سنّت ہی کو مشعلِ ہدایت بناتے۔

غلط تاویلات اور گمراہ کن خرافات سے پرہیز کرتے۔ معروف کی تلقین کرتے اور منکر سے منع کرتے۔ نصیحت و خیر خواہی کا کام ہر لحہ جاری رکھتے۔ یہاں تک کہ انھوں نے بہت سارے ایسے امور واحوال کو بدل ڈالا جوان کے خیال میں خلاف کتاب وسنّت تھے اور جن پر خود ان کے شیوخ واساتذہ بھی کاربند تھے۔ ان کی سیرت میں سے (خدا ان پر راضی ہو) جس چیز نے سب سے زیادہ میرے دل کو گرویدہ بنایا اور میری عقل وخرد کو مسحور کیا وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے معاملے میں ان کی شدّت تھی۔ موصوف اس بارے میں کسی کی ملامت سے نہ ڈرتے اور خواہ روبرو کتنی عظیم و بزرگ شخصیت ہوتی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ترک نہ کرتے۔ اس کی متعدد مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں :-

ریاض پاشا جن دنوں وزیر اعظم تھا اس سے ملاقات کے لیے گئے۔ اسی دوران پاشا کے پاس ایک عالمِ دین آئے اور پاشا کے سامنے یوں جُھک گئے گویا حالتِ رکوع میں ہیں۔ شیخ غضب ناک ہوکر اُٹھے اور مولوی صاحب کے مُنہ پر ایک بھرپور تھپّڑ رسید کیا اور سختی کے ساتھ انھیں منع کرتے ہوئے فرمانے لگے :

"میاں صاحب سیدھے ہوجاؤ، رکوع اللہ کے سوا کسی کے آگے جائز نہیں۔ اپنے دین و علم کو رسوا نہ کرو، ورنہ خدا تمھیں رسوا کردے گا۔"

مولوی صاحب اور پاشا دونوں دم بخود رہ گئے۔ اور کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ وہ شیخ پر کسی نوعیّت کی گرفت کرے۔ ابھی مجلس میں بیٹھے تھے کہ ایک پاشا آیا، جو ریاض پاشا کے دوستوں میں سے تھا۔ اس نے انگلی میں سونے کی انگشتری پہن رکھی تھی اور ہاتھ میں ایک چھڑی تھی، جس کا دستہ سونے کا تھا، شیخ اس کی طرف ملتفت ہوئے اور کہنے لگے :

"بھائی صاحب! یوں زیور کے طور پر سونے کا استعمال مردوں

کے لیے حرام اور عورتوں کے لیے حلال ہے۔ یہ دونوں چیزیں اپنی کسی
خاتون کے حوالے کر دیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واضح حکم کی
خلاف ورزی سے بچیں۔"

پاشا صاحب نے کوئی اعتراض کرنا چاہا۔ مگر ریاض پاشا نے دخل دیا اور دونوں کو ایک دوسرے سے متعارف کرایا۔ بایں ہمہ شیخ مصر رہے کہ انگشتری اور سونے کا دستہ دونوں اُتار دینے ضروری ہیں تاکہ منکر کا ازالہ ہو سکے۔

ایک مرتبہ علماء کی معیت میں کسی مخصوص تقریب کے موقع پر خدیوی توفیق پاشا کے پاس گئے، اور خدیوی کو بلند آواز سے السلام علیکم کہا۔ خدیوی نے ہاتھ کے اشارے سے سلام کا جواب دیا، شیخ نے اپنے بڑے عزم وایقان سے فرمایا:

"سلام کا جواب ویسا ہی یا اس سے بہتر دینا چاہیے۔ وعلیکم
السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہنا چاہیے، صرف اشارۃً جواب دے دینا
جائز نہیں ہے۔"

خدیوی کو ناچار زبان سے سلام کا جواب دینا پڑا، اور شیخ کے حق پسندانہ موقف اور تمسک بالدین کی تعریف کی۔

ایک بار سروے ڈپارٹمنٹ کے ملازمین میں سے اپنے ایک مرید سے ملاقات کو گئے، اس کے دفتر میں چپس کی ایک مورتی دیکھی۔ اس سے دریافت فرمایا کہ یہ کیا چیز ہے؟ مرید نے جواب دیا کہ یہ مجسمے ہمیں اپنے کام کے سلسلے میں درکار ہوتے ہیں۔ شیخ نے کہا: یہ حرام ہے، چنانچہ انھوں نے مجسمہ پکڑا اور اس کی گردن توڑ دی۔ اسی لحظہ انگریز انسپکٹر اندر آیا اور یہ منظر دیکھ کر شیخ کی اس کارروائی پر بحث ومناقشہ کرنے لگا۔ شیخ نے اسے نہایت عمدہ طریقے سے جواب دیا اور اسے سمجھایا کہ اسلام توحید خالص قائم کرنے کے لیے آیا ہے۔ وہ بُت پرستی کے اثرات کو ہر شکل میں ختم کر دینا چاہتا ہے۔ اسی بنا پر اس نے مجسموں کو حرام ٹھیرایا ہے۔"

یہ مجسمے پوجا پاٹ کا ذریعہ نہ بن جائیں۔ شیخ نے اس موضوع پر اس قدر روشنی ڈالی کہ انسپکٹر سر دھننے لگا۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اسلام کے اندر بھی بُت پرستی کی آمیزش ہے۔ اس نے شیخ کی بات کو تسلیم کیا اور ان کی بڑی تعریف کی۔

اپنے ایک مرید کے ہمراہ مسجد سیدنا حسینؓ گئے[1]۔ قبر کے سامنے کھڑے ہو کر یہ مسنون دعا پڑھی: " السّلام علےٰ اھل الدّیار من المومنین " ایک مرید بول اُٹھا: " اے ہمارے آقا و سردار! سیدنا حسینؓ سے کہیں کہ وہ ہم پر راضی ہو جائیں "۔ شیخ حصافی نے طیش کے ساتھ اس کی جانب دیکھا اور فرمایا:

" راضی ہو ہم پر، تجھ پر اور اُن پر اللہ جل جلالہٗ "۔ زیارتِ قبر و مسجد کے بعد اپنے اخوان کو لے بیٹھے اور ان کے سامنے زیارتِ قبور کے احکام کی تشریح کی اور وضاحت کے ساتھ بتایا کہ زیارتِ شرعیہ اور بدعت میں کیا فرق ہے۔

والد محترم نے مجھ سے بیان کیا کہ محمودیہ کی ایک معزز شخصیت حسن بک ابو سیّد حسنؒ کے مکان پر شیخ حصافیؒ اور وہ (یعنی والد محترم) جمع ہوئے اور بھی احباب و اخوان جمع تھے۔ گھر کی خادمہ، جو ایک بالغ دوشیزہ تھی، مجلس میں قہوہ لے کر آئی۔ اس کے دونوں بازو اور سر بالکل عریاں تھے۔ شیخ نے ناراضگی کی حالت میں اس پر نظر ڈالی اور اُسے سختی کے ساتھ حکم دیا کہ جاؤ اور عریاں حصوں کو ڈھانکو۔ انھوں نے قہوہ پینے سے انکار کر دیا، اور صاحبِ خانہ کے سامنے بڑا مؤثر وعظ کیا جس میں بتایا کہ نوجوان لڑکیوں کے لیے خواہ وہ خادمات ہی ہوں، پردہ فرض ہے، اور انھیں کبھی اجنبی مردوں کے سامنے نہ لایا جائے۔

---

[1] یہ مسجد جامع ازہر کے جوار میں واقع ہے۔ مسجد کے اندر حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کا روضہ ہے۔ تاریخی لحاظ سے حضرت امام حسینؓ کا یہاں لا کر مدفون کیا جانا محلِ نظر ہے۔ (مترجم)

الغرض اس باب میں شیخ موصوف رحمہ اللہ کے مواقف بہت کثیر بھی ہیں اور نکتہ افزا بھی۔ ان کا زندگی بھر ایسا ہی وتیرہ رہا۔ ان کی یہی خوبی تھی جس نے میرے دل میں ان کے بارے میں گرویدگی و عقیدت مندی کا عظیم ولولہ اُبھار دیا۔ اخوان ہمیشہ شیخ کی حسّی کرامات کا چرچا کرتے مگر میں اپنے دل میں ان کرامات کا وہ اثر محسوس نہ کرتا تھا جتنا ان کے اس عملی پہلو کا محسوس کرتا۔ میرا اعتقاد تھا کہ شیخ کو اللہ تعالیٰ نے سب سے عظیم کرامت جو ارزانی فرمائی ہے وہ یہ توفیق و ہمت ہے کہ وہ صحیح بنیادوں پر دعوتِ اسلامی کی اشاعت کرتے رہے ہیں۔ اور پھر یہ غیر معمولی غیرت و حمیّت ہے جو محرمات کے بارے میں ان کے اندر موجزن تھی، اور جس کے فیضان سے وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر جیسا تلخ فریضہ سر انجام دیتے رہے۔ شیخ کے ساتھ میری وابستگی کا آغاز جب ہوا تو اس وقت میری عمر ۱۸ سال سے متجاوز نہ تھی:

شیخ موصوف کے ساتھ میری وابستگی کو ایک واقعہ نے مزید دو آتشہ کردیا۔ میں کتاب " المنھل الصافی فی مناقب حسنین الصافی " کا کئی بار مطالعہ کرچکا تھا۔ چنانچہ اسی دوران میں نے ایک خواب دیکھا کہ میں شہر کے قبرستان میں گیا ہوں۔ وہاں میں نے ایک بھاری بھرکم قبر دیکھی جس پر لرزہ طاری ہے، اور برابر جھول رہی ہے۔ اس کا یہ اضطراب و تزلزل برابر بڑھتا جاتا ہے یہاں تک کہ شق ہوجاتی ہے اور اس میں سے آگ نکلتی ہے جو اس قدر بلند ہوجاتی ہے کہ آسمان کی پنہائیوں کو چھونے لگتی ہے اور پھر یہ ایک مخصوص شکل اختیار کرلیتی ہے، ایک مرد کی شکل، جس کی لمبائی خوفناک ہے اور منظر ہیبت ناک۔ لوگوں کا چاروں طرف سے آکر اس کے گرد ازدحام ہوجاتا ہے۔ وہ مرد بڑی صاف اور واضح آواز میں چلّاتا ہے اور لوگوں سے کہتا ہے:

" اے انسانو —! جو چیزیں تم پر حرام تھیں اللہ نے وہ مباح کردی ہیں، اب تم جو چاہو کرو۔"

میں اس جمِّ غفیر کے وسط میں سے نکل کر اس شخص کا معارضہ کرتا ہوں اور اس کے منہ پر

چیخ کر یہ کہتا ہوں کہ " تو جھوٹ کہتا ہے "۔ لوگ میری طرف ملتفت ہوتے ہیں ۔ میں انھیں کہتا ہوں کہ : " لوگو! یہ ملعون ابلیس ہے ۔ یہ تمہیں تمہارے دین سے ہٹانے اور تمھیں وسوسہ اندازی کرنے کے لیے آیا ہے ۔ اس کی آواز پر کان نہ دھرو اور نہ اس کی کسی بات میں آؤ۔"

وہ شخص غضب آلود ہو جاتا ہے اور مجھ سے کہتا ہے کہ اب ضروری ہے کہ ہم دونوں حاضرین کے سامنے دوڑ میں مقابلہ کریں ۔ اگر تو مجھ سے آگے نکل گیا اور لوگوں کے پاس واپس پہنچ گیا اور میں تجھے نہ پکڑ سکا تو بے شک تو سچا ہے "۔ میں اس کی یہ شرط قبول کر لیتا ہوں اور اس کے آگے انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ دوڑنے لگتا ہوں ۔ لیکن کہاں میرے چھوٹے چھوٹے قدم اور کہاں اس کی لمبی لمبی چوکڑیاں ۔ قبل اس کے کہ وہ مجھے پکڑ لیتا، سامنے ایک کونے سے شیخ حصافی رحمہ اللہ نمودار ہو گئے اور انھوں نے مجھے اپنے سینے سے لگا لیا ۔ اپنے بائیں ہاتھ سے مجھے تھامے رکھا اور دایاں ہاتھ اوپر اٹھا کر اس چھلاوے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بآواز بلند فرمایا : " ہٹ جا اے مردود "۔ چنانچہ وہ دُم دبا کر بھاگ گیا اور کہیں چھپ گیا۔ شیخ بھی چلا گیا ۔ میں لوگوں کے پاس آیا اور اُن سے کہا : " دیکھا تم لوگوں نے ، کس طرح یہ مردود تمہیں دینِ خدا سے گمراہ کرنے لگا تھا "۔ اسی پر میری آنکھ کھل گئی ، اور اب میں سراپا شوق ، سراپا عقیدت اور سراپا انتظار تھا کہ کب سیّد عبدالوہاب الحصافی شیخ حصافی مرحوم کے صاحبزادے تشریف لائیں اور میں ان کی زیارت کروں اور ان سے طریقت و آدابِ طریقت سیکھوں ۔ لیکن وہ اس عرصہ میں تشریف فرما نہ ہوئے۔

حدیثِ قبرستان

حدیثِ قبرستان سے مجھے یاد آگیا کہ روحانی تربیت میں ہمارے دینی بھائی شیخ محمد ابو شوشہ تاجر محمودیہ کا بھی ہم پر بڑا احسان ہے ۔ یہ ہم آٹھ دس لڑکوں کو اکٹھا کر لیتے اور ہمیں قبرستان لے جاتے ۔ وہاں ہم زیارتِ قبور کی سنّت ادا کرتے ۔ اور شیخ بجیلی کی

مسجد میں بیٹھ کر ورد پڑھتے۔ شیخ محمد ابو شوشہ ہمیں صلحاء و اولیاء کی حکایات و احوال سُناتے، جن سے ہمارے دل گداز اور آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے۔ پھر وہ ہمیں کھدی ہوئی قبریں دکھاتے اور ہمیں یاد دلاتے کہ بالآخر ہم اسی تاریک غار کے اندر بسیرا کریں گے۔ بعض اوقات وہ ہم میں سے کسی ایک کو حکم دیتے کہ قبر میں اتر جاؤ اور چند گھڑی وہاں لیٹ کر اپنا انجام یاد کرو۔ قبر کی تاریکی اور قبر کی وحشت کا تصوّر کرو، ابو شوشہ خود بھی زار و قطار روتے اور ہماری آنکھیں بھی اشک بار ہو جاتیں۔ ہم بڑے خضوع و خشوع کے لمحات میں، عجیب ولولے اور حضوریٔ قلب کے ساتھ اور ندامت و عزم کے جذبات میں مستغرق ہو کر توبہ کو تازہ کرتے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ شیخ ابو شوشہ ہم میں سے ہر ایک کی کلائی میں علامتی تاگا باندھ دیتے تاکہ توبہ کی یادگار رہے۔ اور وہ ہمیں سمجھاتے کہ اگر ہم میں سے کسی کے دل میں کبھی بُرائی کا خیال آئے یا شیطان اس پر غلبہ پا رہا ہو تو فوراً اس تاگے کو پکڑ لے اور یاد کرے کہ وہ اللہ تعالےٰ سے سچی توبہ کر چکا ہے، اور اس کی اطاعت گزاری اور ترکِ معصیت کا عہد باندھ چکا ہے۔ شیخ کی اس نصیحت سے ہم بکثرت استفادہ کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر سے نوازے۔

میرا دل برابر شیخ حصافی رحمہ اللہ کے ساتھ اٹکا رہا۔ یہاں تک کہ میں دمنہور کے ٹیچرز ٹریننگ اسکول میں داخل ہو گیا۔ اسی شہر میں شیخ کا مرقد مبارک ہے۔ اور ان کی نامکمل مسجد ہے جس کی صرف بنیادیں اس وقت تک رکھی جا سکی تھیں۔ اور مسجد بعد میں مکمل ہوئی۔ میں تقریباً ہر روز مداومت کے ساتھ ان کی زیارت کو جاتا۔ دمنہور کے حصافی اخوان کی صحبت اختیار کر لی اور مسجد توبہ میں جہاں ان کی محفلِ ذکر منعقد ہوتی ہر شب بلا ناغہ حاضری دینے لگا۔ حصافی اخوان کے میرِ محفل کے متعلق پوچھا۔ معلوم ہوا میرِ محفل کا نام شیخ بسیونی العبد ہے۔ صالح اور پرہیزگار انسان ہیں۔ تجارت کا پیشہ کرتے ہیں۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ شیخ حصافی سے میری بیعت کروا دی جائے۔ انھوں نے میری درخواست

قبول کرلی اور مجھ سے وعدہ کیا کہ جب سیّد عبدالوہاب دمنہور وارد ہوں گے میں آپ کو ان کے سامنے پیش کردوں گا۔ اس وقت تک میں نے راہِ تصوف میں کسی کے ہاتھ پر باقاعدہ بیعت نہ کی تھی بلکہ میں ان لوگوں کی اصطلاح کے مطابق ابھی "مُحِب"[1] تھا۔ مرید نہ تھا۔

سیّد عبدالوہاب ——— اللہ ان کو باعثِ نفع بنائے ——— دمنہور تشریف لے آئے۔ حصافی اخوان نے مجھے فوراً ان کی آمد سے مطلع کردیا۔ میں یہ خبر سُن کر پھولا نہ سماتا تھا۔ میں شیخ لبیبونی کے پاس گیا اور ان سے عرض کیا کہ وہ حسبِ وعدہ مجھے شیخ عبدالوہاب کی خدمت میں لے چلیں۔ چنانچہ وہ مجھے لے گئے۔ رمضان المبارک ۱۳۴۱ھ کی چار تاریخ تھی۔ نمازِ عصر کے بعد ملاقات ہوئی۔ اگر میرا حافظہ درست کہتا ہے تو وہ اتوار کا دن تھا۔ اس ملاقات میں میں نے سیدعبدالوہابؒ سے سلسلۂ حصافیہ وشاذلیہ کی بیعت لی۔ انھوں نے مجھے اس سلسلہ کے تمام اوراد و وظائف کی اجازت مرحمت فرمادی۔

اللہ تبارک و تعالےٰ سیّد عبدالوہاب کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ ان کی صحبت سے میں نے عظیم ترین فوائد سمیٹے۔ سیّد کے دین اور طریقت میں مجھے خیر کے سوا اور کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ ذاتی پہلو سے بھی اور رشد وسلوک کے لحاظ سے بھی وہ بہت سی پاکیزہ خصلتوں سے بہرہ مند تھے اور ان میں منفرد مقام رکھتے تھے۔ لوگوں کے مال وجاہ سے

---

[1] یہ اصطلاح اس شعر سے ماخوذ ہے کہ

احبّ الصّالحین ولست منھم
لعل اللہ یرزقنی صلاحًا

(مجھے صالحین سے محبت ہے: میں خود صالحین میں سے نہیں ہوں۔ شاید اس محبت کی بدولت اللہ مجھے بھی نیکی کی توفیق ارزاں فرمادے)۔ مترجم

مکمل بے نیازی تھی۔ معاملات و مسائل میں غیر معمولی سنجیدگی و اہتمام تھا۔ خواہ وہ تنہا ہوتے یا اخوان و مریدین کے ساتھ ہوتے ہمیشہ اپنے اوقات کو تعلیم و تعلّم یا ذکر و فکر یا طاعات وعبادت کے سوا کسی چیز میں نہ صرف کرتے۔ اخوان کی بڑے احسن طریقے سے رہنمائی فرماتے اور انھیں اخوّت و تفقہ اور اطاعتِ خداوندی کی عملی مشق کراتے۔ مجھے یاد ہے کہ انھوں نے تربیت و تزکیہ کے جو حکیمانہ اسالیب اختیار کر رکھے تھے، ان کی رو سے وہ تعلیم یافتہ اخوان (مریدوں) کو یہ اجازت نہ دیتے تھے کہ وہ عام مریدوں کے سامنے اختلافی مسائل یا مشتبہ مسائل میں زیادہ بحث و مباحثہ کریں، یا ان کے سامنے ملاحدہ، زندیقوں اور عیسائی مشنیریوں وغیرہ کی باتوں کا بار بار چرچا کریں۔ فرماتے:

"اس نوعیت کی باتیں اپنی خصوصی مجلسوں میں کیا کرو اور وہاں ان پر باہمی مذاکرات کیا کرو۔ رہے یہ ناخواندہ لوگ تو ان کے سامنے صرف ایسے اثر انگیز اور عملی مضامین بیان کرو جو ان کو بندگیٔ خدا کی طرف راغب کریں۔ ہوسکتا ہے کہ آپ لوگوں کی گفتگو سے ان میں سے کسی کے دل میں کوئی شبہ بیٹھ جائے اور اس شبہ کا جواب اس کی سمجھ میں نہ آیا ہو۔ اور یوں بلا سبب اس کے عقیدہ میں پراگندگی پیدا ہوجائے، اور تم اس خرابی کا سبب قرار پاؤ۔"

ان کے یہ الفاظ اب تک مجھے یاد ہیں جو انھوں نے اپنی ایک مجلس میں مجھے اور اخ استاذ احمد السکری کو ارشاد فرمائے تھے: مجھے ایسی علامات نظر آرہی ہیں کہ اللہ تعالے لوگوں کے دل تمہاری طرف موڑے گا اور بکثرت انسان تمہارے ساتھ ملائے گا۔ تو خوب سمجھ لو کہ یہ لوگ جو تمہارے گرد جمع ہوں گے، اللہ تعالیٰ تم سے ان کے اوقات کے بارے میں دریافت کرے گا کہ کیا تم نے ان کے اوقات کو مفید کاموں میں صرف کیا یا رائیگاں کر دیا۔ اگر پہلی صورت ہے تو ان لوگوں کو بھی اجر ملے گا، اور ان کی طرح تمہیں بھی۔ اور اگر دوسری صورت ہے تو ان کی گرفت بھی ہوگی اور تمہاری بھی۔ یوں موصوف کے تمام پند و نصائح

خیر و فلاح پر اُکساتے۔ بہر حال ہمیں ان کے اندر خیر و صلاح کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں ملی۔
وماشھدنا الا بما علمنا وما کنا للغیب حفظین۔

اسی زمانے میں ہمیں یہ سوجھی کہ ہم محمودیہ کے اندر ایک اصلاحی تنظیم کی تاسیس کریں۔ یہ تنظیم "جمعیت حصافیہ خیریہ" (حصافی فلاحی تنظیم) تھی۔ محمودیہ کے معروف تاجر احمد آفندی السکری اس کے صدر منتخب ہوئے، اور میں سیکریٹری۔ اس تنظیم نے دو اہم میدانوں میں اپنی مساعی مرکوز کر دیں۔ پہلا میدان یہ کہ اخلاق حسنہ کی دعوت، ترقی پذیر منکرات و محرمات کا استیصال، مثلاً شراب، جوا اور سوگ کی بدعات۔ دوسرا میدان یہ کہ "کرسچین بائیبل مشن" کا سدباب جو شہر میں نازل ہو کر اپنے پاؤں جما چکا تھا۔ اس مشن کی روحِ رواں تین نوجوان لڑکیاں تھیں جن کی سربراہ مسز ویٹ تھی۔ اس مشن نے علاج، کشیدہ کاری کی تربیت، یتیم بچوں اور بچیوں کی پرورش کی آڑ میں عیسائیت کی تبلیغ شروع کر رکھی تھی۔ حصافی فلاحی تنظیم نے مذکورہ مشن کی سرگرمیوں اور مقاصد کا زبردست مقابلہ کیا جس کی ہر شخص نے داد دی۔ آگے چل کر "اخوان المسلمون" کی جماعت نے اس کشمکش میں حصافی تنظیم کی جانشینی اختیار کی۔

"اخوان المسلمون" کی جمعیتوں کے قیام اور ملک بھر میں ان کی توسیع تک سید عبدالوہاب حصافی کے ساتھ ہمارے روابط نہایت خوشگوار صورت میں استوار رہے۔ مگر بعد میں "اخوان المسلمون" کے بارے میں اُن کا نقطۂ نظر ہمارے نقطۂ نظر سے مختلف ہو گیا۔ اور ہم میں سے ہر ایک اپنی اپنی رائے پر گامزن ہو گیا۔ مگر ہم آج بھی سید موصوف کے بارے میں احسان مندی اور احترام کے وہ جذبات دل میں پنہاں رکھتے ہیں جو ایک عاشق و مخلص مرید اپنے صالح، متقی اور صاحبِ علم شیخ کے بارے میں رکھ سکتا ہے۔ موصوف نے نُصح و وعظ کا فرض انجام دیا۔ مخلصانہ نُصح و وعظ، رشد و ہدایت کی خدمات انجام دیں بہترین رشد و ہدایت۔

تصوّف کے بارے میں میری رائے

یہ بات مفید رہے گی کہ میں اپنی ڈائری میں دعوت اسلامی کی تاریخ میں تصوّف اور سلسلہ ہائے طریقت کے کردار کے بارے میں اپنے جذبات قلم بند کردوں۔ تصوّف کا آغاز کیونکر ہوا، اس کے اثرات ونتائج کیا رہے، اسلامی معاشرے کے اندر سلسلہائے طریقت کس حدتک نافع رہے۔ میں اس موضوع پر عالمانہ احاطہ کرنے کی کوشش نہیں کرونگا۔ اور نہ اصطلاحی حقائق کی گہرائیوں میں اُترنے کی کوشش کروں گا۔ میں "یادداشتوں" کو قلمبند کرنے بیٹھا ہوں۔ یادداشتوں میں دل کی برجستہ واردات لکھی جاتی ہیں۔ اور ان باتوں کو ضبطِ تحریر کیا جاتا ہے جو ذہن کے حاشیوں میں گردش کرتی ہیں۔ اور احساسات وجذبات کو حرکت بخشتی ہیں۔ اگر میرے خیالات درست ہوئے تو یہ توفیقِ الٰہی کا فیضان ہوگا۔ اور خدا ہی حمد و ستائش کا سزاوار ہے۔ اور اگر درست نہ ہوئے تو راقم کا ارادہ خیر وصلاح کے سوا کچھ نہیں ہے۔ وللہ الامر من قبل ومن بعد۔

پہلی صدی کے آغاز میں جب اسلامی ریاست کی حدود دور دور تک پھیل گئیں، فتوحات کی کثرت ہوگئی، ہرطرف سے خلقِ خدا مسلمانوں کی جانب رجوع کرنے لگی، ہر قسم کے اموال وثمرات مسلمانوں کے خزانے میں داخل ہونے لگے۔ اور خلیفۃ المسلمین آسمان پر لکّہ ابر کو دیکھ کر یہ کہہ اٹھا "مشرق کا رخ کر یا مغرب کا، جہاں بھی تو برسے گا وہاں کا خراج میرے پاس آئے گا"۔ اب یہ فطری امر تھا کہ مسلمان دنیا کی طرف مائل ہوجاتے، دنیا کی نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے، ان کی حلاوت وثمرات سے شادکام ہوتے، کبھی اعتدال ومیانہ روی کے ساتھ اور کبھی اسراف وتبذیر کے ساتھ۔ اور یہ بھی فطری بات تھی کہ جب معاشرہ نبوّت کے روشن دَور کی جفاکشی وسادگی کو تج کر دنیاوی خوشحالی اور تن آسانی کی طرف لپک رہا تھا تو اس اجتماعی تبدیلی کے سامنے اہلِ صلاح وتقویٰ اور اربابِ علم ونظر میں سے ایک باا‌ثر جماعت دعوت وتبلیغ کے لیے بروئے کار آجاتی اور

دنیا کی متاع ناپائیدار کے ساتھ لوگوں کی محبت کو کم کرتی ہے۔ اور انہیں آخرت یاد دلاتی
کہ "ان الدار الاخرۃ لھی الحیوان لوکانوا یعلمون" دعوت و اصلاح کا یہ کام جو لوگ
کرنے اٹھے ان میں سب سے پہلی شخصیت جلیل القدر امام و واعظ حسن بصریؒ کی ہے۔
پھر ان کے بعد اُن جیسے بکثرت داعیانِ حق اور صلحائے امّت اُٹھے۔ یہ گروہ لوگوں کے
اندر اسی حیثیت سے معروف رہا کہ یہ ذکر اللہ اور خوفِ آخرت کی دعوت دیتا ہے، دنیا
کے بارے میں زہد و قناعت کی تلقین کرتا ہے اور دلوں کو طاعتِ خداوندی اور تقویٰ
کی تربیت سے منور کرتا ہے۔

مگر ان صحیح اور پاکیزہ امور کے ساتھ بھی وہی معاملہ پیش آیا جو دوسرے اسلامی
علوم و افکار کے ساتھ پیش آیا۔ چنانچہ ان امور نے بھی باقاعدہ ایک علم کی شکل اختیار
کرلی اور اس کا موضوع یہ ٹھیرا کہ یہ وہ علم ہے جو انسان کے اخلاق و کردار کو ہموار کرتا ہے،
اور اس کے لیے زندگی کا ایک مخصوص طرز وضع کرتا ہے۔ اس مخصوص طرز کے مراحل ذکر،
عبادت اور معرفتِ خداوندی ہیں۔ اور اس کی غایت جنّت کا حصول اور اللہ کی رضاجوئی
ہے۔ علوم تصوّف کی یہ قسم جسے میں "علوم تربیت و سلوک" کا نام دیتا ہوں۔ بلاشُبہ
اسلام کا لبِ لباب اور اس کا مغز و جوہر ہے، اور بلاشُبہ صوفیائے کرام نے اس علم کی
بدولت قلوب کے علاج و اصلاح اور تہذیب و تزکیہ میں وہ اونچا مقام حاصل کرلیا ہے
کہ دوسرے ماہرینِ تربیت و اصلاح اس مرتبے تک ہرگز نہیں پہنچ سکے۔ صوفیار نے اس
اسلوب کی مدد سے لوگوں کو اللہ کے بتلائے ہوئے فرائض ادا کرنے، اس کے نواہی سے
اجتناب کرنے اور اس کے ساتھ سچی توجہ رکھنے کا ایک عملی نمونہ اور منصوبہ بتایا اور اس پر چلایا۔
گو اکثر و بیشتر حالات میں یہ منصوبہ مبالغہ آرائی سے محفوظ نہیں رہا اور ان ادوار کے تقاضوں
سے متاثر ہوتا رہا جن سے یہ برسرِ پیکار رہا ہے۔ مثلاً سکوت میں مبالغہ، فاقہ کشی میں مبالغہ،
بے خوابی میں مبالغہ، گوشہ نشینی میں مبالغہ، ان تمام اعمال کی دین میں اصل اور بنیاد موجود ہے۔

مثلاً سکوت کی اصل لغویات سے اعراض ہے، فاقہ کشی کی اصل نفلی روزہ ہے۔ بے خوابی کی اصل قیام اللیل ہے، اور عزلت گزینی کی اصل نفس کو تکلیف دہ اشیاء سے روکے رکھنا اور اس کی صحیح دیکھ بھال کرنا ہے۔ اگر ان تمام اُمور کا عملی نفاذ صرف ان حدود تک باقی رہتا جو شارع نے مقرر کی ہیں تو یہ موضوع سراپا خیر و برکت ہوتا۔

لیکن صوفی ازم علم سلوک و تربیت تک محدود نہیں رہا ——— اور اگر اپنی اس حد تک قائم رہتا تو اس کے لیے بھی بہتری تھی اور انسانوں کے لیے بھی ——— مگر وہ بعد کے ادوار میں اپنی حدود سے تجاوز کر گیا۔ اور ذوق و وجدان کی گتھیوں کو سلجھانے لگ گیا اور اس میں فلسفہ و منطق اور گزشتہ اقوام کے باقی ماندہ افکار و نظریات کی آمیزش ہو گئی۔ اور اس نے دین کے اندر ان باتوں کو گھول دیا جن کا دین سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ اور ہر زندیق و ملحد، کجرو اور بدعقیدہ انسان کے سامنے ایسے وسیع مواقع فراہم کر دیئے کہ وہ تصوّف کے نام پر، زہد و تقشف کی تبلیغ کی آڑ میں اور روحانی جلا حاصل کرنے کے شوق کے پردے میں دین کو مسخ کرنے کا کام کرتا ہے۔ اور یہ معاملہ یہاں تک پہنچ گیا کہ اس پہلو پر جو تحریری یا روایاتی ذخیرہ تیار ہوا وہ اس قدر ناقابل اعتماد تھا کہ دینِ حق کا فہم رکھنے والوں اور دین کو صاف و شفّاف دیکھنے کے خواہش مندوں کے لیے ضروری ہو گیا کہ وہ اسے اپنی باریک بیں نگاہ کی سان پر چڑھائیں اور اس میں سے کھرے اور کھوٹے کو الگ کر دکھائیں۔

اس کے بعد صوفی ازم کی عملی تشکیلات کا دور آیا۔ چنانچہ صوفیا کے متعدد فرقے اور سلسلے وجود میں آ گئے۔ اور ہر ایک نے اپنے مخصوص اسلوب تربیت کے تحت اپنا الگ فرقہ تشکیل دے دیا۔ آگے چل کر سیاست نے اس میدان میں دراندازی شروع کر دی، اور اس نے صوفیاء کی جماعتوں کو، ضرورت پیش آنے پر اپنی اغراض کا سہارا بنایا۔ چنانچہ کبھی ان فرقوں کو عسکری بنیادوں[۱] پر منظم کیا گیا اور کبھی پرائیویٹ جمعیتوں کی شکل دی گئی۔ اور آخر کار تصوّف نے مختلف مراحل عبور کرتے ہوئے وہ آخری تصویر اختیار کر لی جو

(حاشیہ ص ۱۳۳ پر)

آج ہمارے سامنے ہے۔ اس تصویر میں تصوّف کی طویل تاریخ میں اُبھرنے والے مختلف الوان کے باقی ماندہ نشانات پائے جاتے ہیں۔ اور آج مصر کے اندر اس نظریے کی نمائندگی مختلف سلسلۂ ہائے طریقت کے شیوخ اور ان کے مریدوں وہمنواؤں کے ذریعہ ہو رہی ہے۔

اس امر میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ تصوّف وطریقت بہت سے ممالک میں اسلام کی اشاعت اور اسلام کو ایسے دور دراز گوشوں تک پہنچانے کا بہت بڑا عامل رہا ہے، جہاں صوفیا کرام کی کوششوں کے بغیر اسلام نہ پہنچ سکتا تھا۔ مثلاً افریقہ کے مختلف شہروں اور صحراؤں میں اور وسط افریقہ میں اسلام کا داخلہ اہلِ تصوّف کی بدولت ہی ہوا بلکہ آج تک ہو رہا ہے۔ ایشیا کے بہت سے ممالک میں بھی یہی صورتِ حال پیش آئی ہے۔ نیز یہ بات بھی شک وشبہ سے بالا ہے کہ تربیت وسلوک کے بارے میں تصوّف کے قواعد وضوابط پر عمل درآمد نفس وقلب پر بڑا مضبوط اثر پیدا کرتا ہے۔ اس باب میں صوفیاء کا کلام وہ جولانیاں دکھاتا ہے جو کسی دوسرے انسان کے کلام کو نصیب نہیں ہیں۔ لیکن تصوّف کے اندر مختلف افکار و نظریات کی آمیزش نے اس کے بیشتر فوائد کو ضائع اور برباد کر دیا۔

مصلحینِ امّت کا فرض ہے کہ ان صوفیانہ گروہوں کی اصلاح وتطہیر کے لیے طویل سوچ بچار کریں۔ ان لوگوں کی اصلاح نہایت سہل اور آسان ہے۔ ان کے اندر اصلاح قبول کرنے کی مکمل استعداد موجود ہے، بلکہ شاید یہ تمام انسانوں سے زیادہ اصلاح سے نزدیک تر ہوتے ہیں۔ بشرطیکہ ان کو صحیح طور پر اصلاح کی جانب متوجہ کیا جائے۔ اس کام کو سرانجام

(حاشیہ صفحۂ گذشتہ) ترکی کے عثمانی دور میں ینی چری کا نظام دراصل تصوف پر قائم تھا، جسے بعد میں باقاعدہ ایک فوجی تنظیم میں بدل دیا گیا۔ (مترجم)

دینے کے لیے صرف اتنا کافی ہے کہ کچھ صالح و باعمل علما اور مخلص و صادق مبلّغین دوسرے کام سے فارغ ہو کر صرف ان گروہوں کے حالات کا جائزہ لیں اور تصوّف کے علمی ذخیرے سے استفادہ کریں اور جو خرابیاں اس میں شامل ہو چکی ہیں انھیں صاف کریں، اور اس کے بعد اس کوچے کے راہ نوردوں کی صالح قیادت کا انتظام کریں۔

مجھے یاد ہے کہ سیّد توفیق بکری رحمہ اللہ نے اس مسئلے پر خوب غور و خوض کیا تھا، اور مشائخ کرام کے متعلق علمی اور عملی پہلو سے تحقیقی کاوش کی تھی اور پھر اس موضوع پر ایک کتاب مرتّب کی تھی۔ مگر ان کا یہ منصوبہ پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔ اور ان کے بعد دوسرے اہلِ علم نے اس طرف دھیان نہیں دیا۔ اس سے مجھے یہ بھی یاد آیا کہ شیخ عبداللہ عفیفیؒ بھی اس پہلو میں بہت دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ لیکن یہ سوچ محض نظری حد تک تھی کسی عملی اقدام کی اس میں علامت موجود نہ تھی۔ اگر ازہر کی علمی طاقت اور سلسلۂ صوفیا کی روحانی طاقت اور اسلامی تحریکوں کی عملی طاقت تینوں متحد و ہم آمیز ہو جاتیں تو یہ قوم بینظیر امّت کا رُوپ دھار لیتی۔ ایسی امّت جو دوسروں کی رہنما ہوتی نہ کہ دوسروں کی پیروکار، دوسروں کی قائد ہوتی نہ کہ دوسروں کی مطیع، دوسروں پر اثر انداز ہوتی نہ کہ دوسروں سے اثر پذیر۔ اور وہ امّت اس موجودہ انسانی جمعیت کو سیدھی راہ سے ہمکنار کرتی۔ مگر وہی ہوتا ہے جو خدا چاہتا ہے۔

دمنہور کے دن

دمنہور کا زمانہ اور ٹیچرز ٹریننگ اسکول کے ایام تصوّف و عبادت کے جذبے میں استغراق کا زمانہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ انسان کی زندگی کئی مرحلوں میں منقسم ہوتی ہے انہی مرحلوں میں سے ایک مرحلہ یہ تھا جو مصری بغاوت[1] کے فوراً بعد ۱۹۲۰ء سے لے کر

---

[1] ۱۹۱۹ء میں مصری قوم نے سعد زغلول کی قیادت میں انگریزی تسلّط کے خلاف عام بغاوت کر دی تھی اور مصر کی آزادی کا مطالبہ کیا تھا۔ اس بغاوت کے نتیجے میں برطانیہ نے مصر کے استقلال کو تسلیم کر لیا تھا۔ (مترجم)

۱۹۲۳ء کے تین سالوں پر مشتمل ہے۔ میری عمر چودہ سال سے چند ماہ کم تھی جب یہ مرحلہ شروع ہوا اور سترہ سال سے چند ماہ کم کی عمر تھی کہ یہ مرحلہ ختم ہوگیا۔ میرے لیے یہ مرحلہ تصوف وعبادت میں انہماک کا مرحلہ تھا۔ مگر بایں ہمہ یہ مرحلہ ان قومی فرائض میں عملی حصہ لینے سے خالی نہیں گزرا جو طلبہ کے کندھوں پر آپڑے تھے۔

جب میں دمنہور میں وارد ہوا تو حصافی فکر سے سرتاپا لبریز تھا۔ دمنہور ہی میں بانیٔ سلسلہ سید حسنین الحصافی کی قبر مبارک تھی اور شیخ کے بڑے بڑے مریدوں کا چیدہ گروہ وہاں موجود تھا۔ پس یہ قدرتی امر تھا کہ میں اس ماحول میں بالکل کھو جاتا، اور اس رجحان میں کلیتہً مستغرق ہوجاتا اور اس استغراق کو دو آتشہ اس بات نے کردیا کہ خود ہمارے استاذ الحاج حلمی سلیمان ——— جو ابھی تک دمنہور میں بطور مدرس کام کر رہے ہیں ——— عبادت گزاری، راست بازی، تقویٰ اور آداب طریقت کی پابندی کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ اسی سبب سے میرے اور ان کے درمیان خصوصی طور پر روحانی روابط استوار ہوگئے۔ اور ان کے رفیق کار اور یار غار استاذ شیخ حسن خزبک رحمہ اللہ ——— یہ بھی دمنہور میں استاذ تھے ——— بکثرت اپنے مکان پر علمی اور تبلیغی اجتماعات منعقد کرتے رہتے تھے، اور رمضان المبارک میں مسجد الجیش کے اندر نماز فجر سے پہلے امام غزالیؒ کی احیاء العلوم کا درس دیتے تھے۔ الحاج حلمی ان اجتماعات میں مجھے اپنے ساتھ لے جاتے۔ اس طرح میں کم عمر طالب علم ہونے کے باوجود اپنے آپ کو اکابر کی معیت میں پاتا۔ جن میں وہ اساتذہ بھی شامل تھے جو مجھے اسکول میں پڑھاتے تھے اور ان کے علاوہ اور بھی بڑے بڑے اہل علم وفضل بزرگ تھے۔ یہ تمام اکابر مجھے اور مجھ جیسے دوسرے نوجوانوں کو مسلسل تھپکی دیتے رہتے کہ ہم اسی راستے پر ——— بندگیٔ خدا کے راستے پر ——— رواں دواں رہیں۔ یہ تھے وہ تمام محرکات جنہوں نے صوفیانہ مشاغل ومراسم کے

ساتھ میری دلچسپی پیدا کی اور ان پر مجھے کاربند رکھا۔

میں وہ طویل بحثیں ہرگز فراموش نہیں کر سکتا، جو ہم اپنے استاذ شیخ عبد الفتاح ابو علام کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ موصوف اسکول میں فقہ، تفسیر اور حدیث کے مدرس تھے اور یہ بحثیں تب ہی چھڑ تیں جب تصوّف کے سلسلوں اور اولیاء وصوفیاء پر اعتراضات کیے جانے لگتے۔ استاذ موصوف بحث و تکرار کرتے کرتے آخر میں مسکرا دیتے اور مجھے طاعت و زہد پر کاربند رہنے کی ترغیب دیتے اور تلقین فرماتے کہ میں گہرا مطالعہ کروں اور اسلامی فقہ کی حکمتوں اور اس کی تاریخ میں وسیع نظر پیدا کروں، اور مختلف فقہی مذاہب اور کلامی فرقوں اور تصوّف کے سلسلوں کی تاریخ پر عبور حاصل کروں تاکہ اصل حقیقت مجھ پر آشکارا ہو۔ اور حقیقت بحث و تحقیق کے بغیر ہاتھ نہیں آتی۔ میرے اور استاذ کے درمیان اکثر و بیشتر اختلاف رائے رہتا مگر اس کے باوجود میں محسوس کرتا تھا کہ استاذ کا جذبۂ شفقت پوری طرح شامل حال ہے اور میری رہنمائی کے لیے ان کے اندر سچی خواہش پائی جاتی ہے۔ ہماری بحث دلائل پیش کرنے اور حق شناسی کی خواہش سے آگے نہ بڑھتی۔

مسجد الجیش کی راتیں

دمنہور کی مسجد الجیش اور فلاقہ پل کے جوار میں واقع مسجد حطاطبہ کی راتیں بھی کبھی فراموش نہ ہوں گی۔ رمضان المبارک میں نماز فجر سے پہلے شیخ حسن خزبک کے درس میں حاضری ہوتی تھی۔ اب ذوق و شوق کو اور مہمیز لگی۔ اور اسی مسجد میں حصافی اخوان کے ایک گروہِ صلحاء کے ہمراہ پوری پوری راتیں اعتکاف میں گزرنے لگیں۔ نماز عشاء پڑھ کر ہم شیخ محمد عامر یا استاذ حسین فوزی افندی (جو آج کل قاہرہ میں مقیم ہیں) کے ساتھ تھوڑا سا کھانا کھاتے اور پھر کچھ دیر تک ذکر الٰہی میں محو ہو جاتے۔ اور نماز فجر تک اس میں منہمک رہتے۔ پھر وظائف و اوراد کا سلسلہ شروع کر دیتے۔ اس کے

بعد اسکول کا رُخ کر لیتے۔ طلبا، درس و وعظ کی طرف، اور غیر طلبہ کام دھندے کی طرف۔

اکثر ایسا بھی ہوتا کہ جب ہم گھروں میں ہوتے تو رات کو فجر سے بہت پہلے بیدار ہو جاتے۔ اتنا پہلے کہ ابھی مسجدوں کے دروازے نہ کھلے ہوتے۔ چنانچہ مسجد حطاطبہ میں چلے جاتے۔ جو نہر حطاطبہ کے کنارے فُلاقہ پُل کے پاس واقع تھی۔ فجر سے پہلے تک وہاں عبادت گزاری میں مشغول رہتے اور پھر تیز گامی کے ساتھ مسجد الجیش آتے تاکہ نماز فجر کی جماعت میں شریک ہو سکیں۔

اولیاء اللہ کی زیارتیں

جمعہ کے جن ایّام میں ہم دمنہور میں ہوتے ان میں اکثر ہم دمنہور کے قرب و جوار میں کسی نہ کسی ولی کی زیارت کا پروگرام بنا لیتے۔ چنانچہ بعض اوقات اسی غرض کے لیے ہم وسوق جاتے۔ نماز فجر کے فوراً بعد پا پیادہ چل پڑتے اور آٹھ بجے صبح ہی ہم وہاں پہنچ جاتے۔ وسوق بیس کیلومیٹر کے فاصلے پر ہے جسے ہم تین گھنٹوں میں طے کر لیتے۔ مراسم زیارت ادا کرتے۔ اور پھر نماز جمعہ پڑھتے۔ اور پھر دوپہر کا کھانا تناول کر کے کچھ دیر کے لیے استراحت کرتے۔ نماز عصر پڑھ کر وہاں سے اُلٹے پاؤں دمنہور لوٹ آتے، اور تقریباً مغرب کے وقت دمنہور میں داخل ہو جاتے۔ کبھی کبھی ہم عزبۃ النوام کی جانب نکل جاتے۔ وہاں شیخ سنجر کا مقبرہ ہے۔ یہ بزرگ طریقۂ حصافیہ کے خاص اور چیدہ لوگوں میں سے تھے، اور زہد و نیکوکاری میں مشہور تھے۔ وہاں ہم پورا دن ٹھیرے رہتے اور رات کو واپس لوٹتے۔

سکوت و گوشہ نشینی کے ایّام

چند ایسے ایام ہم نے مخصوص کر رکھے تھے جن میں سکوت اور انسانوں سے بُعد کی نذر مانتے۔ ان ایام میں ہم میں سے ہر ایک دوسرے سے کوئی کلام نہ کرتا۔ اور اگر

کلام کی ضرورت پیش آتی تو اللہ کے ذکر یا قرآن کی کسی آیت کو ذریعۂ اظہار بناتا۔ اسکول کے طلبہ اپنی عادت کے مطابق ہماری اس حالت کو چھیڑ چھاڑ کے لیے مناسب موقع تصور کرتے اور اسکول کے پرنسپل یا اساتذہ کے پاس جاکر یہ اطلاع کرتے کہ فلاں طالبعلم کی زبان گنگ ہوگئی ہے۔ چنانچہ استاذ آکر صورتِ حال دریافت کرتا۔ اور ہم اُسے قرآن کریم کی کوئی آیت پڑھ کر سُنا دیتے اور وہ واپس ہوجاتا۔ یادش بخیر، استاذ محترم شیخ فرحات سلیم رحمہ اللہ ہماری اس حالت (زبان بندی) کا بڑا احترام کرتے، اور طلبہ کو ڈانٹ ڈپٹ کرتے رہتے۔ اور دوسرے اساتذہ کو بھی ہدایت فرماتے کہ جب ہم روزۂ سکوت میں ہوں تو سوالات کے ذریعہ ہمیں مبتلائے حرج نہ کیا جائے۔ اساتذہ یہ بخوبی جانتے تھے کہ ہمارا یہ طریقہ جوابات سے فرار یا امتحان سے خلاصی پانے کی خاطر نہیں ہے۔ اس لیے کہ ہم ہمیشہ اسباق میں دوسروں سے سبقت لے جاتے تھے اور اسباق کو مکمل طور پر از بر رکھتے تھے۔ بہر حال ہم اس طریقے پر عمل پیرا رہے۔ یہ جانے بغیر کہ اس بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے۔ ہماری یہ خاموشی نفس کی تادیب اور لغویات سے فرار کے لیے تھی، اس سے ہم قوّتِ ارادہ کو مضبوط کرتے تھے تاکہ انسان نفس پر حکومت کرے نہ کہ نفس انسان پر حاکم بنے۔

ہماری یہ کیفیت بعض اوقات بہت ترقی کر جاتی۔ یہاں تک کہ انسانوں سے نفرت کا جذبہ بھڑک اُٹھتا جو ہمیں عزلت اور قطع تعلقات پر برانگیختہ کر دیتا۔ مجھے یاد ہے کہ بعض دوستوں کے خطوط مجھے ملتے تھے مگر میں انھیں کھولنے اور پڑھنے کی کوشش نہ کرتا۔ بلکہ انھیں جُوں کا تُوں پھینک دیتا۔ محض اس خدشہ کے پیش نظر کہ ان میں کوئی نئی چیز دامنِ دل کے لیے کانٹا بننے والی نہ ہو۔ جب کہ صوفی کو ہر بوجھ سے ہلکا ہونا چاہیے۔ اس پر واجب ہے کہ وہ اللہ کے ماسوا ہر چیز سے قطع تعلق کرے اور جہاں تک اس کے بس میں ہو اس راہ میں پورا پورا مجاہدہ کرے۔

مدرسہ میں اسلامی شعائر کی پابندی

یہ کیفیت جو اکثر اوقات مجھ پر طاری ہوجاتی اس کے باوجود دعوت و تبلیغ کا جذبہ بھی اکثر وبیشتر غالب آجاتا۔ ظہر اور عصر کی اذان میں مدرسہ کی مسجد میں دیتا۔ اذان دینے کے لیے مجھے ٹیچر سے اجازت لینی پڑتی تھی، کیونکہ عصر کی نماز کے وقت ہمارا ایک درس (پیریڈ) ہوتا تھا اور یہ بات میرے لیے سخت موجب حیرت تھی کہ ہیں تو یہ اسلامی مدرسے مگر ان میں تدریس کا نظام نماز کے اوقات سے متصادم ہوتا ہے۔ بعض استاذ تو مجھے خوشی خوشی یہ اجازت دے دیتے اور بعض دوسرے نظم کی پابندی کو ترجیح دیتے۔ میں ان سے صاف عرض کر دیتا کہ "لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق" (خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت جائز نہیں ہے)۔ میں اُن سے اس موضوع پر اتنی تلخ بحث کرتا کہ وہ بحث سے جان چھڑانے اور مجھ سے نجات پانے کے لیے ناچار مجھے اجازت دے دیتے۔ ظہر کے وقت بھی گھر نہ جاتا تھا۔ بلکہ اس وقفہ میں بھی میرا پڑاؤ مدرسہ کی مسجد یا مدرسہ کا صحن ہوتا اور رفقائے مدرسہ کو نماز کے لیے پکارتا۔ نماز ظہر ادا کرنے کے بعد میں برادر عزیز استاذ محمد شریف ——— محکمۂ تعلیم کے موجودہ مدرس ——— کے پاس بیٹھ جاتا۔ ہم دونوں قرآن کریم کا ورد کرتے۔ وہ پڑھتے تو میں سُنتا اور میں پڑھتا تو وہ سنتے۔ اسی دوران میں کلاسیں لگ جاتیں۔

یونیفارم کا مسئلہ

مجھے یاد ہے، ایک روز میں ٹیچرز ٹریننگ اسکول کے پرنسپل کے کمرے میں گیا، تاکہ میں غیر حاضر طلبہ کی فہرست ان کے حوالے کروں۔ کیونکہ کلاس کے اندر یہ کام میرے ہی سپرد تھا۔ پرنسپل صاحب کے کمرہ میں ڈائرکٹر آف ایجوکیشن استاذ سید راغب تشریف فرما تھے ——— جو سال رواں کے آغاز میں وزارت تعلیم میں اسسٹنٹ کنٹرولر کے منصب پر فائز ہوچکے ہیں ——— ڈائرکٹر صاحب

کی نگاہ میرے لباس پر پڑ گئی۔ میں نے اس وقت عمامہ، جس کا ایک پلّو پیچھے کندھوں کے درمیان لٹک رہا تھا سر پر باندھ رکھا تھا۔ جوتی ویسی ہی جو حج کے دوران بحالت احرام پہنتے ہیں، اور ڈھیلا کرتہ جس پر سفید ردا بھی پہن رکھا تھا۔ ڈائرکٹر نے مجھ سے پوچھا کہ تم نے ایسا لباس کیوں پہن رکھا ہے؟ میں نے جواب دیا کہ: "اس لیے کہ یہ سنّت ہے"۔ اس نے کہا: "کیا تم نے دوسری تمام سنّتیں قائم کر لی ہیں اور صرف یہ ایک لباس والی سنّت ہی باقی رہ گئی تھی"؟

میں نے عرض کیا: "نہیں، دوسری سنّتیں کہاں پوری ہو رہی ہیں۔ ہم اس معاملے میں بڑی کوتاہی کے مرتکب ہیں۔ لیکن جتنا کچھ ہم سے بن سکتا ہے وہ تو کر رہی رہے ہیں"۔ ڈائرکٹر صاحب نے فرمایا: "لیکن یہ نرالا روپ اختیار کر کے تم نے مدرسہ کے نظم کو توڑا ہے"۔ میں نے کہا: "جناب من یہ کیسے؟ مدرسہ کا نظم ہے باقاعدگی سو میں ہرگز اسباق میں غیر حاضری نہیں کرتا، مدرسے کا نظم ہے اچھا کردار اور اخلاق، سو الحمدللہ تمام اساتذہ مجھ سے خوش ہیں۔ مدرسے کا نظم ہے تعلیم اور محنت۔ چنانچہ میں اپنے فریق میں اوّل ہوں۔ پھر نظم مدرسہ کی پامالی کیسے ہوئی"؟ ڈائرکٹر صاحب کہنے لگے:

"میاں جب تم یہاں سے فارغ ہو کر نکلو گے اور اپنے اسی یونیفارم پر بضد رہو گے تو ضلعی تعلیمی ڈائرکٹوریٹ تمہیں مدرس بھرتی کرنے کی منظوری نہیں دے گا، تاکہ طلبہ کے لیے یہ منظر مضحکہ خیزی اور اچنبھے کا باعث نہ بنے"۔ میں نے عرض کیا: بہرحال ابھی وہ وقت نہیں آیا، جب یہ وقت آئے گا تو ڈائرکٹوریٹ بھی اپنے فیصلے میں آزاد ہو گا۔ اور میں بھی آزاد ہو گا۔ روزی ڈائرکٹوریٹ کے ہاتھ میں ہے نہ وزارت کے ہاتھ میں۔ یہ صرف خدا کے ہاتھ میں ہے۔ ڈائرکٹر صاحب چُپ ہو گئے، پرنسپل صاحب گفتگو میں دخیل ہوئے۔ اور ڈائرکٹر صاحب سے میرا بہت اچھے لفظوں میں تعارف کرایا۔ مجھے واپس

کلاس میں بھیج دیا ۔ چنانچہ میں کمرے سے نکل آیا، اور یوں بخیر وعافیت یہ مسئلہ ختم ہوگیا۔

قومی تحریک آزادی کا ظہور

۱۹۱۹ء کا سال مصر کی مشہور بغاوت کا سال ہے۔ اس وقت میں محمودیہ کے کے اعدادی اسکول کا طالب علم تھا۔ تیرہ سال کی عمر تھی ۔ ابھی تک میری آنکھوں کے سامنے وہ مناظر گھوم رہے ہیں کہ اس دور میں کس طرح عظیم الشان مظاہرے ہو رہے تھے ۔ کس طرح وہ ہمہ گیر ہڑتالیں ہورہی تھیں جو ایک کونے سے لے کر دوسرے کونے تک پورے شہر کو لپیٹ میں لے رہی تھیں۔ شہر کے اعیان و معززین مظاہروں کی قیادت کر رہے ہوتے تھے ۔ انھوں نے جھنڈے تھام رکھے ہوتے تھے اور اس جہاد میں وہ ایک دوسرے سے مسابقت کر رہے ہوتے تھے ۔ وہ دلنشین ترانے ابھی تک میرے لوحِ ذہن پر منقش ہیں جنہیں مظاہرین نہایت جذبہ و جوش سے پڑھتے تھے ۔ مثلاً :

حب الاوطان من الایمان وروح اللہ تنادینا — وطن سے محبت تقاضائے ایمان ہے اللہ کا فرشتہ ہمیں ندا دے رہا ہے

ان لم یجمعنا الاستقلال ففی الفردوس تلاقینا — اگر آزادی کے سائے میں ہم جمع نہ ہوسکے تو جنت الفردوس میں تو ضرور ملاقات ہوگی۔

انگریز سپاہیوں کے منظر بھی میرے حافظے میں محفوظ ہیں ۔ یہ سپاہی بستی میں آوارد ہوتے اور بستی میں جگہ جگہ کیمپ لگا لیتے ۔ اور ان میں سے کوئی نہ کوئی بستی کے کسی باشندے سے اُلجھ جاتا اور اپنی چرمی پیٹی لیے ہوئے اس کے پیچھے دوڑتا۔ اور جب وہ باشندہ انگریز کو تنہا پا لیتا تو اس پر ٹوٹ پڑتا اور اُسے خوب زدوکوب کرتا اور اسے واپس بھگا دیتا اور وہ ناکام و نامراد مُنہ بسورے واپس کیمپ میں چلا جاتا ۔ مجھے نیشنل گارڈ (الحرس الاھلی) بھی یاد ہے جسے بستی کے لوگوں نے اپنے طور پر

منظم کیا تھا۔ نیشنل گارڈ کے رضا کار باری باری کئی کئی راتیں پہرہ دیتے تاکہ برطانوی فوجی گھروں میں نہ آگھسیں اور لوگوں کی عزتیں نہ پامال کریں۔

ان تمام ہنگاموں میں بحیثیت طالب علم ہمارا صرف اسی قدر حصہ ہوتا تھا کہ ہم گاہے گاہے ہڑتال کر دیتے، مظاہروں میں شریک ہوجاتے، وطن کے مسئلہ پر اور وطن کے حالات وتغیرات کے موضوع پر لوگوں کی تقریریں سنتے۔

چند یادیں اور اشعار

انہی دنوں کی بات ہے، ایک روز ہمارے استاذ شیخ محمد خلف نوح ——— اب وہ اسکندریہ میں محکمۂ تعلیم کی طرف سے مدرس لگے ہوئے ہیں ——— ہمارے پاس آئے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ ہم نے دریافت کیا کہ کیا حادثہ پیش آیا ہے۔ فرمانے لگے:

آج فریدبک کا انتقال ہوگیا ہے، اس کے بعد موصوف نے فریدبک کی سیرت اور وطن کی راہ میں ان کے جہاد اور قربانیوں کو بیان کرنا شروع کردیا۔ اور اس انداز سے بیان کیا کہ ہم سب سراپا نالہ وشیون بن گئے۔ اس حادثہ سے متاثر ہوکر چند اشعار میں نے نظم کر لیے جن میں سے پہلا شعر پورا اور دوسرے شعر کا ایک مصرع یاد رہ گیا ہے:

أفريد نم بالامن والايمان — فرید! اطمینان وایمان کے ساتھ محوِ خواب ہوجا

أفريد لاتجزع على الاوطان — فرید! وطن پر آشفتہ نہ ہو۔

أفريد تفديك البلايا باسرها — فرید! تم پر تمام آزمائشیں قربان ہوں.....

ملز کمیشن[1] کے بارے میں لوگوں کے تبصرے اور گفتگوئیں بھی مجھے مستحضر ہیں۔

---

[1] ۱۹۱۹ء کی مصری بغاوت کے نتیجے میں برطانیہ نے تحقیقات کے لیے ملز کی قیادت میں ایک کمیشن بھیجا تھا۔ یہ اشارہ اسی کمیشن کی طرف ہے۔ پوری مصری قوم نے اس کمیشن کا مقاطعہ کیا تھا۔ (مترجم)

پوری قوم نے اس کمیشن کا مقاطعہ کیا تھا۔ کمیشن کے خلاف قوم کے جذبات سیلِ رواں بن کر اُمڈ آئے تھے۔ ایک نوعمر طالب علم سے بھی، جو ابھی زندگی کی تیرہویں بہار دیکھ رہا تھا، قومی احساس و شعور نے یہ شعر کہلوا دیئے ؎

یا مِلنز ارجع ثم سل	ملنز! واپس جاؤ اور
وفد ابنا ریس اقام	اس وفد سے اصل رائے دریافت کرو جو پیرس میں مقیم ہے
وارجع لقومك قل لهم	اپنی قوم کے لوگوں کے پاس واپس جاؤ اور ان سے
لا تخدعوهم يا لئام	کہہ دو کہ اے کم ظرفو، مصریوں کو دھوکہ نہ دو۔

یہ ایک طویل نظم تھی جس میں سے صرف یہی دو مذکورہ اشعار یاد رہ گئے ہیں۔ میں نے نوعمری میں متعدد قومی نظمیں کہی تھیں، اور پھر اپنے ان خام اور ابتدائی رشحاتِ فکر کو ایک بہت ضخیم دیوان میں جمع کر دیا جسے میں نے نذرِ آتش کر دیا تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میں تصوّف کے دور سے گزر رہا تھا۔ ٹیچرز ٹریننگ اسکول کا پورا زمانہ تصوّف میں محویت کا زمانہ تھا۔ اسی طرح مذاہبِ اربعہ کی فقہ پر میری کچھ تالیفات تھیں اور افسانہ "تودّد الجاریۃ" کے طرز کی کچھ ادبی کاوشیں تھیں۔ یہ چیزیں میں نے اخ استاذ محمد علی بُدَیر کے ساتھ مل کر "چھوٹی مسجد" کے اندرونی چبوترے میں گوشہ نشین ہو کر رقم کی تھیں۔ مگر یہ سب چیزیں تغافل کی نذر ہو گئیں۔ اور پھر اس دور میں آکر بالکل ہی ضائع ہو گئیں جسے میں دورِ عمل کہتا ہوں۔ اس دور میں میرا نظریہ یہ تھا کہ علمِ کثیر میں مگن ہو جانا عملِ نافع اور خدا کی عبادت میں یکسو ہو جانے سے روکتا ہے۔ انسان کو اپنے دین کے لیے اتنا علم کافی ہے جس سے وہ احکامِ دین کی صحت کو پرکھ لے اور اپنی دنیا کے لیے اتنا علم کافی ہے جس سے وہ اپنی روزی کا بندوبست کرے۔ اس کے بعد اس کے لیے لازم ہے کہ وہ ہمہ تن ہو کر ہمہ وقت ہر ممکن کوشش کے ساتھ ذکر و عبادت اور عمل میں منہمک ہو جائے۔

ہڑتالیں اور مظاہرے

ٹریننگ اسکول میں میں جب منتقل ہوا تو اس وقت تحریکِ بغاوت کے شعلے کچھ ماند پڑ چکے تھے۔ البتہ تحریک کی یادیں تازہ ہوتی رہتی تھیں اور ساتھ ہی ہڑتالوں اور مظاہروں اور پولیس کے ساتھ جھڑپوں میں بھی تازگی کی لہر دوڑ جاتی تھی۔ دمنہور میں ہمارا زمانہ ایسا ہی فضا میں گزرا۔ اس معاملے میں اوّلین ذمّہ داری ان طلبہ پر عائد ہوتی تھی۔ جو طلبہ میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے یا ان کے سرخیل سمجھے جاتے تھے۔ میں گو تصوّف و سلوک کی وادیوں میں محوِ گلگشت تھا مگر اس کے باوجود میرا اعتقاد تھا کہ وطن کی خدمت جہاد ہے اور یہ ایسا فرض ہے جس سے استثناء کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اپنے اس عقیدہ کی رُو سے اور طلبہ کے اندر اپنے مرتبہ و مقام کی بنا پر —— اس لیے کہ میں ان کی اگلی صفوں میں تھا —— میں پابند تھا کہ قومی و وطنی تحریکوں میں نمایاں کردار ادا کروں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

میں اسکول کے پرنسپل استاذ محترم شیخ دسوقی موسیٰ کو کبھی نہ بھولوں گا۔ وہ ہماری ان سرگرمیوں سے بہت خوف زدہ رہتے تھے۔ ایک دن ہمیں پکڑ کر بحیرہ کے ڈائرکٹر (جو ان دنوں محمود پاشا عبدالرزاق تھے) کے پاس لے گئے، اور طلبہ کی ہڑتالوں کی ذمّہ داری ہمارے سر ڈالتے ہوئے ان سے کہا کہ اب ہم ہی طلبہ کو ہڑتالوں سے باز رکھ سکتے ہیں۔ محمود پاشا کبھی لالچ، کبھی دھمکیوں اور کبھی ناصحانہ انداز میں ہمیں ان کاموں سے باز رہنے کی سعیٔ ناکام کرتے رہے۔ اور پھر انھوں نے ہمیں اس بنا پر چھوڑ دیا کہ ہم اس معاملے پر غور و فکر کریں۔ چنانچہ ہم نے یہ تدبیر اختیار کی کہ تمام طلبہ کو سمجھایا کہ وہ آج —— یعنی ۱۸ دسمبر کو، جو مصر پر انگریزوں کے تسلط کا یوم[1]

---

[1] انگریزوں نے مصر کو ۱۸۸۲ء میں اعرابی پاشا کی تحریک ناکام ہونے کے بعد اپنے مقبوضات میں شامل کیا تھا۔ اس وقت مصر پر محمد علی پاشا کے لڑکے اسمٰعیل پاشا کی حکومت تھی۔ (مترجم)

سیاہ ہے ـــــــــ سارا دن قرب و جوار کے کھیتوں میں تتر بتر رہیں۔ البتہ ہم خود اسکول چلے گئے اور اپنے آپ کو اسکول کی انتظامیہ کے سپرد کر دیا۔ چنانچہ اسکول کی انتظامیہ اور ہم بھی یہ انتظار کرتے رہے کہ طلبہ آئیں۔ مگر کسی نے آکر شکل تک نہ دکھائی۔ کچھ دیر کے بعد ہم بھی بالآخر اسکول سے چلے گئے اور یوں یہ ہڑتال کامیاب ہو گئی اور یوم سیاہ بعافیت منایا گیا۔

ہنگامہ خیز دنوں کی بات ہے کہ ایک روز طلبہ نے ہڑتال کر دی۔ طلبہ کی ایکشن کمیٹی نے ہماری رہائش گاہ پر جو دمنہور کی حاجن خضرہ شعیرہ کے مکان میں تھی۔ اپنا اجلاس منعقد کیا۔ پولیس نے یکایک اجلاس پر چھاپہ مارا۔ اور مکان کے اندر گھس گئی اور شرکائے اجلاس کے بارے میں حاجن خضرہ سے پوچھ گچھ کرنے لگی۔ حاجن نے انھیں کہہ دیا کہ "یہ لوگ تو علی الصبح ہی یہاں سے نکل گئے تھے اور پھر لوٹ کر نہیں آئے"۔ حاجن خضرہ اس وقت ـــــــ جیسا کہ پولیس نے بھی اُسے دیکھا ـــــــ سبزی صاف کرنے میں مشغول تھی۔ حاجن خضرہ کا یہ نادرست جواب مجھے ناگوار گزرا۔ میں پوچھ گچھ کرنے والے پولیس افسر کی طرف نکلا اور اسے اصل حقیقتِ حال بتا دی۔ گو اس طرح حاجن خضرہ کی پوزیشن بہت نازک ہو گئی مگر میں نے بڑے جوشیلے انداز میں بحث کرتے ہوئے پولیس افسر سے کہا:

"آپ کا قومی فریضہ یہ ہے کہ آپ ہمارا ساتھ دیں، نہ کہ ہماری جدوجہد کو سبوتاژ کریں، اور ہماری پکڑ دھکڑ شروع کر دیں"۔

میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ میری گفتگو کا کیسے یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ اس نے میری اپیل فوراً مان لی اور اپنے سپاہیوں کو واپس کر دیا اور ہمیں اطمینان دلانے کے بعد خود بھی ان کے ساتھ واپس چلا گیا۔ میں چھپے ہوئے رفقاء کے پاس آیا، اور میں نے ان سے کہا کہ سچائی کی برکت ہے۔ ہمیں لازماً سچا بن کر رہنا چاہیے۔ اور اپنے فعل کی ذمہ داری صاف صاف

اٹھانی چاہیے۔ دروغ گوئی کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے خواہ حالات کچھ سے کچھ ہو جائیں۔

محمودیہ اور دمنہور کے مابین

میں تعلیم کے ایام دمنہور میں گزارتا اور جمعرات کو ظہر کے وقت محمودیہ لوٹ آتا، اور پہلے درس میں ٹھیک وقت پر شریک ہو جاتا۔ محمودیہ میں مجھے بکثرت کام ہوتے جوان دو دنوں میں نمٹاتا۔ مزید برآں یہ کہ گھر والوں سے ملاقات بھی کرتا اور کچھ وقت ان کے پاس گزارتا۔ میرے اور اخ احمد آفندی سکری کے مابین دوستی اور محبت کے رشتے اس درجہ مستحکم ہو چکے تھے کہ ہم دونوں میں سے کوئی بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ وہ ہفتہ بھر دوسرے کی آنکھوں سے اوجھل رہے اور ملاقات نہ کرے۔ مزید برآں جمعہ کی رات کو شیخ شلبی الرجال کے مکان پر مجلس لگتی اور تصوف کی کتابوں مثلاً احیاء العلوم، احوال الاولیاء، الیاقوت اور الجواہر وغیرہ کا اجتماعی مطالعہ ہوتا، اور بعد ازاں صبح تک اللہ کا ذکر ہوتا۔ یہ مصروفیات ہماری زندگی کا پاکیزہ ترپروگرام تھیں۔ میں گھڑی سازی اور جلد بندی کے ہنروں میں بھی ترقی کر چکا تھا۔ دن کا وقت دکان میں فن کاری میں گزرتا اور شب حصافی اخوان کے ساتھ یادِ خدا میں۔ ان تمام مشاغل و مقاصد کی وجہ سے کسی ناگزیر ضرورت کے بغیر جمعرات کو محمودیہ آئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ میں ڈیلٹا میل سے اتر کر سیدھا دکان جاتا۔ قُبیل مغرب تک چند گھنٹے گھڑیوں کے کام میں مشغول ہو جاتا، اور پھر گھر چلا جاتا، تاکہ روزہ افطار کروں۔ جمعرات اور پیر کے روزے ہماری عادت بن چکے تھے۔ پھر چھوٹی مسجد چلا جاتا اور درس اور مجلس میں شرکت کرتا۔ وہاں سے شیخ شلبی الرجال کے مکان پر یا احمد آفندی السکری کے دولت کدہ پر قرآن مجید کے دَور اور ورد و ذکر کی خاطر جاتا۔ پھر مسجد کی جانب نماز فجر ادا کرنے کے لیے۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد دکان پر چلا جاتا۔ نماز جمعہ ادا کرتا، دوپہر کا کھانا کھاتا، مغرب تک دکان میں بیٹھتا اور پھر علی الترتیب مسجد اور گھر میں اور

صبح سویرے دمنہور کو اسکول کی طرف۔ اگلے ہفتہ پھر یہی پروگرام۔ اسی ترتیب کے ساتھ۔ مجھے یاد نہیں کہ کسی ہنگامی اور غیر معمولی ضرورت کے بغیر کسی ہفتے محمودیہ کی حاضری میں کوئی ناغہ ہوا ہو۔

گرمیوں کی چھٹیاں

موسم گرما کی تعطیلات اس پروگرام پر روزانہ عمل درآمد کرنے کا مناسب زمانہ ہوتی تھیں۔ البتہ ان ایام میں ایک نئی مشغولیت کا اضافہ ہو جاتا، اور وہ یہ کہ روزانہ طلوع شمس سے لے کر چاشت تک استاذ محترم شیخ محمد خلف نوح کے ساتھ ان کے مکان پر مذاکرہ ہوتا۔ ابن مالک کا الفیہ ـــــــ نحو کی مشہور کتاب ـــــــ ہم نے زبانی حفظ کرنا شروع کر دیا۔ اور الفیہ کی شرح ابن عقیل کا درس لینے لگے۔ فقہ، اصول اور حدیث کی متعدد کتابوں کا باہمی مطالعہ اور مذاکرہ کیا۔ یہ اضافی تعلیم ہی وہ بڑی وجہ تھی کہ میں بعد میں دار العلوم میں داخل ہونے کے لائق ہو گیا۔ ورنہ اس زمانے میں میں دار العلوم میں داخل ہونے کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ ہم تو کہا کرتے تھے کہ ہم لوگ علم برائے علم پڑھ رہے ہیں۔

اذان صبح گاہی

گرمیوں کی چھٹیوں میں محمودیہ کے اندر ہمارے کاموں کا ایک حصہ یہ بھی تھا کہ جمعہ کی صبح کو بستی کے محلوں کو باہم تقسیم کر لیتے۔ ہم تین ہوتے تھے۔ یا کبھی تین سے زیادہ۔ راقم، اخ محمد آفندی الدمیاطی، اخ عبد المتعال سنکل۔ ہم اپنے اپنے محلے میں نکل جاتے۔ تاکہ لوگوں کو نماز صبح کے لیے فجر سے پہلے ہی جگا دیں، اور خاص طور پر اخوان کو۔ میں جب مؤذنوں کو اذان صبح کے لیے بیدار کرتا تو اس وقت ایک عظیم لذت سے لطف اندوز ہوتا اور ایک گہری مسرت میں ڈوب جاتا۔ انھیں بیدار کرنے کے بعد میں اسی جادو اثر اور جذبہ انگیز حالت میں دریائے نیل کے کنارے جا کھڑا

ہوتا اور اذان، سننے کے لیے ہمہ تن گوش ہو جاتا۔

محمودیہ کی مساجد قریب قریب فاصلوں پر تھیں۔ اس لیے جب ان سے اذانیں بلند ہوتیں تو محسوس ہوتا کہ ایک ہی اذان ہے جو مختلف مؤذنوں کے گلے سے نکل کر بیک وقت فضائے بسیط میں بکھر رہی ہے۔ میرا دل کہتا: نمازیوں کی اتنی بڑی تعداد کی بیداری کا میں ہی ذریعہ بنوں گا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادِ مبارک کے مصداق مجھے بھی نمازیوں کے برابر اجر ملے گا کہ:

من دعا الی ھدی فلہ اجرہ واجر من عمل بہ الی یوم القیامۃ

لا ینقص ذالك من اجورھم شیئا۔

"جو شخص ہدایت کی طرف دعوت دیتا ہے اسے اس کا بھی اجر ملتا ہے اور اس شخص کی نیکی کا اجر بھی جو قیامت تک اس پر عمل پیرا رہے، اور اس سے ان کے اجر میں ذرّہ بھر کمی نہ واقع ہوگی۔"

یہ لذت و سعادت مزید دوچند ہو جاتی جب میں اس کے بعد مسجد چلا جاتا اور اپنے آپ کو مسجد میں بیٹھنے والوں کے اندر سب سے کم عمر پاتا۔ تمام حمد و سپاس خدا ہی کے لیے ہے، اور اسی سے دائمی توفیق کا سوال ہے۔

دارالعلوم میں داخلے کی تیاری

ٹیچرز ٹریننگ اسکول کا پورا تین سالہ دور تصوّف و عبادت میں استغراق کا دَور تھا۔ اس انہماک و استغراق کے باوصف یہ دَور اسکول کے مقررہ نصاب کے علاوہ بھی تحصیلِ علم اور شوقِ درس سے خالی نہ رہا۔ میرے قیاس میں اس کا سبب دو اُمور ہیں:-

ایک والدِ محترم کی لائبریری اور ان کا مجھے مطالعہ و مذاکرہ پر برابر ترغیب دیتے رہنا اور مجھے علمی کتابیں ہدیۃً پیش کرتے رہنا جن میں سے چند ایک مجھے آج بھی زبانی

حفظ ہیں۔ ان میں سے جن کتابوں نے میرے دل پر گہرے نقوش مرتسم کیے ہیں ایک نبہانی کی الانوار المحمدیہ ہے یہ قسطلانی کی المواھب اللدنیہ کی تلخیص ہے۔ اور دوسری شیخ خضری بک کی نور الیقین فی سیرۃ سید المرسلین ہے۔ والد محترم کی اس رہنمائی کے تحت اور پھر اس کے نتیجے میں مطالعہ اور کتب کے ساتھ جو شغف و شوق پیدا ہو گیا اس کی بنا پر میں نے اپنی ایک علیحدہ لائبریری قائم کرلی۔ جس میں قدیم رسائل و مجلات اور گوناگوں کتابوں کا ذخیرہ جمع ہو گیا۔ میرے شوقِ مطالعہ کی انتہا یہ تھی کہ جب میں محمودیہ ہی میں تھا اور مدرسہ اعدادیہ میں زیرِ تعلیم تھا تو میں بازار جانے کے دن شیخ حسن کتبی کا بڑی بے صبری کے ساتھ انتظار کرتا تاکہ میں چند پیسوں کے عوض اُس سے ہفتہ بھر کے لیے کچھ کتابیں مستعار لے لوں۔ چنانچہ جب میں ان کتابوں سے فارغ ہو جاتا تو انھیں واپس کر کے دوسری کتابیں لے لیتا اور یہ سلسلہ برابر جاری رہتا۔

اس زمانے میں جن کتابوں نے میری ذات پر شدید اور عمیق اثر ڈالا وہ ایک قصہ ہے جس کا نام ہے : الأميرة ذات الهمة (بہادر شہزادی)۔ جب میں یہ یاد کرلیتا ہوں کہ ان دنوں ہم جن قصوں اور کہانیوں کا مطالعہ کیا کرتے تھے وہ تمام ترغیرت و شجاعت، دفاعِ وطن، اتباعِ دین، جہاد فی سبیل اللہ اور شوکت و برتری کے لیے کشمکش کا درس ہوتے تھے اور اب جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ آج کا نوجوان جو افسانے اور ناول پڑھتا ہے وہ سرتاسر بے حیائی، زنانہ پن، تھڑدِلی اور کھو کھلے کردار کی دعوت ہے تو مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ ماضی قریب کی عوامی ثقافت اور حال کی عوامی ثقافت میں کس قدر حیران کن فرق واقع ہو چکا ہے۔ میری رائے میں ہمارے لیے یہ اشد ضروری ہے کہ ہم اس ثقافتی غذا کی خوب چھان پھٹک کریں جو نئی نسل کو کتابوں، کہانیوں اخبارات اور مجلات کی شکل میں پیش کی جارہی ہیں۔

ایک دوسرا سبب بھی میرے شوقِ مطالعہ کے لیے مہمیز تھا۔ ان ایام میں ٹیچرز

ٹریننگ اسکول میں چیدہ اور نہایت فاضل اساتذہ کا جمگھٹا تھا۔ مثلاً استاذ محترم عبدالعزیز عطیہ ——— اسکندریہ میں ٹیچرز اسکول کے موجودہ پرنسپل اور اسکندریہ میں اخوان المسلمون کے سربراہ ——— استاذ جلیل شیخ فرحات سلیم رحمہ اللہ، شیخ عبدالفتاح ابوعلام، استاذ الحاج علی سلیمان، استاذ شیخ البسیونی ——— اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کو نیک جزا عطا فرمائے ——— یہ حضرات پارسائی و نیکوکاری میں منفرد مقام رکھتے تھے۔ اپنے طلبہ کو ہمیشہ تحقیق و مطالعہ پر اکساتے رہتے۔ ان حضرات کے ساتھ میرا روحانی رشتہ تھا جو میرے لیے بہت ترغیب اور حوصلہ افزائی کا موجب تھا۔ مجھے آج تک یاد ہے کہ استاذ عبدالعزیز عطیہ نے جو ہمیں " عملی تعلیم " پڑھاتے تھے ہمارا ماہانہ امتحان لیا۔ میرا جواب انھیں بہت پسند آیا۔ انھوں نے میرے پرچے پر لکھ دیا: تم نے بہت خوب جواب دیا ہے، اور اگر کُل نمبروں پر کچھ مزید نمبر دیئے جا سکتے تو میں وہ بھی تمہیں دے دیتا۔ جب جوابات کے پرچے وہ تقسیم کرنے لگے تو میرا پرچہ انھوں نے روک لیا اور مجھے بُلا کر وہ میرے ہاتھ میں تھمایا اور میرے حق میں کثیر کلمات ارشاد فرمائے جن میں نصیحت تھی، حوصلہ افزائی تھی اور درس و مطالعہ اور پڑھنے کی تلقین تھی۔ بلکہ انھوں نے اپنی کتاب المعلّم کے پروف کی تصحیح کے لیے مجھے منتخب کیا۔ یہ کتاب ان دنوں دمنہور کے المستقبل پریس میں چھپ رہی تھی۔

یہ تمام اسباب و محرکات میرے لیے بڑے اثر انگیز ثابت ہوئے۔ چنانچہ میں نے اسی مرحلۂ تعلیم میں مدرسی نصاب سے باہر مختلف علوم کے بہت سے متن زبانی ازبر کر لیے، حریری کی ملحۃ الاعراب حفظ کر لی۔ الفیہ ابن مالک یاد کر لیا۔ اصطلاح حدیث میں البیقونیہ، توحید میں الجوہرۃ اور میراث میں الرحبیہ، منطق میں سلم العلوم کا کچھ متن ازبر کر لیا۔ فقہ حنفی میں قدوری کا اکثر حصّہ، فقہ شافعی میں ابوشجاع کی الغایۃ والتقریب کا کچھ متن، مذہب مالکی میں منظومہ ابن عامر کے بعض حصّے میں نے حفظ کر لیے۔ والد محترم کی یہ ماثور و منقول نصیحت میں

نے کبھی فراموش نہ کی کہ " من حفظ المتون حاز الفنون " (جس نے اصل متن حفظ کر لیے وہ فنون پر حاوی ہو گیا) ۔ یہ تلقین میرے دل میں اس قدر گہری اُتر گئی کہ فن قراءت میں میں نے الشاطبیہ پوری کی پوری حفظ کرنے کی کوشش شروع کر دی ۔ حالانکہ میں اس کی اصطلاحوں سے بالکل ناواقف تھا ۔ چنانچہ میں نے اس کے مقدمات بالفعل حفظ کر لیے جس کی بعض عبارتیں مجھے اب تک زبانی یاد ہیں ۔

ایک لطیفہ یہ ہوا کہ ایک انسپکٹر صاحب عربی زبان کے درس میں ہمارے پاس آ گئے ۔ ہم سال سوم میں تھے ۔ اس وقت مجھے صرف حریری کی ملحۃ الاعراب حفظ تھی ۔ انسپکٹر صاحب نے طلبہ سے یہ سوال کیا کہ نحو میں اسم کی علامت کیا ہے اور فعل کی علامت کیا ہے ۔ ان کا دوسرا سوال یہ تھا کہ حرف کی علامت کیا ہے ۔ استاذ نے ، جن کا اسم گرامی شیخ محمد علی النجار تھا ۔ جواب دینے کے لیے مجھے منتخب کیا ۔ میں نے جواب میں ملحۃ الاعراب کا یہ شعر سُنا دیا :

والحرف مالیست لہ علامۃ — حرف وہ ہے جس کی کوئی علامت نہیں ہے

فقس علی قولی تکن علامۃ — میرے اس قول پر سب کو قیاس کر لے تو علاّمہ بن جائے گا ۔

انسپکٹر صاحب سُن کر مسکرا دیئے اور کہنے لگے : بہت اچھا یا سیّدی ، میں ضرور آپ کے قول پر قیاس کروں گا تاکہ علاّمہ بن جاؤں " پھر انھوں نے استاذ کا شکریہ ادا کیا اور چلے گئے ۔

اس علمی ثروت نے بعض احباب کی توجہ میری طرف ملتفت کر دی ۔ یہ احباب اس وقت کے دار العلوم میں داخلہ لینے کے لیے اپنے آپ کو تیار کر رہے تھے ۔ اور یہ سب پرائمری اسکول کے مدرس تھے جو ٹیچرز ٹریننگ اسکول کے تابع تھا ۔ ان احباب نے مجھے یہ پیشکش کی کہ ہم سب مل کر تیاری کریں اور مل کر دار العلوم میں داخلہ لیں ۔ ان حضرات میں پیش پیش

برادر عزیز شیخ علی نوفل ——— جواب استاذ علی نوفل کہلاتے ہیں ———
تھے۔ انہی کی یہ ترغیب تھی کہ باہم مل کر تیاری کی جائے اور مل کر دار العلوم میں جایا جائے۔
دار العلوم ان دنوں دو شعبوں پر مشتمل تھا: ایک شعبۂ تجہیزی، اس میں ازہر کے طلبہ
اور ٹیچرز اسکولوں کے طلبہ میں سے جو چاہے داخلہ لے سکتا تھا۔ اور دوسرا شعبۂ عالی عارضی۔
اس میں بھی ازہر کے طلبہ داخل ہو سکتے تھے جو بالعموم ازہر سے ثانوی تعلیم کا سرٹیفکیٹ
لے چکے ہوتے تھے۔ اس شعبے میں ——— یعنی شعبۂ عالی عارضی میں ———
داخلہ کے لیے صرف یہی سال ——— ۱۹۲۳ء ——— ۱۹۲۴ء کا تعلیمی سال
——— باقی رہ گیا تھا۔ اس کے بعد یہ شعبہ ختم کیا جانا تھا، اور اس کی جگہ ایسا شعبۂ
عالی قائم کیا جانا تھا جس کا داخلہ شعبۂ تجہیزی سے فارغ ہونے والوں کے لیے مخصوص ہو۔ ہمارے
اسکول کے بعض ساتھیوں نے تو شعبۂ تجہیزی ہی میں داخل ہونے کا ارادہ کر لیا۔ مگر شعبۂ
عالی عارضی کی طرف طلبہ کا زیادہ رجحان ہو گیا، اس لحاظ سے کہ اس میں داخلے کا اب
یہ آخری موقع تھا۔

شیخ علی نوفل نے میرے ساتھ مل کر تیاری کرنے کی ٹھان لی۔ میں تیسرے
سال میں تھا۔ یعنی اس سال میں جس میں مجھے پرائمری ٹیچنگ کا ڈپلوما (مصری اصطلاح میں شہادۃ
الکفاءۃ) حاصل کرنے کا امتحان دینا تھا۔ اور شیخ علی نوفل ٹیچرز ٹریننگ اسکول کے پرائمری
سیکشن میں مدرس تھے۔ چنانچہ میں نے اجتماعی مطالعہ سے معذرت کر دی۔ لیکن وہ دوسرے
دروازے سے داخل ہو گئے۔ کہنے لگے کہ "اخوت کے بھی حقوق ہوتے ہیں۔ نیز احباب کی
معاونت فرض ہے، اور ان کے مشوروں کو قبول کرنا ضروری ہوتا ہے"۔ اب میرے لیے
اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ رہا کہ میں ان کی بات کو اہمیت دوں۔

تعلیم اور ڈگریوں کے بارے میں میری رائے

ان دنوں علم اور تلاش علم اور سندات اور ان کے حصول کے سلسلے میں میری ایک

مخصوص رائے تھی ۔ جو امام غزالیؒ کی احیاء العلوم کے مطالعہ کا ایک نتیجہ تھی ۔ علم سے مجھے شدید محبت تھی ۔ مطالعہ کی جانب میرا غیر معمولی رجحان تھا اور اضافۂ علم کی مجھے بے حد خواہش تھی ۔ میں فرد اور جماعت دونوں کے لیے علم کے فوائد کا قائل تھا ۔ اور لوگوں کے اندر علم کی اشاعت کو فرض گردانتا تھا ۔ یہاں تک کہ مجھے یاد ہے کہ میں نے " الشمس " کے نام سے ماہانہ رسالہ جاری کرنے کا بھی عزم کر لیا ۔ بلکہ اس کے پہلے دو شمارے میں نے مرتب بھی کر لیے ۔ شیخ محمد زہران کی تقلید میں جو " الاسعاد " کے نام سے ماہانہ رسالہ نکالتے تھے اور المنار کی مشابہت میں جس کا میں بکثرت مطالعہ کیا کرتا تھا ——— لیکن علوم و معارف کی ترتیب اور طلب علم کے متعلق امام غزالیؒ کا نظریہ اور اسلوب میرے ذہن و قلب پر شدّت کے ساتھ اثر انداز ہو چکا تھا ۔ اور میں ایک شدید ذہنی کش مکش میں مبتلا ہو چکا تھا ۔ ایک طرف یہ شوق فراواں دامن کش تھا کہ مزید علم کی تلاش کروں اور دوسری طرف امام غزالیؒ کے ارشادات اور علم واجب کے بارے میں ان کی یہ تعریف کہ یہ وہ علم ہے جس کا انسان ادائے فرائض اور کسبِ معاش کے لیے حاجت مند ہوتا ہے اور اسے حاصل کرنے کے بعد انسان کو عمل کی طرف آجانا چاہیے ۔ مجھے مجبور کر رہے تھے کہ میں صرف ضروری علم پر اکتفا کروں اور ماسوا کو نظر انداز کروں ۔ اور اس میں ضیاع وقت نہ کروں ۔

دار العلوم اور اس کے تابع اداروں میں داخل ہونے کا خیال پھر اس بات سے تازہ ہو گیا کہ دار العلوم سے فارغ ہونے والے طلبہ میں سے وہ لوگ جو اعلیٰ درجوں سے ڈپلوما حاصل کر چکے تھے ۔ بیرونِ ملک اسکالرشپ پر بھیجے جا رہے تھے ۔ اب ذہنی کش مکش اور بھی شدّت و قوت اختیار کر گئی ۔ میں ہمیشہ اپنے نفس سے کہا کرتا : تو دار العلوم میں کیوں داخل ہونا چاہتا ہے ؟ ۔ کیا جاہ و منزلت حاصل کرنے کے لیے تاکہ لوگ تجھے یہ کہیں کہ تو پرائمری ٹیچر نہیں اعلیٰ تعلیم کا مدرس ہے ۔ مگر یہ بات حرام ہے ۔ جاہ کی طلب و حرص نفس کی بیماریوں میں سے ایک بیماری اور شہواتِ نفس کا ایک حصہ ہے ۔ اس کا قلع قمع کرنا فرض ہے ———

یا مال و دولت کی خاطر؟ تاکہ تیرا مشاہرہ دوگنا ہوجائے۔ اور تو خوب مال سمیٹ لے، لباس فاخرہ زیب تن کرے، نفیس غذائیں کھائے، اور عظیم الشان گاڑیوں میں سواری کرے؟ مگر یہ انسان کی سعی کا سب سے بدترین ماحصل ہے۔ ہلاک ہوا بندۂ دینار، ہلاک ہوا بندۂ درہم، تباہ ہوا حریر و مخمل کا غلام، تباہ ہوا اور برباد ہوا۔ اگر مبتلائے مصیبت ہوا تو اسے توفیق توبہ نہ نصیب ہوئی۔[1]

اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا :

زین للناس حب الشهوات من النساء والبنين والقناطير المقنطرة من الذهب والفضة والخيل المسومة والانعام والحرث ذلك متاع الحيوة الدنيا والله عنده حسن المآب قل أؤنبئكم بخير من ذلكم، للذين اتقوا عند ربهم جنات تجري من تحتها الانهار خالدين فيها۔

" لوگوں کے لیے مرغوبات نفس ـــــــ عورتیں، اولاد، سونے چاندی کے ڈھیر چیدہ گھوڑے، مویشی اور زرعی زمینیں ـــــــ بڑی خوش آئند بنا دی گئی ہیں۔ مگر یہ سب دنیا کی چند روزہ زندگی کے سامان ہیں۔ حقیقت میں جو بہتر ٹھکانا ہے وہ تو اللہ کے پاس ہے۔ کہو: میں تمہیں بتاؤں کہ ان سے زیادہ اچھی چیز کیا ہے؟ جو لوگ تقویٰ کی روش اختیار کریں، ان کے لیے ان کے رب کے پاس باغ ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہاں انھیں ہمیشگی کی زندگی حاصل ہوگی "۔

یا علم و فن کا ذخیرہ وافر جمع کرنے کے لیے؟ تاکہ تو علماء کے ساتھ مسابقت کرے، جہلاء سے بحث و مجادلہ کرے اور اپنا حق منوانے کے لیے لوگوں پر غلبہ حاصل کرے

---

[1] یہ ایک حدیث کے الفاظ ہیں، جسے بخاری نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے۔ (مترجم)

مگر قیامت کے روز سب سے پہلے جس شخص کے لیے آتشِ دوزخ بھڑکائی جائے گی، وہ ہے جس نے خوشنودیٔ خدا کے سوا کسی اور مقصد کے لیے علم حاصل کیا اور اپنے علم پر عمل نہ کیا۔ آخرت میں سب سے شدید ترین عذاب اس عالم کو دیا جائے گا جس کے علم کو اللہ تعالےٰ نے اس کے حق میں نافع نہ بنایا۔ میں اپنے آپ کو کہتا کہ تیرا نفس تجھے یہ بھی سمجھا سکتا ہے کہ تو اس لیے علم سیکھ رہا ہے تاکہ تو عالم بن کر لوگوں کو نفع پہنچائے اور یہ کہ اللہ اور اس کے فرشتے لوگوں کو بھلائی کی تعلیم دینے والوں پر درود بھیجتے ہیں، اور یہ کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معلم بنا کر بھیجے گئے ہیں —— نفس یہ سب حیلے تجھے سمجھا سکتا ہے۔ لیکن تو نفس سے پوچھ کہ اگر تو سچ کہتا ہے کہ تو علم کی طلب صرف اس لیے کر رہا ہے کہ انسانوں کو فائدہ ہو اور اللہ کی خوشنودی حاصل ہو، تو پھر تو دارالعلوم میں داخلے پر کیوں مصر ہے۔ حالانکہ علم تو کتابوں میں پنہاں ہے۔ مشائخ وعلماء کے دامن میں ہے۔ سند ایک فتنہ ہے۔ یہ ایک مرکب ہے دنیا کی طرف لپکنے کے لیے اور مال ومنال سے رشتہ جوڑنے کے لیے۔ اور یہ دونوں چیزیں —— دنیا پرستی اور زرطلبی —— سمِّ قاتل ہیں۔ اعمال کو غارت کر دینے والی ہیں، قلب و اعضاء کو بگاڑ دینے والی ہیں۔ لہٰذا تجھے علم سیکھنا ہے تو کتابوں سے سیکھ۔ تعلیم گاہوں کی سندوں اور رسمی ڈپلوموں سے نہ چمٹ۔

یہ فلسفہ میرے دل و دماغ پر پوری طرح چھایا چاہتا تھا۔ بلکہ بالفعل چھا چکا تھا۔ اس لیے میں نے استاذ علی نوفل کے ساتھ از راہِ نفرت مشترک مطالعہ کا آغاز نہ کیا۔ لیکن استاذ محترم شیخ فرحات سلیمؒ جو مجھ سے شدید محبت کرتے تھے اور ہر تقریب میں میرے اوپر اپنی شفقت کا اظہار فرمایا کرتے تھے، اور میرے دل میں بھی ان کا بہت اونچا مقام تھا۔ انھوں نے بڑی لطافت اور دانائی کے ساتھ مجھے مشترکہ مطالعہ پر سنجیدگی سے آمادہ کر دیا، اور دارالعلوم کا دروازہ کھٹکھٹانے کے لیے میرے اندر بالفعل رغبت پیدا کر دی۔ وہ مجھے فرمانے لگے:

"اس وقت تم ڈپلوما حاصل کرنے کے بالکل قریب ہو چکے ہو۔ علم کوئی ضرررساں چیز نہیں ہے۔ دارالعلوم کے امتحان کے لیے تمہارا پیش قدمی کرلینا زیادہ بڑے امتحانوں کے لیے ایک تجربہ ہوگا۔ یہ ایسا موقع ہے جسے اگر ضائع کر دیا گیا تو پھر اس کی تلافی نہ ہوسکے گی۔ داخل ہو جاؤ اور اپنے نفس کا حق محفوظ کرلو۔ مجھے تمہاری کامیابی کا پورا پورا یقین ہے، انشاء اللہ۔ نیز داخلہ لے لینے کے بعد بھی معاملہ ہمارے ہاتھ میں رہے گا۔ پھر تم جس طرح چاہو سوچ لینا۔ خواہ ارادہ ترک کر دینا اور خواہ داخل ہو جانا۔"

یوں استاذ محترم نے اپنی بھرپور قوتِ تاثیر کے ساتھ مجھے درخواستِ داخلہ دینے والوں کے ساتھ درخواست دائر کرنے کے لیے یکایک اُبھار دیا۔ داخلے کا امتحان ڈپلوما کے امتحان کے چند روز بعد ہونے والا تھا۔

دو اسلوب

میں چاہتا ہوں کہ یہاں دو یادیں سپردِ قلم کر دوں۔ ان میں سے ایک یاد عملی ہے، اور دوسری نظری۔ یہ دونوں یادیں میرے دل میں سما گئیں اور ایک مدت تک انھوں نے میرے ذہن کو اپنی جانب مرکوز رکھا:

اوّل الذکر یاد علامہ جلیل شیخ احمد الشرقاوی الہورینی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے۔ اس بزرگ انسان کو میں نے صرف ایک مرتبہ دیکھا ہے۔ یہ دمنہور میں اپنے بیٹوں، طالب علموں، مریدوں اور دوستوں سے ملنے کے لیے تشریف لائے، اور ان کے گھروں اور اقامت گاہوں میں جاکر اُن کی خبر گیری کی۔ ہمارے ساتھ انھوں نے ایک شب بسر کی جس میں وہ اپنی طبع مالوف سے سرِ مُو نہ سرکے۔ مجھے ان کے بارے میں ایسی باتیں معلوم ہوئیں جنہوں نے میرے دل میں اُن کی عظمت کا سکہ بٹھا دیا۔ اور آج تک ان کی یاد دل کے گوشوں میں موجود ہے۔ اُن کے بارے میں مجھے معلوم ہوا کہ انھیں علم اور تعلیم سے قلبی عشق تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے شہر کے باشندوں کو تعلیم کی جانب دھکیلا۔ جو شخص تعلیمی مصارف کی قدرت نہ رکھتا تھا۔

اس کی اپنی جیب سے تکمیل تعلیم تک اعانت کرتے۔ اور اس پر شرط عاید کرتے کہ جب وہ تعلیم سے فارغ ہو جائے تو وہ کسی دوسرے بیکس شخص کا تعلیمی بوجھ اُٹھائے۔ اور یوں اس فرض کو نقدی کی شکل میں نہیں بلکہ علم و معرفت کے فروغ کی صورت میں ادا کرے۔ اس اسلوب کے تحت ہُوّرین کے اندر کوئی شخص تعلیم سے عاجز نہ رہا خواہ وہ کیسے ہی غریب خاندان کا فرد ہوتا تھا۔ اس تعلیمی امداد باہمی نے سب کو علم سے مالا مال کر دیا۔ مزید برآں یہ کہ ایسے تمام اصحاب علم کے مابین ایک مضبوط روحانی رشتہ استوار ہو جاتا۔ شیخ احمد الشرقاوی کی واحد تفریح یہ تھی کہ گرمیوں کی چھٹیوں میں ہُوّرین کے طلبہ ان کے ارد گرد ہالہ تنے بیٹھے ہوں اور وہ دیکھ رہے ہوں کہ بیس از ہری طلباء کے دوش بدوش بیں درعمی طلباء ——— دار العلوم کے طلباء کو وہ درعمی (جو دار العلوم کا مخفف ہے) طلبہ کہتے تھے ——— بیٹھے ہوں، پچاس پرائمری ٹیچرز ٹریننگ اسکول کے طلبہ فروکش ہوں، ایک بھاری بھر کم تعداد دوسری مختلف النوع درس گاہوں میں تعلیم پانے والوں کی شریکِ محفل ہو۔ ان سے وہ مصروفِ مذاکرہ ہوں۔ داستان گوئی کا مشغلہ جاری ہو۔ ان کو پہیلیاں کہہ رہے ہوں اور ان پر اعتراضات وارد کر رہے ہوں، اور اس حکیمانہ اسلوب سے ان کے اذہان کو صیقل کر رہے ہوں اور ان کے عزائم کو مطالعہ و تعلیم اور علم دعرفان کے لیے پختہ تر کر رہے ہوں ——— یہی وہ راز ہے کہ دمنہور کے پرائمری ٹیچرز ٹریننگ اسکول میں ہورین کے طلباء کی عظیم اکثریت تھی۔ اب شیخ الشرقاوی ان سے ملاقات کے لیے تشریف لائے تھے تاکہ ان کو مزید تھپکی دیں۔ یہ مختصر سا دورہ انھوں نے نکتہ طرازیوں اور علمی گفتگوؤں میں گزارا۔ راقم بھی ان کے سوالات، اعتراضات، پہیلیوں اور کہاوتوں سے نہ بچ سکا۔ اللہ تعالےٰ انھیں دامنِ رحمت میں جگہ دے "اور اپنی جنّت کو ان پر کشادہ فرمائے۔

دوسری یاد ——— شیخ صاوی دراز رحمہ اللہ سے وابستہ ہے۔ شیخ صاوی

ایک پارسا نوجوان تھے۔ فلاحین میں سے تھے۔ اس وقت اُن کی عمر ۲۵ سال سے متجاوز نہ تھی۔ مگر بعد میں وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ مرحوم ذکاوت، باریک بینی اور واقعہ نگاری میں نادر روزگار تھے۔ ایک مرتبہ ہم نے اولیاء و علماء کا تذکرہ چھیڑ دیا اور گفتگو سیّد ابراہیم دسوقی ——— جن کا مزار شہر کے قریب ہی تھا ——— اور ان سے سیدی احمد البدوی تک ——— جو طنطا میں مدفون ہیں ——— جا پہنچی۔ شیخ صاوی دراز کہنے لگے: کیا سیّد احمد البدوی کا قصہ جانتے ہو؟ میں نے جواب دیا: ہاں، وہ بڑے بزرگ ولی تھے، متقی و پارسا تھے، عالم و فاضل تھے۔"

شیخ کہنے لگے: بس اتنا ہی جانتے ہو؟۔ میں نے کہا: ہم تو یہی کچھ ان کے بارے میں جانتے ہیں۔ شیخ صاوی نے کہا: سنو میں تمہیں بتاتا ہوں۔

"سیّد بدوی اپنے دار الہجرت مکّہ سے مصر وارد ہوئے۔ اصلاً وہ مغرب (مراکش) کے باشندے تھے۔ مصر میں اس زمانے میں آئے جب یہاں ممالیک کوس حکمرانی بجا رہے تھے[1] ممالیک کی حکمرانی صحیح نہ تھی کیونکہ وہ غلام تھے۔ آزاد نہ تھے۔ اور سیّد بدوی خالص علوی سادات میں سے تھے۔ ان کے اندر تمام فضیلتیں مجتمع تھیں: نسب کی فضیلت، علم کی فضیلت اور ولایت (حکمرانی) کا استحقاق۔ اہلِ بیت خلافت کو اپنا حق سمجھتے تھے۔ خلافتِ عباسیہ ختم ہو چکی تھی، اور بغداد میں اس کی بساط لپٹ چکی تھی۔ مسلمان اقوام چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ چکی تھیں۔ ان پر ایسے امراء حکمرانی کر رہے تھے جنہوں

---

[1] سیّد احمد البدوی مصر کے مشہور اولیاء اللہ میں سے تھے۔ مصر میں ان کو وہی شہرت حاصل ہے جو پاکستان میں حضرت علی ہجویری رحمہ اللہ کو حاصل ہے۔ یہ اصلاً فاس (مراکش) کے رہنے والے تھے۔ وہاں سے ہجرت کر کے مکہ معظمہ آ گئے، اور عراق چلے گئے اور دعوت و تبلیغ اور اسلامی اصلاحات کی کوششوں میں منہمک رہے۔ عراق سے مکہ واپس آئے۔ اور آخر کار ۶۳۴ھ میں انھوں نے مصر کا رخ کیا اور طنطا کو اپنا مرکز بنا لیا۔ (مترجم)

نے بزورِ بازو و غلبہ حاصل کر لیا تھا۔ ان امراء میں سے مصر کے حکمراں ممالیک بھی تھے۔ سیّد بدوی کے سامنے دو اہم کام تھے، جن کے لیے انھیں جد و جہد کرنا تھی۔ ایک خلافت کی بحالی اور دوسرا ممالیک سے جن کی ولایت شرعاً درست نہ تھی۔ مسندِ حکمرانی خالی کروانا۔ یہ دونوں امور کیسے انجام دیئے جائیں ؟ ان کے لیے خصوصی نقشۂ کار مرتب کرنے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ انھوں نے اپنے چند خصوصی احباب اور مشیروں کو جمع کیا۔ مثلاً سیّدی مجاہد اور سیّدی عبدالعال وغیرہ۔ ان حضرات نے یہ طے کیا کہ اپنی دعوت پھیلائی جائے، اور لوگوں کو ذکر و تلاوت پر مجتمع کیا جائے۔ اس "ذکر" کے لیے انھوں نے چند علامات مقرر کر دیں : ایک چوبی تلوار یا مضبوط عصا جسے سیف و طبل کے قائم مقام قرار دے کر مدارِ اجتماع بنایا۔ ایک پھریرا جوان کا مخصوص عَلَم تھا اور ایک چرمی سپر۔ یہ سب چیزیں شعائرِ بدوی قرار دی گئیں۔ جب لوگ ذکر و تلاوت کی خاطر جمع ہو جاتے اور دین کے احکام سیکھ لیتے تو خود انھیں یہ شعور ہو جاتا کہ ان کا معاشرہ حکومت کے بگاڑ کا شکار ہے اور خلافت کا نظام ختم ہو چکا ہے۔ چنانچہ دینی حمیت اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فرض کا احساس ان کے اندر اصلاحِ احوال کے لیے جذبۂ جہاد اُبھار دیتا ہے۔

سیّد بدوی کے پیروکار ہر سال اپنا ایک اجتماع کرتے۔ سیّد نے طنطا کو مرکزِ تحریک بنالیا تھا۔ کیونکہ طنطا مصر کے آباد و پُر رونق شہروں کے عین وسط میں واقع ہے۔ اور مرکزِ حکومت (قاہرہ) سے ہٹ کر ہے۔ جب یہ لوگ میلاد النبیؐ کے رنگ ڈھنگ پر سالانہ مجتمع ہوتے، تو سیّد بدوی کو یہ اندازہ لگانا آسان ہو جاتا کہ ان کی دعوت و تحریک لوگوں کے اندر کس حد تک اثرات پیدا کر چکی ہے۔ سیّد بدوی اپنے آپ کو لوگوں کے سامنے بے نقاب نہ کرتے تھے۔ بلکہ بالاخانے میں معتکف ہو جاتے اور چہرہ دوہرے آنچل سے ڈھانک لیتے۔ تاکہ یہ حالت لوگوں کے دلوں میں زیادہ ہیبت خیز ہو۔ اس دَور میں ایسے ہی طریقے کا رواج تھا۔ یہاں تک کہ سیّد بدوی کے متبعین لوگوں کے اندر یہ بات پھیلاتے کہ انھیں دیکھنا موت ہے۔

جو شخص قطب پر ایک نظر ڈالنا چاہتا ہے اُسے اس ایک نظر کی راہ میں اپنی زندگی سے ہاتھ دھولینا چاہیئے۔ اس طرح سید بدوی کی دعوت خوب پھیلی اور ایک خلق کثیر ان کے گرد جمع ہوگئی "۔

" لیکن حالات اس تحریک کی کامیابی کے لیے سازگار نہ تھے۔ مصر کی مسندِ ولایت پر الظاہر بیبرس البندقداری براجمان ہوگیا۔ اور اُسے صلیبی طاقتوں پر کئی مرتبہ نصرت حاصل ہوئی۔ اور مظفر قطز کی معیّت میں تاتاریوں پر بھی اُسے فتح نصیب ہوئی۔ چنانچہ اس کا نام خوب روشن ہوگیا۔ اور اس کا ستارۂ قسمت اوج پر جا پہنچا۔ عوام اس کے گرویدہ ہوگئے۔ اُس نے اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ اُس نے عباسی خاندان کے ایک شہزادے کو مصر بلا لیا اور اس کے ہاتھ بیعت خلافت کرلی۔ اس طرح سید بدوی کے منصوبہ کی اس نے بیخ کنی کردی۔ معاملہ یہیں تک نہ رہا۔ اس نے سید بدوی کے ساتھ اپنے سیاسی رویہ کو بہتر بنالیا۔ ان کے ساتھ رابطہ استوار کیا اور ان کے مرتبہ و مقام کو بالا و بلند کیا، اور انھیں اس امر کا نگراں مقرر کردیا کہ جنگی قیدی جب دشمنوں کے علاقوں سے رہائی پاکر آئیں تو وہ انھیں ان کے اہل و عیال میں تقسیم کردیں۔ یہ کام بڑے شرف و اعزاز کا سمجھا جاتا تھا۔ یہ سب حالات سید بدوی کے منصوبہ کی تکمیل سے پہلے ظہور پذیر ہوگئے۔ اور بادشاہت و حکومت عملی طور پر ممالیک کے ہاتھ ہی میں رہی اور نام نمائشی خلیفہ کا لیا جاتا رہا۔ ایک مدّت تک یہی صورتِ حال قائم رہی "۔

سید احمد بدوی کی تاریخ کے بارے میں شیخ صاوی دیر تک سلسلہ وار بیان اور تعبیر و توجیہ میں مشغول رہا اور اس نوجوان فلاّح (کسان) کی ذہانت و فکر پر انگشت بدنداں تھا جس نے بستی کے پرائمری اسکول سے آگے کوئی تعلیم نہ پائی تھی۔ مصر میں فہم و دانش اور فطانت و لیاقت کے بہت سے مدفون خزانے ملتے ہیں۔ کاش انھیں کوئی ایسا بندۂ خدا مل جاتا جو و اشگاف کرتا اور ذہن کی دنیا سے عمل کی دنیا میں لاتا !! ——— شیخ صاوی

دراز رحمہ اللہ کے مذکورہ الفاظ ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ ان میں عبرت بھی ہے اور ندرت بھی۔ تمام معاملات اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ ان الارض للہ یورثھا من یّشاء من عبادہ والعاقبۃ للمتّقین۔

قاہرہ کی جانب

ہاں، میں یہ کہہ رہا تھا کہ میں نے دار العلوم میں درخواستِ داخلہ دائر کر دی۔ اس کے بعد مجھے طبّی معائنہ اور امتحان کی تاریخ کا نوٹس بھی مل گیا۔ مجھے اب اس اطلاع کے بموجب طبّی معائنہ اور امتحان کے لیے قاہرہ کا سفر کرنا تھا۔ یہ رمضان المبارک کا مہینہ تھا۔ والد محترم نے میرے ساتھ جانا چاہا مگر میں نے اس کی کوئی ضرورت نہ سمجھی۔ میرے لیے یہی کافی تھا کہ انھوں نے نیک دعاؤں کا توشہ ہمراہ کر دیا ہے۔ تمام راستہ بھی انھوں نے مجھے بخوبی سمجھا دیا۔ اور اپنے ایک دوست کے نام خط دے دیا جو قاہرہ کے ایک خوشحال فرد اور مشہور کتب فروش تھے۔ والد محترم نے بارہا ان کی عظیم الشّان خدمات سر انجام دی تھیں اور انھیں نیکوکاری، وفا شعاری اور خیر اندیشی کی صفات سے بہرہ اندوز سمجھتے رہے۔

میں قاہرہ میں قدم زن ہو گیا۔ زندگی میں پہلی بار۔ میری عمر اس وقت ۱۶ سال سے چند ماہ ہی اوپر تھی۔ تقریباً عصر کا وقت تھا کہ میں باب الحدید میں اُتر گیا۔ اور وہاں سے عتبہ کے لیے ٹرام پر سوار ہو گیا۔ اور عتبہ سے ٹُم ٹُم پر بیٹھ کر "سیدنا الحسین" آ گیا۔ ٹُم ٹُم سے اُتر کر سیدھا مذکورہ کتب فروش کے ہاں گیا اور اسے والد صاحب کا خط دیا۔ ان صاحب نے خط کی کوئی پرواہ نہ کی اور نہ اس کے مضمون پر دھیان دیا۔ صرف اتنا کیا کہ دکان کے ایک ملازم کو کہہ دیا کہ میرا خیال رکھے۔ یہ ملازم بہت شریف اور نیک انسان تھا۔ والد صاحب سے بھی اور خود مجھ سے بھی اس کی پہلے سے شناسائی تھی۔ اس بے چارے نے میرا خیر مقدم کیا اور میری عزّت افزائی کی اور مجھے اپنے گھر لے گیا۔ وہاں ہم نے روزہ افطار کیا۔ اور پھر ہم شہر میں نکل گئے اور سحری کے وقت گھر واپس آئے۔ نمازِ فجر کے بعد میں سو گیا۔ اور جلدی ہی

بیدار ہوکر میزبان سے کہا کہ مجھے دارالعلوم کا محلِ وقوع بتا دیا جائے۔ دارالعلوم میں ایک سال پیشتر میرے برادر کریم اور یار حمیم استاذ محمد شرف حجاج ——— جواب محکمۂ تعلیم میں مدرس ہیں ——— آچکے تھے۔ خیال تھا کہ ان سے ملاقات کرلوں اور ان سے طبّی معائنہ اور امتحان کا طریق کار دریافت کرلوں۔ میرے نیک نفس میزبان نے دارالعلوم پہنچنے کا پورا طریقہ بتا دیا۔ اس کو سامنے رکھتے ہوئے میں ٹم ٹم پر سوار ہوکر عتبہ پہنچ گیا، اور وہاں سے ٹرام لے کر شارع قصر العینی آگیا۔ سامنے دارالعلوم کی عمارت تھی۔ وہاں کھڑا ہوکر طلبہ کے نکلنے کا انتظار کرنے لگا۔ اتنے میں میرا دوست آگیا، ہم بغل گیر ہوئے اور وہ مجھے محلہ عبدالباقی میں جو برکتہ الفیل میں واقع ہے اپنی اقامت گاہ میں لے آئے۔ ان کی اقامت گاہ دوسری منزل پر تھی اور وہ طلبہ کے ایک گروپ کے ساتھ یہاں رہائش پذیر تھے۔

اگلے روز صبح سویرے جب میرا دوست دارالعلوم چلا گیا تو میں مذکورہ صدر کتب فروش کے پاس آگیا۔ اب آنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ مجھے کسی ایسے چشمہ ساز کا پتہ بتا دیں جس سے میں نظر کی عینک بنوالوں اور طبّی معائنہ کے لیے پوری طرح تیار ہوجاؤں۔ لیکن ان صاحب نے حسب عادت پھر دگردانی سے کام لیا اور میں نے بھی وقت ضائع نہ کرنا چاہا۔ فی الفور ازہر چلا گیا۔ ازہر میں پہلی مرتبہ داخل ہو رہا تھا۔ اس کی کشادگی اور سادگی دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ طلبہ کے متعدد حلقے جگہ جگہ درس و مذاکرہ میں منہمک تھے۔ میں ایک ایک کرکے تمام حلقوں کے پاس ٹھہرتا رہا۔ آخر میں مجھے ایک ایسا حلقہ ملا جس میں طلبہ دارالعلوم میں داخلہ کی گفتگو کر رہے تھے۔ میں نے سمجھ لیا کہ یہ دارالعلوم کے امتحان میں بیٹھیں گے جو تقریباً دس روز کے بعد منعقد ہونے والا ہے۔ اور اسی غرض کے لیے وہ تین روز کے بعد طبّی معائنہ کرائیں گے۔ میں بھی ان کے اندر گھس گیا اور ان کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ اور ان سے کہا کہ مجھے ایسے آدمی کی ضرورت ہے جو کسی عینک ساز کی طرف میری رہنمائی کرے۔

چنانچہ ایک طالب علم نے رضاکارانہ یہ خدمت اپنے ذمّے لے لی، اور فوراً مجھے ایک لیڈی ڈاکٹر کے کلینک کی جانب لے چلا۔ یہ لیڈی ڈاکٹر میرے قیاس کی حد تک یونان کی تھی، لیکن اُس نے مصری شہریت اختیار کر رکھی تھی۔ طالب علم مذکور نے اس کی قابلیت و مہارت کی بڑی تعریف کی۔ اور بتانے لگا کہ وہ اسی لیڈی ڈاکٹر سے ایک عینک بنوا چکا ہے۔ عینک بہت اچھی تھی، اور قیمت بھی معتدل تھی۔ ہم لیڈی ڈاکٹر کے پاس پہنچے ہی تھے کہ اس نے آنکھ کا معائنہ شروع کر دیا اور پچاس قرش اس نے فیس معائنہ وصول کر لی اور نمبر دے کر ہمیں ایک عینکوں کی دکان پر بھیج دیا۔ اس دوکان دار نے ایک سو پچاس قرش لے لیے اور ہمیں فوراً عینک بنا کر دے دی۔ اب میرے سامنے اس کے سوا کوئی اور مصروفیت نہ تھی کہ میں دو روز تک دارالعلوم کے طبّی معائنہ کا انتظار کروں۔

طبّی معائنہ

میں یہ کہوں تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا کہ طبّی معائنہ میں کامیابی حیرت انگیز طریقے سے میری ہمرکاب رہی۔ جب کہ بعض دوسرے دوست شوخیٔ قسمت کا شکار ہو گئے۔ سبحان من قسم الحظوظ فلا عتاب ولا ملامۃ (بے عیب ہے وہ ذات جو قسمتوں کو بانٹتی ہے، اب کسی پر کوئی ناراضگی نہیں ہے اور نہ کسی کو ملامت ہے)۔ تین ڈاکٹر تھے، میں پہلے ڈاکٹر کی فہرست کا آخری شخص تھا۔ اور یہ ڈاکٹر تینوں میں سب سے بھلا اور نرم خُو تھا۔ اخ استاذ علی نوفل کی قسمت میں تیسرا ڈاکٹر آیا۔ اور وہ بڑا سخت دل بھی تھا اور معائنہ کرنے میں بھی سخت بے رحم تھا۔ میرے ڈاکٹر کے پاس کامیابیوں کا تناسب جس قدر اونچا تھا اس تیسرے ڈاکٹر کے پاس یہ تناسب اتنا ہی گرا ہوا تھا۔ مجھے اپنی کامیابی میں پورا پورا شک تھا مگر میں تو کامیاب ہو گیا اور استاذ علی نوفل ناکام ہو گیا۔ حالانکہ انھیں اپنی نظر کی صحت اور جسمانی تندرستی اور بھرپور تیاری کی بدولت کامیابی کا مکمل یقین تھا۔ ڈاکٹر نے انھیں مشورہ دیا کہ وہ عینک بنوا لیں اور ان کا دوبارہ معائنہ

کرلیا جائے گا۔ چنانچہ فوراً اس مشورے پر عمل درآمد کیا مگر ڈاکٹر کی بدمزاجی دوبارہ علی نوفل کی کامیابی میں حائل ہوگئی۔ اور یوں بیچارے کا یہ سنہری موقع ضائع ہوگیا۔ بعد میں اس نے آرٹس کالج کے شعبۂ ادب عربی میں داخلہ لے لیا، اوراس میں پوری ثابت قدمی دکھائی اور لیسانس (بی اے) کی ڈگری حاصل کرلی۔ درست ہے صاحب عزم کو کوئی چیز بے بس نہیں کرسکتی۔

ازہر کا ایک ہفتہ

طبّی معائنے کا نتیجہ برآمد ہوگیا۔ میرے لیے یہ بات سراسر غیر متوقع تھی کہ میرا نام بھی کامیاب ہونے والوں میں تھا۔ چنانچہ اب میں نے مزاح وتمسخر کو بالائے طاق رکھ کر پوری متانت وسنجیدگی کے ساتھ امتحانی مہم کا سامنا شروع کردیا۔ متانت کے سوا کوئی چارۂ کار بھی نہ تھا۔ امتحان کو ایک ہفتہ باقی رہ گیا تھا۔ اور یکسوئی وانہماک ہی اب کارآمد ہوسکتا تھا۔ میں نے اپنا سامان اور کتابیں اُٹھائیں اور ازہر ——— پُر رونق و بہار آفریں ازہر کی سمت چل پڑا۔ اور وہاں ٹھیک محراب قدیم کے پاس ڈیرے ڈال لیے۔ بعض ساتھیوں سے تعارف حاصل کیا جو دارالعلوم میں داخل ہو رہے تھے، اور ہم سب نے نیت کرلی کہ یہ ہفتہ علم اور برکت دونوں کی خاطر اعتکاف میں رہیں گے۔ باری باری ہم سحری اور افطاری کا کھانا تیار کریں گے۔ باری باری سوئیں گے اور کم سے کم سوئیں گے۔ خدا برباد کرے علم العروض کو میں اُس کے زحاف وعلل اور انواع و قوافی نہیں سمجھ پارہا تھا۔ یہ میرے لیے سرتاسر ایک نیا موضوع تھا۔ بس میں نے اسے رٹنا شروع کردیا۔ اسی میں عافیت تھی۔ علوم ریاضی اور علوم معاشرت کا بھی مجھے خدشہ نہ تھا۔ البتّہ صرف ونحو سے قدرے خطرہ لاحق ہوتا تھا۔ کیونکہ میں خیال کرتا تھا کہ صرف ونحوان دونوں علوم میں ازہری طلبہ ——— جو دارالعلوم میں جانا چاہتے ہیں ——— کی گرد کو بھی نہ پہنچ سکوں گا۔ یہ لوگ شہادۃ الاہلیۃ (ازہر کا

ایک سرٹیفکیٹ) سے آگے نکل چکے ہیں۔ اور اونچی جماعتوں میں پڑھتے رہے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں نے الفیہ ابن مالک حفظ کر رکھا ہے، اور الفیہ پر ابن عقیل کی شرح بھی از خود پڑھ لی ہے۔ اور بعض مضامین میں والد محترم بھی مشارکت کرتے رہے ہیں۔ لیکن یہ سب کوشش باضابطہ تعلیم کے تحت نہ تھی جس سے دل کو سکون و اطمینان ہوتا۔

امتحان کے دن گزرے اور بسلامت گزرے، مجھے ابھی تک عروض کا وہ شعر یاد ہے جس پر ہمارا امتحان ہوا تھا۔ ہمیں کہا گیا تھا کہ اس شعر کی تقطیع کریں، اور اس میں جو علل اور زحاف پائی جاتی ہیں ان کی نشان دہی کریں، اور یہ بھی بتائیں کہ یہ کس بحر میں ہے۔ وہ شعر یہ تھا ؎

لو کنت من شئی سوی بشر
کنت المنور لیلۃ البدر

رویائے صادقہ

یہ اللہ تبارک تعالیٰ کا بڑا فضل اور کرم ہے کہ وہ اپنے بندوں کو اطمینان اور سکون مہیا فرماتا ہے۔ اور جب کسی کام کو چاہتا ہے تو اس کے اسباب پیدا کر دیتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جس روز نحو اور صرف کا امتحان ہونا تھا اس رات میں نے یہ خواب دیکھا کہ میں چند جلیل المرتبت علماء و فضلاء کے ساتھ ایک خوبصورت کشتی میں سوار ہوں جو دریائے نیل کی سطح پر باد نسیم کے جلو میں ہمیں دھیرے دھیرے لیے جا رہی ہے۔ علماء میں سے ایک صاحب جنہوں نے بالائی مصر کے علماء کا لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ آگے بڑھے اور مجھے فرمانے لگے:

"الفیہ کی شرح ابن عقیل کہاں ہے؟ میں نے کہا: یہ ہے۔ کہنے لگے: آیئے ہم اس کے بعض مباحث دہرائیں۔ فلاں فلاں صفحات نکالیے۔ چنانچہ میں نے مطلوبہ صفحات کھول لیے اور ان کے مباحث کو دہرانا شروع کر دیا۔ اسی میں میری آنکھ کھل گئی۔

دل بے پایاں مسرت میں ڈوب گیا۔ اور صبح جب امتحان کے لیے گیا تو اکثر و بیشتر سوالات انہی مباحث میں سے آئے۔ یہ اللہ تبارک وتعالےٰ کی طرف سے راقم کے لیے خصوصی سہولت ارزانی فرمائی گئی۔ سچّا خواب مومن کے لیے فوری بشارت ہوتا ہے۔

والحمد للہ رب العالمین

امتحان گاہ میں

امتحان دینے کے بعد میں قاہرہ سے لوٹ آیا اور تھوڑے ہی وقفہ کے بعد میں نے ٹیچرز ٹریننگ اسکول کے ڈپلوما کا امتحان دے دیا۔ اور جب نتیجہ برآمد ہوا تو میں اسکول میں اوّل آیا۔ اور پورے ملک میں پانچویں نمبر پر۔ دار العلوم کے ٹیسٹ کا نتیجہ بھی نکل آیا اور میں کامیاب قرار دیا گیا۔ یہ کامیابی بھی میرے لیے انہونی بات تھی۔ اس لحظہ مجھے استاذ احمد بدیر یاد آرہے ہیں۔ موصوف زبانی امتحان لینے والوں میں تھے۔ بڑے ظریف الطبع تھے۔ نیا آدمی ان کی ظرافت کو بشدّت محسوس کرتا۔ میں امتحان کے لیے اُن کے سامنے بیٹھا تو پوچھنے لگے:

"دار العلوم کے شعبۂ عالی میں آنا چاہتے ہو؟" عرض کیا: "ہاں یا سیّدی"۔ چنانچہ انھوں نے مجھے خشمگیں نگاہوں سے دیکھا اور کہنے لگے: "کیا دار العلوم چھوٹا ہو گیا ہے؟: تمہاری کیا عمر ہے؟" میں نے کہا: "١٨ سال اور ٦ ماہ"۔ کہنے لگے: "انتظار کیوں نہیں کر لیا تا کہ بڑے ہو جاؤ؟"۔ میں نے کہا: "موقع ہاتھ سے نکل جائیگا"۔ کہنے لگے: "اچھا، جمع تکسیر کا باب سُناؤ۔ الفیہ یاد کر رکھا ہے یا نہیں؟" میں نے کہا: "جی ہاں یاد ہے"۔ فرمایا: "پڑھو"۔ استاذ عبد الفتاح عاشور ان کے ساتھ بھی ممتحن تھے۔ نئے آدمی کے ساتھ میں اس طرح کے مزاح و تمسخر کا عادی نہ تھا۔ میری کم سِنی تمام ساتھیوں کی نگاہوں کو متوجہ کر رہی تھی۔ یہاں تک کہ بعض اصحاب مجھے دیکھ کر کہتے: "میاں یہاں شعبۂ عالی کا امتحان ہو رہا ہے، شعبۂ تجہیزی کا امتحان اُدھر

سامنے ہو رہا ہے، مگر میں جب یہ کہتا کہ مجھے بھی شعبۂ عالی کا امتحان دینا ہے تو وہ مجھے نظر بھر کر دیکھتے اور چلے جاتے۔

استاذ بدیر کے مزاح سے میں بہت متاثر ہو گیا اور قریب تھا کہ جواب دینے سے رُک جاتا۔ مگر استاذ عاشور نے دخل دیا اور استاذ بدیر کو اس مزاح پر ڈانٹ ڈپٹ کی۔ چنانچہ استاذ بدیر میرا جواب دھیان سے سننے لگے۔ اور میں نے الفیہ فر فر پڑھنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد معلومات عامّہ، عربی ادبیات اور زبانی مباحثہ کی باری آئی۔ اور آخر کار استاذ بدیر نے مجھے دعائے خیر دی اور بڑی حوصلہ افزائی کی، اور میں اٹھ آیا۔ قرآن کریم کا امتحان استاذ احمد بک زناتی رح کے پاس تھا۔ موصوف بھی بڑے ظریف الطبع تھے، مگر ساتھ ہی خوش خو بھی۔ اس سب کے باوجود مجھے اپنی کامیابی کا یقین نہ تھا۔ نتیجہ خلافِ توقع کامیابی کی بشارت لے کر آیا۔

طلبِ علم نہ کہ طلبِ معاش

تیسری غیر متوقع یہ صورت حال سامنے آگئی کہ بُحیرہ کے بورڈ آف ایجوکیشن نے مجھے خربتا کے پرائمری اسکول میں مدرس نامزد کر دیا۔ اور مجھے دعوت دی گئی کہ گرمیوں کی چھٹیاں ختم ہوتے ہی میں اپنے کام کا چارج لے لوں۔ بنا بریں مجھے دو راستوں میں سے ایک راستہ اختیار کرنا تھا: ملازمت اختیار کر لوں یا دار العلوم میں طلبِ علم جاری رکھوں۔ لیکن آخر کار میں نے یہی ترجیح دی کہ متعلمی کی سلک سے منسلک رہوں۔ اور قاہرہ شدّ رحال کر جاؤں۔ وہاں دار العلوم بھی ہے اور اپنے شیخ جناب عبد الوہاب حصافی کا اصل ٹھکانہ بھی۔ ایک ہی پہلو مجھے مبتلائے قلق رکھے ہوئے تھا۔ وہ محمودیہ سے غیاب طویل کا احساس۔ محمودیہ وہی شہر خرّم جہاں میرا وفا شعار دوست اور محبوب بھائی احمد افندی السکری رہتا ہے۔ مگر ہم اس بات پر متفق ہو گئے کہ جب یہی اقدام اَولیٰ ہے تو اسے کر ڈالنا چاہیے۔ ہم بعد میں باہم ملتے جلتے رہیں گے۔

یا مراسلت جاری رکھیں گے۔ علم جہاد کی ایک قسم ہے، اور ہمیں اس راستے میں عزیز سے عزیز تر چیز کی قربانی سے بھی گریز نہ کرنا چاہیے۔

دار العلوم کا پہلا سال

گرمی کی چھٹیاں ختم ہو گئیں۔ میں قاہرہ آگیا اور " محلہ سیدہ زینب رضی اللہ عنہا" میں شارع مراسینہ پر مکان نمبر ۱۸ میں چند دوستوں کے ہمراہ سکونت پذیر ہو گیا۔ قاہرہ میں یہ میرا پہلا مسکن تھا۔

جس روز تعلیم کا آغاز ہوا میں دار العلوم پہنچ گیا۔ اس وقت میں سراپا شوقِ علم بن چکا تھا۔ پڑھائی کی جانب اللہ تعالیٰ نے مجھے خوب متوجہ فرما دیا۔ پہلا گھنٹہ مجھے خوب یاد ہے۔ تاہنوز ہم نے کتابیں اور دیگر سامانِ تعلیم وصول نہیں کیا تھا۔ ہمارے استاذ بدوی شاعر شیخ محمد عبد المطلب ــــــ اللہ تعالےٰ ان پر رحمت و رضوان کی بارش برسائے ــــــ اپنے لمبے تڑنگے قد کے ساتھ چبوترے پر تختۂ سیاہ کے سامنے آکر کھڑے ہو گئے۔ نئے طلبہ کی پذیرائی کی اور ان کی کامیابی اور فوز المراحی کے لیے نیک تمنّاؤں کا اظہار کیا اور پھر تختۂ سیاہ پر یہ رقم فرمایا:

عبید بن ابرص کہتا ہے:

لنا دار ورثنا مجد ھا ار   أقدم القدموس عن عم وخال

منزل منہ ا با ؤنا ار   مورثونا المجد فی أولی اللیالی

پھر انھوں نے حسبِ عادت اپنے جبّے کے بالائی حصّہ کو تھام لیا ــــــ اللہ ان پر رحمتوں کے پھول برسائے ــــــ اور ان دونوں شعروں کو ایسی جرس نما آواز کے ساتھ پڑھا جس میں افتخار و خود بینی کا صاف ترشّح ہو رہا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے ہمیں ان اشعار پر اعراب لگانے کے لیے کہا۔ میں نے دل میں کہا: " سر منڈاتے ہی اولے پڑنے لگے " اور سوچنے لگا کہ یہ " القدموس " کیا چیز ہے، اور

"منہ" شاعر نے کیوں کہا، حالانکہ وہ "أسسه" کہہ سکتا تھا۔ اور ابھی ہم اشعار کے اعراب کی تراش خراش کر رہے تھے کہ گفتگو اس طرف منتقل ہوگئی کہ عبید بن ابرص کی شخصیت کیا تھی، اس دور میں عربوں کی بود و باش اور ان کی زندگی میں جفاکشی اور رزمی کے پہلو کیا تھے۔ عربوں کی مشہور لڑائیاں، ان کے قومی خصائل، ان کے جنگ و امن کے ہتھیار، نیزوں، تلواروں اور تیروں کی قسمیں اور علی الخصوص پیکان دار تیر اور بے پیکان تیر زیر بحث آ گئے۔ تیر اندازی کے بارے میں استاذ محترم نے ذیل کے مشہور و معروف شعر کو استدلال میں پیش کیا :

ومتنى بسهم ريشه الكحل لم يضر	محبوبہ نے مجھے ایسے ناوک کا نشانہ بنایا ہے
ظواهر جلدي وهو للقلب جارح	جس کا پیکان سُرمے کا ہے، اس ناوک نے
	جسم کے ظاہری حصّوں کو تو کوئی نقصان
	نہیں پہنچایا مگر دل کو زخمی کر دیا ہے۔

موصوف نے تختۂ سیاہ پر انواع و اقسام کے تیر بنانے شروع کر دیئے اور میں اس نوع کی جامع اور ہمہ گیر بحث و تحقیق پر جھوم رہا تھا۔ اور ان کے درس کو بڑے شغف و انہماک کے ساتھ سُن رہا تھا۔ اس طرزِ تعلیم نے میرے دل میں شوقِ علم کو اور زیادہ بھڑکا دیا۔ اور دار العلوم اور اس کے اساتذہ کے لیے احترام و عقیدت اور وابستگی و گرویدگی کے جذبات میں مزید اضافہ کر دیا۔

رنگِ بے نیازی

شیخ عبد المطلب ــــــ رحمہ اللہ ــــــ کے ذکر سے مجھے یاد آیا کہ کتب فروش کے ہاں جو صاحب ملازم تھے اور جن کے ہاں میں پہلی دفعہ آکر ٹھیرا تھا، انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ دار العلوم کے مدرسین کے ساتھ ان کے تعلقات اچھے ہیں۔ علی الخصوص استاذ شیخ عبد المطلب اور استاذ شیخ علام سلامہ کے ساتھ، اور وہ ان

دونوں بزرگوں سے میرے سلسلے میں بات کر سکتے ہیں اور طبی معائنے یا امتحان ———— خواہ زبانی امتحان کا حصّہ ہی سہی ———— کے لیے ان کی سفارش حاصل کر سکتے ہیں، اور وہ آج رات ہی شیخ عبد المطلب کے گھر، شیخ کو بعض کتابیں دینے کے لیے جائیں گے اور میں بھی ان کے ساتھ شیخ کے گھر جا سکتا ہوں، کوئی حرج کی بات نہیں۔ شیخ عبد المطلب ان دنوں حلمیہ میں شارع سنجر الخازن میں سکونت رکھتے تھے۔ سنجر الخازن کا نام میں نے پہلی بار سُنا تھا۔ اور دل ہی دل میں کہہ رہا تھا کہ سنجر الخازن کون تھا؟ کیا یہ ممالیک میں سے تھا یا اتراک میں سے؟ ———— اپنے اس میزبان کے مشورے کے باوجود میں نے اپنے دل کو سفارش کے لیے آمادہ نہ پایا۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور اسی پر کفایت کی۔

البتہ ان کی باتوں سے مجھے شیخ موسیٰ ابو قمر رحمہ اللہ یاد آ گئے۔ وہ میرے رشتہ دار بھی تھے اور دار العلوم میں مدرس بھی تھے۔ میں نے میزبان سے ان کے گھر کا پتہ دریافت کیا جو انھوں نے مجھے بتا دیا۔ ان دنوں شیخ موسیٰ شارع الخلیج المصری میں رہتے تھے۔ معائنے سے پہلے دو دن میرے پاس فراغت تھی۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور شیخ موسیٰ ابو قمر کے مکان پر چلا گیا۔ دروازے کے سامنے کھڑا ہو کر اسے ایک بار کھٹکھٹایا۔ مگر اسی لحظہ میرے دل میں ایک خیال اُبھرا اور وہ میرے اوپر اس قدر غالب آ گیا کہ میں اندر سے جواب کا انتظار کیے بغیر فوراً واپس آ گیا۔ وہ خیال یہ تھا کہ مجھے محسوس ہوا کہ میں غیر اللہ کی پناہ لے رہا ہوں۔ غیر اللہ پر بھروسہ کی سوچ رہا ہوں، اور انسانوں کے آگے سر افگندہ ہونا چاہتا ہوں۔ چنانچہ میں نے فوراً یہ عزم مصمم کر لیا کہ صرف خدائے وحدہٗ لا شریک سے استعانت پر قناعت کروں گا۔ اور طبّی معائنے اور امتحان دونوں سے فارغ ہو کر ہی شیخ موسیٰ ابو قمر سے ملوں گا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا۔ بعد میں جب میں نے ان سے ملاقات کی تو وہ مجھ پر بگڑے کہ میں ان کے ہاں آ کر کیوں نہیں ٹھیرا۔ شیخ موسیٰ ابو قمر

اللہ تعالےٰ ان کو دامن رحمت میں لے، بڑے کریم النفس اور حاتم صفت انسان تھے۔
ان کا مکان کبھی مہمانوں اور حاجت مندوں سے خالی نہ رہتا تھا۔ میں نے اُن کے
سامنے اصل واقعہ بیان کر دیا۔ (یہ کہ میں ان کے مکان پر آیا اور پھر واپس لوٹ گیا)
وہ سُن کر بہت ہنسے اور اس عقیدہ و نظریہ پر مجھے خوب تھپکی دی اور اسے مزید میرے
دل میں نقش کر دیا۔ اللہ تعالےٰ ان کی نیکی کو قبول فرمائے اور اپنی جنّت ان کے لیے
کشادہ کرے۔

نیا مسکن

نئے مسکن کی تلاش کا قصہ بھی فراموش کرنے کے قابل نہیں ہے۔ جس مکان
پر ہم نے رہائش اختیار کی تھی وہ آل عاکف کا تھا۔ آل عاکف نے اپنا یہ مکان کاغذ
اور اسٹیشنری کے ایک تاجر ابراہیم بک لمعی کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ اور نیا مالک مجبور
تھا کہ وہ اس مکان کو خالی کروائے اور دیکھ بھال کے بعد اُسے ازسرِ نو استعمال میں
لائے۔ نئے مکان کی تلاش میں ہم بہت سرگرداں ہوئے۔ اور آخر کار ہمیں ایک مکان
کا سراغ مل گیا۔ جو قلعۃ الکبش میں شارع الدحدیرۃ پر واقع تھا۔ سال کے بقیہ ایام ہم
نے اسی مکان میں گزارے۔

عمومی مشاغل

قاہرہ کی زندگی سال بھر میرے لیے بڑی خوشگوار اور سعادت افروز رہی۔
امتحان میں میں درجۂ اوّل میں کامیاب ہوا۔ دارالعلوم کی طرف سے مجھے مقررہ مالی
وظیفہ ملنا شروع ہو گیا۔ یہ ایک پونڈ ماہانہ تھا۔ میں نے اس وظیفے کو غیر مدرسی کتابوں کی
خریداری کے لیے مخصوص کر دیا۔ میری موجودہ لائبریری کی بہت سی کتابیں اسی ماہانہ وظیفے
کے اثرات ہیں جو پوری تعلیمی زندگی میں میرا ہمدم رہا۔ میں ہر ہفتہ نماز جمعہ کے بعد شیخ
حصافی کے خانۂ فیض آشیانہ پر جاتا اور محفل ذکر میں شامل ہوتا۔ اور سرور و لذت کی بے پایاں

دولت سمیٹتا۔ ہفتے کی اکثر راتیں شیخ حصافی کے خلیفۂ اول علی آفندی غالب ــــــ انھیں ہم ہمیشہ سیّدنا آفندی کے لقب سے پکارتے تھے ــــــ کے دولت کدہ پر گزرتیں۔ اللہ تعالےٰ انھیں مزید طاقت وہمّت عطا فرمائے اور ہماری طرف سے انھیں نیک صلہ دے۔ ادھر برادر احمد آفندی سکری کو تقریباً میں ہر روز خط لکھتا اور وہ بھی مجھے ہر روز خط لکھتے۔ چھٹیوں کے ایّام میں اپنے شہر محمودیہ چلا جاتا اور احمد افندی سکری اور حصافی اخوان کے ساتھ یہ لمحات فرصت گزرتے۔ وفی ذالك بلاغ۔

یوں میری علمی، عملی اور روحانی زندگی استقرار و ثبات کے ساتھ گزرتی رہی، اور الحمدللہ کسی چیز نے اُسے مکدّر نہ کیا۔

واقعہ یا حادثہ

سال کے اختتام پر، آخری امتحان کے دوران بلکہ غالباً امتحان کے ابھی دو دن گزرے تھے کہ مجھے ایک حادثہ پیش آگیا جو ایک شدید المیہ بنتے بنتے رہ گیا۔ البتہ یہ حادثہ اس لحاظ سے میرے لیے موجب خیر و برکت بن گیا کہ اس کے سبب ہمارا پورا خاندان محمودیہ سے قاہرہ منتقل ہو گیا۔

ہمارا ایک ہم جماعت بھائی، جو ہمارے ہی ساتھ رہائش پذیر تھا، اور ہماری ہی طرح غریب الوطن تھا اس کے لیے یہ ناگوار تھا کہ میں امتحان میں اس سے اونچی پوزیشن لے جاؤں۔ جب کہ وہ مجھ سے عمر میں بھی بڑا ہے، اور مختلف تعلیم گاہوں میں کئی سال صرف کر چکا ہے، لہٰذا سبقت اور اوّلیت اسی کا زیادہ حق ہے اور مجھ جیسے نوعمر کو وہ یہ کیونکر اجازت دے سکتا ہے کہ کوئے سبقت لے جائے۔ یہ خیال اس کے دل و دماغ پر بری طرح چھا گیا۔ اور وہ کوئی ایسی تدبیر سوچنے لگا جس کے ذریعہ مجھے امتحان سے باز رکھ سکے۔ چنانچہ اُسے یہ تدبیر سوجھی کہ جب ہم سب محوِ خواب تھے اس نے مناسب موقع سمجھ کر تیزابی مادے کی بوتل مجھ پر انڈیل دی اور میرے چہرے اور گردن کو خاص طور پر نشانہ بنایا۔ میں کلبلا کر اُٹھا

وہ فوراً لیٹ گیا گویا نیند میں غرق ہے۔ اندھیرے میں مَیں اسے شناخت نہ کر سکا۔ میں فوراً غسل خانے کی طرف بھاگا اور مُنہ کو اس جُھلسا دینے والے مادّے سے صاف کیا۔ اتنے میں صلیبیہ کی مسجد صرغتمش سے فجر کی اذان سُنی۔ اور جلدی سے مسجد کی طرف گیا۔ نماز پڑھ کر لوٹا تو تھوڑی دیر کے لیے پھر سو گیا۔ کیونکہ رات دیر تک مطالعہ کرتے رہنے کی وجہ سے بدن چکنا چُور تھا۔

صبح اُٹھ کر اس جارحانہ کارروائی کے آثار دیکھے۔ وہ تو صُبح سویرے ہی باہر نکل گیا۔ ایک ساتھی نے بتایا کہ میں نے بالفعل اس کے ہاتھ میں ایک شیشی دیکھی ہے۔ اور جب وہ واپس آیا، اور اس سے پوچھ گچھ کی تو اُس نے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا اور اس فعل کا وہی محرک بتایا جو میں اوپر بیان کر چکا ہوں۔ اس پر وہ تمام ساتھی جو مکان میں اکٹھے رہ رہے تھے اس پر پل پڑے اور اسے خوب زدوکوب کیا اور اس کا سامان اٹھا کر سڑک پر پھینک دیا اور خود اُسے بھی مکان سے نکال دیا۔ بعض دوستوں کا یہ اصرار تھا کہ پولیس کو رپورٹ کرنی چاہیے یا دارالعلوم کی انتظامیہ کو اطلاع دینی چاہیے۔ میں نے اس امر کا ارادہ بھی کر لیا۔ مگر میرے دل میں خیال آیا کہ میں بچ گیا ہوں اور یہ اللہ تعالےٰ کا خاص احسان و فضل ہے اس پر جتنا شکر کیا جائے کم ہے اور شکر کی صرف یہی صورت ہے کہ حملہ آور کے ساتھ عفو و درگزر کا سلوک کیا جائے ومن عفا واصلح فاجرہ علی اللہ (جس نے معاف کر دیا اور اصلاح کا راستہ اختیار کیا اس کا اجر اللہ کے ذمّہ ہے) چنانچہ میں نے معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا اور اس کے متعلق قطعاً کوئی کارروائی نہ کی۔

یہ خبر محمودیہ پہنچ چکی تھی۔ امتحان ختم ہو گئے تو میں محمودیہ چلا گیا۔ نتیجہ بھی نکل آیا، اور میں الحمدللہ اوّل آنے والوں میں سے تھا۔ اپنی جماعت کے اندر میری تیسری پوزیشن تھی۔ اب والدہ محترمہ کا اصرار تھا کہ دو کاموں میں سے ایک اختیار کیا جائے۔ میں پڑھائی ترک کر دوں اور ملازمت کی طرف رجوع کر لوں یا وہ میرے ساتھ قاہرہ نقل مکانی کر جائیں۔

قاہرہ نقل مکانی

انہی دنوں میرا بھائی عبدالرحمٰن ابتدائی تعلیم مکمل کر چکا تھا۔ اب اسے ثانوی اسکول میں داخلہ لینا ضروری تھا۔ اسی طرح میرا بھائی محمد بھی پرائمری تعلیم سے فارغ ہو چکا تھا اور والدِ محترم کا خیال تھا کہ اسے ازہر میں داخل کرایا جائے۔ دوسرے بھائیوں کے لیے بھی تعلیم کا انتظام ضروری تھا۔ محمودیہ میں یہ تعلیم گاہیں میسّر نہ تھیں۔ پس حالات کا تقاضا تھا کہ قاہرہ ہی جایا جائے۔ گو سفر طویل سہی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

چھٹیاں ختم ہونے سے چند روز پیشتر والدِ محترم قاہرہ آئے اور مکان اور روزگار کی تلاش شروع کر دی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ جستجو کامرانی سے ہمکنار کی۔ اور وہ محمودیہ لوٹ آئے اور پھر ہمارا پورا گھرانہ محمودیہ سے قاہرہ منتقل ہو گیا۔ عبدالرحمٰن نے کامرس اسکول میں داخلہ لے لیا۔ محمد قاہرہ میں ازہر کی شاخ "معہد القاہرہ" سے وابستہ ہو گیا۔ اور دوسرے بھائی بھی اپنے اپنے مناسبِ حال مدرسوں میں داخل ہو گئے۔

عالمِ جذبات

اس ڈھنگ پر پورے خاندان کے یکجا ہو جانے کی مسرّت کو صرف ایک ہی احساس ـــــ نہایت شدید اور اضطراب انگیز احساس ـــــ مکدّر کر رہا تھا۔ وہ احساس اُس للّٰہی رشتۂ اخوت و محبّت اور جذبۂ رفاقت و مصاحبت سے عبارت تھا جو میرے اور برادر احمد افندی السکری کے مابین پایا جاتا تھا۔ پہلے تو ہم یہ کہہ کر دل کو تسلّی دے لیتے تھے کہ اس فراق کی بھڑاس ایّامِ تعطیلات میں نکال لیا کریں گے اور آخر کار ہمارا ٹھکانا ایک ہی شہر میں رہے گا۔ لیکن اب ہم بالکل نئی صورتِ حال سے دوچار ہو گئے ہیں۔ اور اب ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ میں محمودیہ کبھی نہ لوٹ سکوں گا، اِلّا ماشاء اللہ دلوں میں یہ خدشہ بُری طرح کھٹک رہا ہے۔ اس پر خوب سوچ بچار کرنی چاہیے اور بہتر تدبیر اس کا حل نکالنا چاہیے۔

میرے اور احمد افندی کے درمیان اس پہلو پر غور و فکر کرنے کے لیے کئی اجتماعات ہوئے۔ کئی راتیں اسی سوچ میں گزریں، گفتگوئیں ہوئیں، نشستیں جمیں اور برخاست ہوئیں، احمد افندی تاجر ہے اور تاجر کا کوئی مخصوص وطن نہیں ہوتا۔ اُسے بھی ہمارے ساتھ قاہرہ ہی کیوں نہ منتقل ہو جانا چاہیے۔ لیکن اس کے گھر والے کیا کریں گے؟۔ وہ منتقل ہونا نہیں چاہتے اور ان کے حالات بھی اس کی اجازت نہیں دیتے ہیں۔ اب کیا چارۂ کار ہو؟ ہم نے بہت سوچا۔ آخر ش اس نتیجے پر پہنچے کہ سال رواں کو تجرباتی سال ٹھیراتے ہیں۔ اس کے بعد دیکھیں گے کہ کیا ہو سکتا ہے۔

چنانچہ ہم لوگ قاہرہ منتقل ہو گئے۔ نیا سال شروع ہو گیا۔ احمد افندی نے سال کے شروع میں قریباً ایک مہینہ میرے ساتھ قاہرہ میں گزارا۔ اور پھر وہ واپس محمودیہ آگئے اور اختتامِ سال تک ہم دونوں حسبِ سابق باہم خط و کتابت سے کام لیتے رہے۔ اور پھر گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہو گئیں۔

محمودیہ میں گھڑیوں کی دوکان

جی ہاں، اب دوسری گرمائی تعطیلات آگئی ہیں۔ میرے لیے لازم ہے کہ یہ چھٹیاں بھی محمودیہ میں گزاروں۔ مگر وہاں پوری چھٹیاں قیام کرنے کے لیے کوئی حیلہ پیدا کرنا ہوگا۔ والدِ محترم سے میں نے عرض کیا کہ محمودیہ جاتا ہوں، اور وہاں اپنے لیے ایک دوکان کھولتا ہوں جس میں میں گھڑی ساز کی حیثیت سے آزادانہ کام کروں۔ تاکہ مجھے اس صنعت پر عملی عبور حاصل ہو جائے۔ والدِ محترم میرے جانے کے حقیقی سبب کو بخوبی جانتے تھے مگر وہ اکثر و بیشتر میرے ارادوں کو تسلیم کر لیتے تھے اور میرے اندر ہمیشہ یہ احساس قائم رکھتے کہ میرے اعمال و افعال پر انھیں پورا پورا اعتماد ہے۔ ان کے اس رویّے نے میرے اندر خود اعتمادی کی عادت کو خوب نشو و نما دیا۔ اسی جذبے کے تحت انھوں نے مجھے سفرِ محمودیہ کی اجازت مرحمت فرما دی۔ اور مجھے بھلائی کی وصیت کی۔ میں محمودیہ آگیا۔

اور گھڑی سازی کی دوکان کھول لی۔ اور بالفعل گھڑیوں کی مرمّت کا شغل جاری کر دیا۔ اس طرزِ حیات میں مَیں دو سعادتوں سے ہمکنار ہو رہا تھا۔ خود اعتمادی اور اپنے ہاتھوں سے کسبِ معاش کی سعادت۔ اور احمد افندی اور حصافی اخوان کے ساتھ کچھ گھڑیاں بسر کر لینے کی سعادت۔ چھٹیوں کی راتیں حصافی اخوان کے ساتھ گزرتیں۔ ہم اللہ کا ذکر کرتے۔ علم و عرفان پر مباحثے ہوتے۔ کبھی مسجد میں، کبھی گھروں پر اور کبھی شہر کے باہر کھلے میدانوں میں۔ دن کو نیل میں نہانے کا بھی اکثر موقع مل جاتا۔ میرے اور احمد افندی کے درمیان خصوصی ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہتا۔ جو اکثر پوری پوری رات کو لپیٹ میں لے لیتا۔ چھٹیوں کا پورا عرصہ میں احمد افندی کے مکان پر ہی ٹھیرا رہا۔ اس لیے ہم رات ہو یا دن کبھی باہم جُدا نہ ہوتے۔

گو ہم عبادت و ذکر میں کاملاً مشغول رہتے۔ اور طریقت کے اوراد و وظائف اور مجالس میں ہمہ تن غرق ہو جاتے مگر بایں ہمہ علم و مطالعہ کے ساتھ ہماری محبت میں کوئی کمی نہ آتی تھی۔ ہمیں ہر اس بات سے نفرت تھی جو دین کی ظاہری نصوص و احکام کے منافی ہو۔ ہم سلسلہ ہائے تصوّف سے نسبت رکھنے والوں پر ہمیشہ یہ نکیر کرتے رہتے تھے کہ وہ اسلام کی تعلیمات سے انحراف کر رہے ہیں۔ ہم طریقۂ حصافیہ کے ارادت مند تو تھے اور عبادت و ذکر اور آدابِ سلوک کی قدر و قیمت کے بھی ہم کامل اخلاص کے ساتھ قائل تھے۔ مگر ہماری فکر آزاد تھی۔ لکیر کے فقیر نہ تھے۔

ایک مثالی کردار

مجھے یاد ہے کہ جب ربیع الاوّل کا مہینہ آتا تو یکم ربیع الاول سے لے کر ۱۲ ربیع الاول تک معمولاً ہر رات ہم حصافی اخوان میں سے کسی ایک مکان پر محفلِ ذکر منعقد کرتے اور میلاد النّبی صلی اللہ علیہ وسلم کا جلوس بنا کر باہر نکلتے۔ اتفاق سے ایک رات برادرم شیخ شلبی الرجال کے مکان پر جمع ہونے کی باری آگئی۔ ہم عادۃً عشاء کے بعد ان کے مکان پر

حاضر ہوئے۔ دیکھا کہ پورا مکان خوب روشنیوں سے جگمگا رہا ہے۔ اسے خوب صاف و شفاف اور آراستہ و پیراستہ کیا جاچکا ہے۔ شیخ شلبی الرجال نے رواج کے مطابق تمام حاضرین کو شربت اور قہوہ اور خوشبو پیش کی۔ اس کے بعد ہم جلوس بن کر نکلے۔ اور بڑی مسرت و انبساط کے ساتھ مروّجہ مناقب اور نظمیں گاتے رہے۔ جلوس ختم کرنے کے بعد ہم شیخ شلبی الرّجال کے مکان پر واپس آگئے۔ اور چند لمحات ان کے پاس بیٹھے رہے۔ جب اُٹھنے لگے تو شیخ شلبی نے بڑے لطافت آمیز اور ہلکے پھلکے تبسم کے ساتھ اچانک یہ اعلان کیا کہ: "انشاء اللہ کل آپ حضرات میرے ہاں علی الصبح تشریف لے آئیں تاکہ روحیہ کی تدفین کرلی جائے۔"

روحیہ شیخ شلبی کی اکلوتی بچّی ہے۔ شادی کے تقریباً ۱۱ سال بعد اللہ نے شیخ کو عطا کی ہے۔ اس بچّی کے ساتھ انھیں اس قدر شدید محبّت و وابستگی ہے کہ دورانِ کام بھی اُسے جُدا نہیں کرتے۔ یہ بچّی نشو ونما پاکر اب جوانی کی حدود میں داخل ہو چکی ہے۔ یہ شیخ نے اس کا نام روحیہ تجویز کر رکھا ہے۔ کیونکہ شیخ کے دل میں اسے وہی مقام حاصل ہے جو جسم میں روح کو حاصل ہے۔ شیخ کی اس اطلاع پر ہم بھونچکے رہ گئے۔ عرض کیا:

"روحیہ کا کب انتقال ہوا؟" فرمانے لگے: "آج ہی، مغرب سے تھوڑی دیر پہلے۔" ہم نے کہا: آپ نے ہمیں پہلے کیوں نہ اطلاع دی۔ کم از کم میلاد النّبی صلی اللہ علیہ وسلم کا جلوس کسی اور دوست کے گھر سے نکالتے؟ کہنے لگے: جو کچھ ہوا بہتر تھا۔ اس سے ہمارے حزن وغم میں تخفیف ہوگئی۔ اور سوگ مسرت میں تبدیل ہوگیا۔ کیا اس نعمت سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کی کوئی اور نعمت درکار ہے؟ گفتگو نے درسِ تصوف کا رنگ اختیار کرلیا۔ یہ درس خود شیخ شلبی پیش کر رہے تھے۔ انھوں نے اپنی نورِ چشم اور لختِ جگر کی وفات کی توجیہ یہ کی کہ یہ موت دراصل ان کے دل پر غیرتِ الٰہی کے سبب واقع ہوئی ہے۔ کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے نیک بندوں کے دلوں سے غیرت رکھتا ہے اور یہ پسند

نہیں فرماتا کہ وہ غیر اللہ سے وابستہ ہوں یا اس کے ماسوا کسی اور ہستی کی جانب میلان رکھیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ سے انھوں نے استدلال کیا کہ جب ان کا دل حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ساتھ اٹک گیا تو اللہ تعالیٰ نے انھیں اسماعیلؑ کو ذبح کرنے کا حکم دیا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی بھی انھوں نے مثال دی اور فرمایا کہ ان کے دل میں حضرت یوسف علیہ السلام کی بے پناہ محبّت پیدا ہوگئی تو اللہ تعالیٰ نے کئی سال تک حضرت یوسفؑ کو ان سے گُم کیے رکھا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ بندے کا دل غیر اللہ کے ساتھ ہرگز وابستہ نہ ہو۔ ورنہ وہ ذات احد و صمد کے ساتھ اپنے دعوائے محبّت میں جھوٹا ہوگا۔ شیخ شبلی نے حضرت فضیل بن عیاضؒ کا قصّہ بیان کیا:

"انھوں نے اپنی چھوٹی لڑکی کا ہاتھ پکڑا اور اسے بوسہ دیا۔ لڑکی بولی: ابّا جان، کیا آپ مجھ سے محبّت رکھتے ہیں؟۔ فضیل نے کہا: "ہاں اے پیاری بیٹی!"۔ لڑکی بولی: "خدا کی قسم آج سے پہلے تک میں آپ کو کذّاب نہیں سمجھتی تھی"۔ فضیل نے پوچھا: "کیا وجہ ہے، میں نے کتنی دروغ گوئی کی ہے؟"۔ بچّی نے جواب دیا: "میرا خیال تھا کہ خدا کے ساتھ تمھارا جو تعلق ہے اس کے ہوتے ہوئے تمہیں اور کوئی چیز عزیز نہ ہوگی"۔ یہ سُن کر فضیلؒ رو پڑے۔ اور پکار اُٹھے: اے میرے آقا! بچّوں تک تیرے بندے فضیل کی ریاکاری کا پردہ فاش ہوچکا ہے"۔

اس طرح کے واقعات سے شیخ شبلی الرجال ہمارا غم ہلکا کرتے رہے، ان کی مصیبت پر ہمیں جو حزن والم لاحق ہو رہا تھا اسے دور کرتے رہے۔ اور اس رات ان کے ہاں میلاد کا پروگرام رکھنے سے ہمیں جو ندامت ہوئی اس کا ازالہ کرتے رہے۔

اگلے روز ہم علی الصبح ان کے مکان پر حاضر ہوئے اور زوجیہ کی تجہیز و تدفین میں شریک ہوئے۔ ہمیں گھر سے کسی نوحہ خواں کی آواز تک سُنائی نہ دی۔ اور نہ کسی زبان سے کوئی نازیبا کلمہ صادر ہوا۔ ہم نے صرف صبر و شکر کا بھرپور مظاہرہ دیکھا اور خدائے عظیم و برتر کے

آگے تسلیم و رضا کے سر خم ہوتے دیکھے۔

ہمارے استاذ شیخ محمد زہران کی ایک صاحبزادی بھی انتقال کر گئیں۔ مگر انھوں نے بھی اس کے سوا اور کچھ نہ کیا کہ اس سوگ کو وعظ و نصیحت کی تقریب میں بدل دیا اور متواتر تین راتوں تک یہی پروگرام جاری رکھا۔ اور یوں سوگ کی خرافات و منکرات کے سدّباب اور ان دنوں عوام النّاس جو طرح طرح کی بدعتوں اور رواجوں کا ارتکاب کرتے ہیں، انھیں ختم کرنے کی ایک قابلِ تقلید مثال قائم کر دی۔

یہ تھی وہ روحانی فضا جس میں ہم جی رہے تھے۔

قاہرہ واپسی اور جمعیت اسلامیہ میں شرکت

قاہرہ مراجعت ہوگئی۔ قاہرہ میں ان دنوں اسلامی جمعیتوں کی وہ کثرت نہ تھی جو اب ہے۔ صرف ایک جمعیت تھی: "مکارم الاخلاق الاسلامیۃ" اس کے سربراہ استاذ شیخ محمود تھے۔ اس جمعیت کا مرکز محلہ برکتہ الفیل میں دارالسادات تھا۔ اور یہ جمعیت ہر ہفتہ اپنے مرکز میں اسلامی موضوعات پر تقریروں کا اہتمام کرتی تھی۔ سامعین اتنی کثرت سے پہنچ جاتے کہ مرکز اپنی وسعت کے باوجود تنگ ہوجاتا۔ ان تقریروں میں بہت سے مفید اور مؤثر موضوعات زیرِ بحث آتے۔ جمعیت کے قاری شیخ عباس اپنی اثر انگیز آواز سے دلوں کو وجد میں لے آتے۔ جمعیت کے اجتماعات میں میں شدّت کے ساتھ پابندی کرتا رہا اور جب تک میں قاہرہ میں رہا میں اس میں رکن کی حیثیت سے شریک رہا۔

مبلّغین اسلام تیار کرنے کی تجویز

قاہرہ میں میں نے بکثرت جگہوں پر بے راہ روی اور اسلامی اخلاق سے بُعد کے ایسے مناظر دیکھے جن سے ہمیں مصری دیہات کی پُرامن فضا میں کبھی سابقہ پیش نہیں آیا تھا۔ نیز بعض اخبارات میں ایسی چیزیں چھپ رہی تھیں جو اسلامی تعلیمات کے سراسر منافی تھیں۔ اور عوام النّاس بھی احکامِ دین سے بالکل بیگانہ تھے۔ ان تمام باتوں کو دیکھ کر

میں نے دل میں کہا کہ اسلامی تعلیمات کو لوگوں تک پہنچانے کے لیے صرف مسجدیں ہی کافی نہیں ہیں۔ ان دنوں فاضل علمار کی ایک تعداد رضا کارانہ طور پر مسجدوں میں وعظ و تبلیغ کر رہی تھی۔ لوگوں کے دلوں پر ان کے مواعظ کا بہت اثر پیدا ہو رہا تھا۔ استاذ عبدالعزیز خولی رحمہ اللہ، استاذ شیخ علی محفوظ رحمہ اللہ، استاذ شیخ محمد العدوی (محکمہ اوقاف میں شعبۂ وعظ و تبلیغ کے سابق انسپکٹر جنرل) بھی اس گروہِ مبلغین میں شامل تھے۔ میں نے یہ سوچا کہ ازہری طلبہ اور دارالعلوم کے طلبہ پر مشتمل ایک گروپ بنانے کی تجویز پیش کروں۔ یہ لوگ مسجدوں میں وعظ و تبلیغ کی ٹریننگ لیں اور پھر قہوہ خانوں اور عوامی اجتماعات کی جگہوں میں تبلیغ کریں۔ اور پھر ان میں سے ایک ایسی جماعت تشکیل دی جائے جو دیہاتوں اور بستیوں اور اہم شہروں اور قصبوں میں پھیل جائے اور اسلامی دعوت کو عام کرے۔ چنانچہ میں نے اس بات کو عملی جامہ پہنایا۔ اور اس عظیم منصوبے میں شرکت کے لیے احباب کے ایک گروہ کو جمع کیا۔ ان میں سے ایک استاذ محمد مذکور تھے جو ازہر سے فارغ ہو چکے تھے مگر ابھی تک ازہر کے جوار کو انھوں نے ترک نہ کیا تھا۔ دوسرے استاذ شیخ حامد عسکریہ رحمہ اللہ اور تیسرے استاذ شیخ احمد عبدالحمید (اخوان المسلمون کی مجلس اساسی کے موجودہ رکن) اور کچھ دوسرے احباب۔

ہم لوگ صلیبیہ کی مسجد شیخون میں طلبہ کی اقامت گاہوں پر مجتمع ہوتے اور اس مشن کی عظمت و اہمیت اور اس کے لیے مطلوبہ علمی اور عملی اہلیت پر سوچ بچار کرتے۔ میں نے اپنی کتابوں کا ایک حصہ مثلاً امام غزالی کی احیاء العلوم، نبہانی کی الانوار المحمدیہ اور شیخ کردی کی تنویر القلوب فی معاملۃ علام الغیوب اور چند مناقب و سیرت کی کتابیں اس امر کے لیے مخصوص کر دیں کہ ان کتابوں سے مبلغ اخوان کے لیے ایک گشتی لائبریری بنا دی جائے، وہ ان کو مستعار لے کر پڑھیں اور اپنی تقریروں اور خطبوں کے موضوع تیار کریں۔

قہوہ خانوں میں دعوت کا کام

علمی تیاری کے بعد اب عمل کا دور آگیا۔ میں نے احباب کو یہ تجویز پیش کی کہ ہم قہوہ خانوں میں وعظ و تبلیغ کے لیے نکلیں۔ انھوں نے اس تجویز پر شدید حیرت و استعجاب کا اظہار کیا اور کہنے لگے : قہوہ خانے کے مالک تبلیغ کی ہرگز اجازت نہ دیں گے بلکہ اس کی مخالفت کریں گے کیونکہ اس سے ان کے کام معطل ہو جائیں گے، اور ان قہوہ خانوں میں بیٹھنے والوں کی غالب اکثریت ان لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے، جو اپنے آپ میں مگن ہوتی ہے۔ تبلیغ سے بڑھ کر کوئی چیز ان کے لیے گراں نہ ہوگی۔ ہم دین و اخلاق کی باتیں ان لوگوں سے کیسے کریں جنھیں لہو و لعب کے سوا کسی چیز کی فکر نہیں ہوتی جس کی خاطر وہ یہاں لپک کر آئے ہیں۔ میں دوستوں کے اس نظریئے کا مخالف تھا۔ میرا عقیدہ تھا، کہ قہوہ خانوں میں بیٹھنے والی اکثریت دوسرے ہر قسم کے لوگوں سے حتیٰ کہ مسجد نشین لوگوں سے بھی پند و نصیحت سننے کا زیادہ میلان رکھتی ہے۔ کیونکہ یہ بات ان کے لیے بیحد نرالی اور اچھوتی ہوگی۔ اصل چیز موضوع کا حسنِ انتخاب ہے۔ ہم کسی ایسی بات سے تعرض نہ کریں جو ان کے جذبات کو ٹھیس پہنچاتی ہو۔ اور دوسری چیز بات کو پیش کرنے کا صحیح طریقہ ہے۔ ہمیں اپنا مدّعا شوق انگیز اور دلکش اسلوب کے ساتھ بیان کرنا چاہیے اور تیسری چیز وقت ہے۔ ہمیں طول طویل وعظ سے احتراز کرنا چاہیئے۔

اس موضوع پر بحث و جدال طول پکڑ گیا۔ میں نے دوستوں سے کہا: "کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ عملی تجربہ کو اس نزاع کی حدِّ فاصل قرار دیں؟" چنانچہ میرا یہ مشورہ سب نے قبول کر لیا اور ہم نے باہر نکل کر صلاح الدین پارک میں واقع قہوہ خانوں سے عوامی تبلیغ کی داغ بیل ڈالی۔ وہاں سے نکل کر محلہ سیدہ عائشہ رضؓ کے قہوہ خانوں میں پہنچے اور پھر کوچہ ہائے طولون میں پھیلے ہوئے قہوہ خانوں کا رُخ کیا۔ یہاں تک کہ یہ کاروان تبلیغ طریق الجبل سے ہوتا ہوا شارع سلامہ پر جا قدم زن ہوا۔ اور سیدہ زینب رضؓ کے گلی کوچوں

کے قہوہ خانے بھی چھان مارے۔ میرا خیال ہے کہ اس ایک ہی رات میں ہم نے بیس سے زیادہ تقریریں کیں۔ ہر تقریر پانچ منٹ سے لے کر دس منٹ تک کی ہوتی تھی۔

سامعین کے عجیب وغریب احساسات مشاہدے میں آئے۔ ہماری تقریروں کے دوران لوگ ہمہ تن گوش رہے اور بڑے اشتیاق ورغبت کے ساتھ انھیں سُنا۔ قہوہ خانوں کے مالک آغاز تقریر میں تو انگشت بدنداں ہوکر ہمیں دیکھتے۔ مگر آخر میں تقاضائے مزید کرتے۔ بلکہ وہ ہمیں قسمیں دلاکر کہتے کہ ہم ضرور کوئی چیز نوش کریں یا کوئی پسندیدہ چیز طلب کریں۔ مگر ہم تنگیٔ وقت کا عذر پیش کردیتے، اور ان سے کہتے کہ یہ وقت ہم نے اللہ کے کام کی نذر کر رکھا ہے، لہذا اسے کسی اور مشغولیت میں نہیں گنوائیں گے۔ ہماری یہ توجیہ ان کے دلوں پر مزید اثر پیدا کرتی۔ اور کوئی تعجب نہیں ہے کہ اس بات میں بھی یہی راز پنہاں ہو کہ اللہ تعالیٰ نے جتنے انبیاء اور رسول مبعوث فرمائے ان سب کا اوّلین اعلان یہی تھا کہ " لا اسألکم علیہ اجرًا " (لوگو! اس نصیحت کا ہم تم سے کوئی اجر طلب نہیں کرتے)۔ کیونکہ استغناء کا موقف سامعین کے دلوں پر نہایت عمدہ اثر ڈالتا ہے۔

ہمارا پہلا تجربہ سو فیصدی کامیاب رہا۔ ہم شیخون میں اپنے مرکز میں لوٹ آئے۔ اس کامیابی پر ہم پھولے نہیں سمارہے تھے۔ ہم نے پختہ عزم کر لیا کہ اس طرز کی جدّوجہد مسلسل جاری رکھیں گے۔ ہم اکثر اوقات لوگوں سے بھی یہ عہد کرتے کہ اس طرز کی عملی تبلیغ ہم جاری رکھیں گے۔ یہ کام میرے لیے محمودیہ کی جمعیت حصافیہ سے دوری کے غم کا بھی کسی قدر مداوا ثابت ہوا۔ یہ جمعیت اب شکلاً ٹوٹ چکی تھی، مگر اس کے ارکان میں اخوت کا رابطہ باقی تھا اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر اسلام کی خدمت کرتے رہتے تھے۔ طریقۂ حصافیہ انھیں ذکر وعبادت اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر جمع کیے ہوئے تھا۔ اور عیسائی مشنری کی سرگرمیاں رہ رہ کر ان کی غیرتِ اسلامی کو مہمیز لگاتی رہتی تھیں جس نے محمودیہ جیسے پُرسکون اور امن افزا شہر میں اپنا اڈہ جما رکھا تھا۔ اس سے پہلے یہ شہر

کبھی اس وبائے عام میں مبتلا نہ ہوا تھا۔ ان مشنوں کے لیے انسب یہ ہے کہ وہ لامذہب اقوام کے علاقوں کا رُخ کریں۔ دیارِ مسلمین کو آماجگاہ نہ بنائیں۔ مسلمان تمام اقوام کی نسبت صادق الایمان اور خدا کی سچی وحدانیت کی علمبردار قوم ہے۔ اس کے دل پاک اور سینے سلامت ہیں۔ وللہ فی خلقہ شؤن۔

کمرۂ تعلیم میں

اس وقت تک دارالعلوم کی تعلیم جمود کا شکار نہ ہوئی تھی۔ بلکہ طلبہ اور اساتذہ کی عمر اور جس علمی مرحلے سے گزر رہے ہوتے تھے اس کا لحاظ رکھا جاتا تھا۔ بارہا ایسا ہوا کہ ہم کمرۂ تعلیم میں متعدد سیاسی واجتماعی امور پر بحث کرنے لگ جاتے۔ بلکہ طلبہ اور مدرسین کے چھوٹے چھوٹے ذاتی معاملات ومسائل پر گفتگو ہونے لگتی۔ ان دنوں مصر میں سیاسی جوش وخروش عروج پر تھا۔ وفد پارٹی اور دستور پارٹی میں پھوٹ پڑ چکی تھی۔ اور اس کے نتیجے میں پے در پے حوادث رونما ہو رہے تھے۔ سیاست داں متحد ہوتے پھر متفرق ہو جاتے اور متفرق ہونے والوں کے مابین ثالثوں کا عمل جاری ہو جاتا۔ کبھی یہ ثالث کامیاب ہو جاتے اور کبھی ناکامی ونامرادی کا چہرہ دیکھتے۔ یہ تمام حوادث و حقائق طلبہ واساتذہ کی سخن رانیوں کا ہدف ہوتے اور ان پر طرح طرح کے تبصرے کیے جاتے اور اساتذہ بھی اپنی آرا ونظریات طلبہ کے سامنے رکھنے میں بخل نہ کرتے۔ بلکہ بعض مذہبی افکار ونظریات بھی ایسے سامنے آجاتے جن میں طلبہ اساتذہ سے اختلاف کر جاتے اور ان کے بارے میں بحث وجدل کا دروازہ کھل جاتا مگر یہ سب باتیں جس قدر آزادی سے ہوتیں اسی قدر مکمل حدودِ ادب کی پابندی بھی ہوتی۔ ابھی تک میرے تصوّر میں یہ بات پوری طرح نقش ہے کہ ہم فاضل اساتذہ کا اس درجہ احترام و توقیر کرتے کہ کمرۂ اساتذہ کے سامنے سے نہ گزرتے۔ حالانکہ یہ کمرہ ہماری کلاسوں کے راستے میں تھا۔ مگر اس کے باوجود کہ ہمیں مکمل آزادی تھی، ہمارے ساتھ حسنِ سلوک کیا جاتا

تھا اور ہمارے اور اساتذہ کے درمیان نہایت محکم روحانی رشتے استوار ہو چکے تھے، ہم نے ادب و احترام کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔

کبھی کبھی دورانِ سبق کسی استاد سے چھیڑ خانی بھی ہو جاتی۔ اور استاذ کی جانب سے کوئی دلچسپ لطیفہ صادر ہو جاتا یا دندان شکن جواب۔ مجھے یاد ہے کہ ہمارے ایک رفیقِ درس نے ایک استاذ سے دریافت کیا کہ "کیا آپ شادی شدہ ہیں؟" استاذ نے جواب دیا: "نہیں" شاگرد نے کہا: "یاسیدی، شادی کیوں نہیں کی؟ آپ کی عمر تو کافی ہو چکی ہے؟" استاد نے جواب دیا: "یہ انتظار کر رہا ہوں کہ تنخواہ میں اس حد تک اضافہ ہو جائے کہ وہ شادی کے مصارف اور خاندان کے اخراجات کے لیے کافی ہو۔ تاکہ بچوں کی صحیح تربیت کی جا سکے۔" شاگرد کہنے لگا: "لیکن اگر آپ مزید تاخیر کرتے ہیں تو آپ اس امر کی ضمانت نہیں دے سکتے کہ آپ زندہ رہیں گے اور نہ بچوں کی تربیت کر سکیں گے۔ رزق اور اجل یاسیدی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔" استاذ نازک پوزیشن میں گھر گیا۔ اور کہنے لگا "کیا تو شادی شدہ ہے؟" اس لڑکے نے جواب دیا: "جی ہاں، میرا لڑکا میرے ساتھ روزانہ مدرسہ ابتدائیہ میں پڑھنے کے لیے گھر سے نکلتا ہے، میں اپنے مدرسے میں آ جاتا ہوں اور وہ اپنے مدرسے میں چلا جاتا ہے۔" —— یہ سن کر طلبہ زور سے ہنسے اور بحث ختم ہو گئی۔

تبدیلئ لباس

دارالعلوم کے چوتھے سال —— جو دارالعلوم کا آخری سال ہے —— یونیفارم میں تبدیلی کی تحریک شدت اختیار کر گئی۔ تمام طلبہ اس تبدیلی پر آمادہ ہو گئے —— دارالعلوم سے فارغ ہونے والے اکثر اکابر نے اس پر عمل درآمد کر کے اس خواہش کو مزید بھڑکا دیا۔ لیکن میں اور طلبہ کی ایک اقلیت اس تبدیلی کے حق میں نہیں تھے۔ چند ماہ کے اندر دارالعلوم کی یہ حالت ہو گئی کہ اس میں آنے والوں کی ایک تعداد سوٹ پوش بابوؤں کی ہوتی اور

ایک تعداد مولویوں کی۔ ہر آنے والے دن میں فیض کیپ پہننے والوں میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اور عمامہ پہننے والوں میں کمی، اور آخر میں تو صرف دو طالب علم عمامہ پوش رہ گئے۔ ایک شیخ ابراہیم الورع ———— جواب محکمۂ تعلیم میں مدرس ہیں ———— اور دوسرا یہ راقم۔ اسی دوران عملی تعلیم کی نوبت آگئی۔ دارالعلوم کے پرنسپل ایک فاضل انسان استاذ محمد بک السیّد رحمہ اللہ تھے۔ انھوں نے ہم دونوں کو بلاکر فرمایا کہ بہتر یہ ہے کہ ہم دونوں عملی تعلیم کے لیے ایسے مدارس میں جائیں جہاں نئے یونیفارم میں ہم تربیت حاصل کرسکیں۔ تاکہ طلبہ کے سامنے ہم متفرق شکلوں میں ظاہر نہ ہوں۔ کچھ لوگوں نے عمامے پہن رکھے ہوں اور کچھ نے فیض کیپ۔

استاذ کا یہ حکیمانہ فرمان گو لزوم کا مفہوم نہ رکھتا تھا۔ مگر ان کی قوّتِ تاثیر کے تحت اور ان کی رائے کے احترام کے پیشِ نظر ہم نے تبدیلیٔ لباس کا وعدہ کر ہی لیا۔ اور عرض کیا کہ اس وعدے کو ہم بے شک عملی جامہ پہنا دیں گے۔ جبہ اور عمامہ اُتار کر سوٹ اور فیض کیپ زیب تن کرلیں گے۔ مگر دارالعلوم سے فراغت سے صرف چند روز پہلے۔

مصر میں الحاد و اباحیّت کی لہر

پہلی جنگِ عظیم کے بعد اور عین اس زمانے میں جو میں نے قاہرہ میں گزارا، مصر میں اباحیّت کا طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ عقلی آزادی کے نام سے اذہان و قلوب اور افکار و آراء میں اور شخصی آزادی کے نام سے اخلاق و کردار اور اعمال و افعال میں اباحیت اُبل پڑی۔ الحاد و انارکی اور آوارگی و فساد کا ایک خوفناک اور بلاخیز طوفان برپا ہو گیا، جس کے سامنے کوئی چیز نہ ٹھیر رہی تھی۔ حوادث و حالات کے جھونکے اس کی شدّت میں مزید اضافہ کر رہے تھے۔

ترکی میں مصطفےٰ کمال نے انقلاب برپا کر دیا۔ اس نے خلافت کی تنسیخ کا اعلان کر دیا۔ ریاست کو مذہب سے الگ کر دیا۔ اور یہ تبدیلی اس ملک کے اندر نافذ کی جو چند سال پہلے

تمام دنیا کی نگاہ میں امیر المومنین کا مرکز و آستانہ تھا۔ ترکی حکومت انقلاب کی رو میں اس قدر بہ گئی کہ زندگی کے تمام مظاہر اُس نے بدل کر رکھ دیئے۔

جامعۂ مصر یہ عوامی درس گاہ کی بجائے اب سرکاری یونیورسٹی میں تبدیل ہوگئی جس کا نظم و نسق ریاست کے ہاتھ میں آگیا اور کئی باقاعدہ کالج اس کے زیرِ انتظام کر دیئے گئے۔ چنانچہ ان دنوں بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں اعلیٰ تحقیقات اور یونیورسٹی کی زندگی کا طُرفہ تصوّر سما چکا تھا۔ اس تصوّر کی روح یہ تھی کہ یونیورسٹی اس وقت تک سیکولر یونیورسٹی نہیں بن سکتی جب تک وہ مذہب کے لئے نہ لڑے اور مذہب سے ماخوذ معاشرتی روایات کے خلاف جنگ نہ کرے۔ چنانچہ یونیورسٹی مغرب سے آمدہ مادّی فکر کو من وعن قبول کرنے کے لیے دوڑ پڑی۔ اور اس کے اساتذہ اور طلبہ دونوں اباحیّت و الحاد میں مبتلا اور ہر اخلاقی قید سے آزاد ہو گئے۔

"ڈیموکریٹک پارٹی" کی داغ بیل بھی ڈالی گئی۔ مگر پیدائش سے پہلے ہی اس کا اسقاط ہوگیا۔ اس پارٹی کا لائحہ عمل اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ اس وقت کے مروجہ مفہوم کے مطابق حریّت اور جمہوریت کی دعوت پھیلائی جائے۔ یعنی اباحیّت اور بے لگامی کو فروغ دیا جائے۔

شارع المناخ پر ایک نام نہاد فکری اکیڈمی بھی قائم کر دی گئی۔ اور تھیوسوفیکل لوگوں کی ایک جماعت اُس کی نگراں قرار پائی۔ اس میں ایسی تقریریں کی جاتیں جن میں تمام قدیم مذاہب پر حملے کیے جاتے اور ایک نئے دین اور نئی وحی کی بشارت دی جاتی۔ اس کے مقررین مسلمانوں، یہودیوں اور عیسائیوں پر مشتمل ایک معجون مرکب تھے۔ تمام مقررین اسی جدید نظریئے کو مختلف پہلوؤں اور زاویوں سے اُچھالتے۔

بے شمار کتابیں، رسائل اور اخبارات میدان میں آ گئے۔ ان کی ہر ہر سطر سے جو نظریہ ٹپکتا تھا جس کا ہدف یہ تھا کہ ہر طرح کے دینی اثرات کو کمزور کر دیا جائے۔ یا انھیں قوم

کے دلوں سے کلیتہً محو کر دیا جائے تاکہ قوم ــــــــ ان نئے مصنّفوں اور ادیبوں کے خیال کے مطابق ــــــــ فکر و عمل کے لحاظ سے حقیقی آزادی سے ہمکنار ہو سکے۔

قاہرہ میں کئی بڑے بڑے گھروں کے اندر "سیلون" آراستہ کر دیئے گئے جن کا رُخ کرنے والے انہی افکار و نظریات کو اُجاگر کرتے اور پھر نوجوانوں کے اندر اور دوسرے مختلف حلقوں کے اندر ان کی اشاعت کرتے۔

ردِّ عمل

اباحیت والحاد کے اس سیلاب کا اس نوعیت کے امور سے دلچسپی رکھنے والے حلقوں میں شدید ردّ عمل برپا ہوا۔ مثلاً ازہر اور دیگر اسلامی مراکز اور اداروں کے اندر۔ لیکن جمہور دو قسموں میں بٹ چکے تھے۔ ایک نوجوان طبقہ جو جدید طرز کے خیالات پر ریشہ خطمی ہو رہا تھا اور دوسرے جاہل عوام جو رہنماؤں کی کمی کی وجہ سے ان معاملات میں غور و فکر سے عاری ہو چکے تھے۔ میں یہ تماشا دیکھ کر شدید کرب محسوس کر رہا تھا۔ میری نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ میری محبوب مصری قوم کی حیات اجتماعیہ دو چیزوں کے درمیان لڑکھڑا رہی ہے۔ ایک طرف وہ محبوب اور گراں بہا اسلام ہے جو اُسے ورثے میں ملا ہے۔ جس کی وہ محافظ چلی آ رہی ہے، جس کی محبت اس کے رگ و ریشے میں رچی ہوئی ہے، جس کی فضا میں اس نے زندگی بسر کی ہے اور جس کی بدولت اُسے چودہ صدیوں تک عزّت و سرخروئی حاصل رہی ہے ــــــــ ایک طرف یہ اسلام ہے۔ اور دوسری طرف مغرب کی یہ تیز و تند یلغار ہے جو ہر نوع کے نہایت کارگر اور تباہ کن اسلحہ سے لیس ہے۔ مال و جاہ کا اسلحہ، ظاہری چمک دمک کا اسلحہ، لذّت و تعیش کا اسلحہ، طاقت و نفوذ کا اسلحہ اور پروپیگنڈے کے وسائل کا اسلحہ۔

میرا یہ درد و غم کسی حد تک یوں ہلکا ہو جاتا کہ میں اپنا یہ جانکاہ احساس دار العلوم، جامع ازہر اور دوسرے تعلیمی اداروں کے طلبہ میں سے اپنے بہت سے اخلاص پیشہ اور وفا شعار دوستوں کے کانوں میں ڈالتا رہتا۔ شیخ حامد عسکری رحمہ اللہ، شیخ حسن عبد الحمید،

حسن افندی فضلیہ، احمد افندی امین، شیخ محمد بشر، محمد سلیم عطیہ، کمال افندی لبّان (یہ ان دنوں لا ر کالج کے طالب علم تھے)۔ یوسف افندی لبان، عبدالفتاح کیرشاہ، ابراہیم افندی مدکور، سیّد افندی نصار حجازی، برادر محمد افندی شرنوبی اور قاہرہ کے صحافی اخوان میں سے تعلیمیافتہ لوگ۔ یہ وہ نیک نفس انسان تھے۔ جو مذکورہ بالا حالات پر اپنی مجلسوں میں اظہار خیال کرتے رہتے اور ان کے توڑ کے لیے بھرپور اسلامی تحریک برپا کرنے کا فریضہ محسوس کرتے رہتے۔ یہ گفتگو کسی حد تک غمِ دل کا مداوا اور ذہنی کرب و اندوہ کی تلافی کا سامان پیدا کرتی رہتی۔

مکتبہ سلفیہ میں آمدورفت بھی دل کے لیے وجہ تسلّی بنی رہتی۔ ان دنوں یہ مکتبہ کورٹ آف اپیل کے قریب واقع تھا۔ وہاں ایک مردمومن ومجاہد، صاحب عمل و شجاعت عالم اور قادرالکلام اسلام دوست صحافی سیّد محب الدین الخطیب[۱] سے ملاقات رہتی۔ اور ان نامور علماء اور فضلاء کی ہم نشینی نصیب ہوتی جو اسلامی غیرت اور دینی حمیت میں شہرت خاص رکھتے تھے۔ مثلاً استاذ کبیر سیّد محمد الخضر حسین[۲]، استاذ محمد احمد الغمراوی، احمد تیمور[۳] پاشا رحمہ اللہ اور

---

[۱] سیّد محب الدین الخطیب مصر کے نامور سلفی مجاہد اور جری داعئ اسلام تھے۔ الفتح کے نام سے ان کا ہفت روزہ اسی شان وشوکت کا حامل تھا جو ہندوستان میں مولانا آزاد مرحوم کے الہلال کو حاصل تھی۔ محب الدین الخطیب نے دعوت وتربیت اور اصلاح وتجدید کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ مصر میں اسلامی تحریک کے قیام میں ان کی کوششوں کو بڑا دخل حاصل ہے۔ راقم (حامدی) نے ۱۹۶۴ء میں قاہرہ میں مکتبہ سلفیہ کے اندر ان سے ملاقات کی۔ مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ ان دنوں جیل میں تھے۔ محب الدین الخطیب نے اس ابتلاء پر اپنی شدید آزردگی کا اظہار کیا اور راقم کو ایک احتجاجی بیان بھی تحریر کرکے دے دیا۔ ۱۹۶۶ء میں ان کا انتقال ہوا۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

[۲] سیّد محمد الخضر حسین مصر کے نہایت صاحب بصیرت اور وسیع النظر عالم (بقیہ صہ ۱۸۹ پر)

عبد العزیز پاشا محمد رحمہ اللہ۔ مؤخر الذکر ان دنوں کورٹ آف اپیل میں مشیر قانون تھے۔ ان حضرات کی باتوں سے بھی کچھ نہ کچھ دل کی بھڑاس نکل جاتی۔ دار العلوم بھی آنا جانا رہتا۔ اور استاذ سید رشید رضا رحمہ اللہ کی مجالس میں بھی حاضری دیتا۔ اور وہاں بھی شیخ عبد العزیز خولی رحمہ اللہ اور شیخ محمد العدومی جیسے دانائے راز اور فضلائے روزگار ہستیوں سے ملاقات ہوتی۔ اور ملکی و ملّی حالات بھی موضوع محفل بنتے۔ خلافِ اسلام سازشوں اور معاندانہ کارروائیوں کا قلع قمع کرنے میں سیّد رشید رضا[1] نے بڑی کامیاب معرکہ آرائیاں کی ہیں۔

مثبت کوشش

لیکن کوشش کی یہ مقدار کافی تھی نہ شافی۔ علی الخصوص جب کہ نئی روشدت اختیار کر چکی تھی۔ میں دونوں کیمپوں کا بغائر جائزہ لے رہا تھا۔ اباحیت و تجدّد کا کیمپ قوت و شباب پر تھا اور اسلامی کیمپ روز بروز سکڑتا اور سمٹتا جا رہا تھا۔ میرا اضطراب و قلق شدید تر ہوگیا۔ حتیٰ کہ مجھے یاد ہے کہ اس سال رمضان المبارک کا نصف مہینہ سخت بے خوابی میں گزرا۔ بے چینی کی شدت اور حالات پر مسلسل سوچ بچار کی وجہ سے پلکیں نیند سے نا آشنا ہو چکی تھیں۔ میں نے کوئی مثبت کام کرنے کا تہیّہ کر لیا۔ اور اپنے دل میں کہا: " میں ان مسلمان رہنماؤں پر یہ ذمہ داری کیوں نہ ڈالوں " اور کیوں نہ انھیں پوری

(بقیہ حاشیہ ۱۸۸) سمجھے جاتے ہیں۔ جنرل نجیب کے عہد میں جامعہ ازہر کے ریکٹر بھی رہے ہیں۔ فقہ و دعوت پر ان کی متعدد تالیفات ہیں۔ قادیانیوں پر بھی ایک ان کا جامع مضمون ہے۔ مصری علماء میں سے یہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے فتنۂ قادیانیت پر قلم اٹھایا ہے۔

[۱] سید رشید، عنا برصغیر ہند و پاک کے لیے تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ بیسویں صدی کے مجدّدین میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

[۲] مصر کے نامور ادیب، مصلح اور مورّخ۔

قوّت سے جھنجھوڑوں کہ وہ اس سیلاب کا سدِّباب کرنے کے لیے متحد و متفق ہو جائیں۔
اگر یہ حضرات مان جائیں تو بہت اچھا، ورنہ پھر ہم کوئی دوسری تدبیر اختیار کریں گے۔"
چنانچہ اس بات کا میں نے مصمم ارادہ کر لیا اور پھر اس پر عمل درآمد شروع کر دیا۔

شیخ دجوی کی خدمت میں

میں شیخ یوسف الدجوی ــــــــ اللہ ان پر رحم فرمائے ــــــــ کی
تحریریں اکثر پڑھتا رہتا تھا۔ موصوف خوش اخلاق، شیریں گفتار اور صاف دل انسان تھے
صوفیانہ تربیت و ذوق کی وجہ سے میرے اور ان کے درمیان روحانی اور علمی رشتہ تھا، جو
مجھے گاہے بگاہے اُن کی زیارت پر مجبور کرتا رہتا۔ کبھی قصر الشوق میں ان کے دولت کدہ
پر، یا کوچۂ ازہر میں عطفۃ الدویدادی کے اندر۔ مجھے معلوم تھا کہ اسلامی کیمپ کے
بہت سے علماء داعیان کے ساتھ شیخ کے روابط ہیں اور وہ شیخ سے بڑی محبت و عقیدت
رکھتے ہیں۔ میں نے طے کر لیا کہ شیخ سے ملاقات کروں اور ان کے سامنے اپنا عندیہ
بیان کروں، اور اس نظریئے ــــــــ متحدہ اسلامی جدوجہد کے نظریئے ـــ
کو روبعمل لانے اور اس مقصد تک رسائی حاصل کرنے کے لیے ان سے مدد طلب کروں۔
چنانچہ روزہ افطار کرنے کے بعد میں اُن کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان کے گرد علماء کی
ایک جماعت اور چند معززین جمع تھے۔ ان میں سے ایک فاضل بزرگ جن کا نام اب
بھی مجھے یاد ہے احمد بک کامل تھے۔ ان صاحب سے پھر دوبارہ کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔
میں نے شیخ کے سامنے حالات کی پوری تصویر بیان کی۔ انھوں نے بھی بڑے
رنج و ملال کا اظہار کیا۔ اور اس نئے مرض کی علامات گنوانے لگے۔ اور امت مسلمہ میں اس
کے پھیلنے سے جو بُرے اثرات مترتّب ہو رہے ہیں ان کا ذکر کرنے لگے۔ اور پھر اسلامی
کیمپ کا ذکر کیا، جو اپنے خلاف سازش کرنے والوں کے سامنے کمزور و ناتواں ہو چکا ہے۔
بتانے لگے کہ کس طرح ازہر نے نئی رو کو روکنے کی سعئ بسیار کی مگر نہ روک سکا ـــ انجمن

"نہضۃ الاسلام" پر گفتگو چھڑ گئی جسے خود شیخ اور چند دوسرے علماء نے مل کر تشکیل دیا تھا. اس انجمن کی کوششیں بھی سودمند نہ ہوئیں۔ ازہر نے عیسائی مبلّغین اور ملاحدہ کے خلاف جو جد و جہد کی ہے اس پر گفتگو ہوئی، جاپان میں منعقد ہونے والی مذاہب کانفرنس اور وہ اسلامی رسالے جو شیخ نے تصنیف کئے اور انھیں کانفرنس کے نام بھیجا، زیرِ بحث آئے۔ ان سب باتوں کا خلاصہ یہ تھا کہ ہر طرح کی کوششیں کر دیکھی ہیں ان کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ انسان کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ اپنی ذات کی فکر کرے اور اپنے آپ کو اس گردابِ بلا سے بچالے۔

مجھے یاد ہے کہ انھوں نے تمثیلاً ایک شعر بھی پڑھا۔ وہ اس شعر کو بکثرت مثال میں پیش کیا کرتے تھے۔ اور ایک موقع پر انھوں نے اپنے کارڈ پر مجھے بھی یہ لکھ دیا تھا۔ اسی شعر کو انھوں نے یہاں بھی دہرایا۔ وہ یہ ہے:۔

وما ابالی اذا نفسی تطاوعنی	اگر میرا نفس نجات پانے کے لیے میرا
علی النجاۃ بمن قد مات او ھلکا	ہمنوا ہے تو پھر مجھے کوئی پروا نہیں ہے
	کہ کون مرا اور کون ہلاک ہوا۔

شیخ نے مجھے بھی تلقین کی کہ میں بقدرِ استطاعت کام کرتا رہوں۔ اور نتائج اللہ پر چھوڑ دوں۔ اللہ ہر نفس کو صرف اتنی ہی تکلیف دیتا ہے جو اس کے بس میں ہوتی ہے۔

قدرتی طور پر شیخ کی یہ بات مجھے اچھی نہ لگی۔ مجھے شدید طیش آگیا۔ میری آنکھوں کے سامنے اپنے مشن میں ناکامی کا خوفناک بھوت ناچنے لگا۔ ظاہر ہے کہ ان رہنماؤں میں سے جس رہنما سے بھی میں ملوں اگر اس کی طرف سے ایسے ہی جواب کا سامنا ہوا تو ناکامی اور مایوسی کے سوا کچھ نتیجہ برآمد نہ ہوگا۔ میں نے کرخت آواز میں شیخ سے کہا: محترم! آپ نے جو کچھ فرمایا ہے میں اس کی پوری مخالفت کرتا ہوں۔ میرا خیال یہ ہے کہ معاملہ ضعفِ ارادہ، کم کوشی اور ذمہ داریوں سے گریز کے سوا کچھ نہیں ہے۔ آپ حضرات کس

چیز سے ڈرتے ہیں؟ حکومت سے یا ازہر سے؟ ——————— تمہارے لیے پنشن ہی کافی ہے۔ گھروں میں بیٹھ جائیے اور اسلام کے لیے کام کرنا شروع کر دیجیے۔ قوم فی الحقیقت تمہارے ساتھ ہے۔ تم قوم کا سامنا تو کرو۔ یہ مسلمان قوم ہے۔ میں نے مسلم قوم کو قہوہ خانوں میں دیکھا، مسجدوں میں دیکھا، سڑکوں اور فٹ پاتھوں پر دیکھا۔ میں نے ہر جگہ اسے ایمان سے لبریز پایا ہے۔ لیکن یہ عظیم طاقت نظر انداز کی جا رہی ہے۔ یہ ملحد اور اباحیت پسند افراد کیا حقیقت رکھتے ہیں۔ ان کے اخبارات اور رسالے اس لیے نکل رہے ہیں کہ آپ لوگ خوابِ غفلت میں سو رہے ہیں۔ اگر آپ لوگ چوکنے اور ہوشیار ہوتے تو یہ سب اپنے بلوں میں گھس جاتے۔

استاذِ محترم! اگر تم اللہ کے لیے کچھ نہیں کرنا چاہتے تو اپنی دنیا کی خاطر ہی کچھ کرو اور اس روٹی کی خاطر کچھ کرو جو تمہیں اس وقت مل رہی ہے۔ کیونکہ اگر اس قوم کے اندر سے اسلام مٹ گیا تو ازہر بھی مٹ جائے گا اور علماء بھی مٹ جائیں گے۔ پھر تمہیں کھانے کو کچھ ملے گا نہ پہننے کو۔ لہٰذا اگر تم گلستانِ اسلام کا دفاع نہیں کرتے تو اپنی ذات کا دفاع تو کرو۔ آخرت نہیں بنانا چاہتے نہ بناؤ دنیا تو بناؤ۔ ورنہ تمہاری دنیا بھی برباد ہو جائے گی اور آخرت بھی۔"

میں بڑے جوش و انفعال اور تندی کے ساتھ گفتگو کر رہا تھا۔ یہ گفتگو سوختہ اور زخمی دل کی آواز تھی۔ حاضرین میں سے ایک مولوی صاحب طیش کے ساتھ اٹھے اور ویسی ہی تندی اور کرختگی کے ساتھ میری تردید کرنا شروع کر دی، اور مجھ پر یہ الزام لگایا کہ میں نے شیخ کی بے ادبی کی ہے، اور ان کی شان کے منافی اندازِ گفتگو اختیار کیا ہے۔ بلکہ میں نے علماء اور ازہر کی شان میں بھی گستاخی کی ہے، اور اس طرح میں خود اسلام کی بے حرمتی کا مرتکب ہوا ہوں جو بڑا طاقت ور اور غالب دین ہے۔ اسلام کبھی کمزور نہیں ہوگا کیونکہ خود اللہ تعالیٰ نے اسلام کی نصرت کی ذمّہ داری لے رکھی ہے۔

پیشتر اس کے کہ میں مولوی صاحب کی بات کا جواب دیتا احمد بک کامل ـــــ جن کا ذکر اُوپر گزر چکا ہے ـــــ اُٹھا اور کہنے لگا

"مولانا! نہیں ہرگز نہیں۔ یہ نوجوان حق بات کہہ رہا ہے۔ آپ کا فرض ہے کہ اُٹھیں اور نکلیں۔ کب تک ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہو گے۔ یہ نوجوان تم لوگوں سے صرف یہ چاہتا ہے کہ اسلام کی حمایت کے لیے یکمشت ہو جاؤ۔ اگر آپ لوگوں کو اجتماع کے لیے کوئی جگہ چاہیے تو یہ میرا گھر حاضر ہے۔ تمہارے تصرف میں دیئے دیتا ہوں۔ وہاں تم جو چاہو کرو۔ اگر مال چاہتے ہو تو مسلمانوں کے اندر مخیّر افراد کی کمی نہیں ہے۔ لیکن تم ملّت کے پیشوا نکل پڑو۔ ہم آپ کے پیچھے ہیں۔ یہ کھوکھلی حجت بازی اب کچھ نفع مند نہیں رہی"۔

میں نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے ایک شخص سے دریافت کیا کہ یہ کون مردِ مومن ہے؟۔ اس نے مجھے اس کا صرف نام بتایا جو اب تک میرے ذہن میں منقش ہے۔ لیکن پھر وہ نظر نہیں آیا۔ ہماری یہ مجلس دو گروہوں میں بٹ گئی۔ ایک گروہ حضرت مولانا کا حامی اور مؤید تھا اور دوسرا گروہ احمد بک کامل کا ہمنوا تھا۔ شیخ دجویؒ خاموش بیٹھے رہے۔ پھر انھیں یہ نزاع روک دینے کی سوجھی اور فرمانے لگے: بہرحال، اللہ تعالےٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کام کی توفیق دے جس میں اس کی خوشنودی ہے۔ بے شک ارادے سب کے یہی ہیں کہ کام کیا جائے۔ معاملات کی باگ ڈور خدا کے ہاتھ میں ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب شیخ محمد سعد سے ملاقات کا وقت ہے۔ چلیے ان سے ملاقات کر آئیں۔

ہم سب شیخ محمد سعد کے مکان پر پہنچ گئے۔ ان کا مکان شیخ دجویؒ کے مکان سے قریب ہی تھا۔ میں نے کوشش کی کہ میری نشست شیخ دجویؒ سے بالکل متصل ہو، تاکہ میں ان سے مطلب کی بات چیت کر سکوں۔ شیخ محمد سعد نے رمضان المبارک

کی روایتی مٹھائیاں طلب کیں جو حاضرین کو پیش کی گئیں۔ شیخ اُن میں سے کچھ لینے کے لیے آگے بڑھے۔ میں بھی ان کے بالکل قریب ہو گیا۔ جونہی انھیں محسوس ہوا کہ میں بھی ان کے پاس بیٹھا ہوں۔ پوچھنے لگے کون صاحب ہیں؟ میں نے کہا: "میں فلاں ہوں"۔ کہنے لگے: "تم بھی ہمارے ساتھ آگئے؟" میں نے عرض کیا: "جی ہاں یا سیّدی۔ جب تک ہم کسی نتیجے پر نہیں پہنچ جاتے، میں ہرگز آپ سے جُدا نہ ہوں گا"۔ شیخ موصوف نے نُقل کی ایک مٹھی بھری اور مجھے تھما کر فرمانے لگے: "پکڑو، ان شاء اللہ ہم کچھ سوچیں گے"۔ میں نے کہا: "سبحان اللہ! محترم، معاملہ اب زیادہ غور و فکر برداشت نہیں کر سکتا۔ عمل کا متقاضی ہے۔ اگر ان میووں اور مٹھائیوں کا میں شائق ہوتا تو میں انھیں ایک دو قرش میں خرید لیتا اور اپنے گھر پر ہی آرام کرتا اور آپ سے ملاقات کی زحمت نہ اُٹھاتا۔ محترم! اسلام کے خلاف یہ سنگین اور گھمسان کی جنگ برپا ہے مگر اسلام کے حامی اور نام لیوا اور مسلمانوں کے ائمہ و پیشوا نائو نوش میں غرق ہو کر اپنا وقت گزار رہے ہیں۔ کیا آپ لوگ اس گمان میں مبتلا ہیں کہ جو کارستانی آپ کر رہے ہیں اس پر وہ کوئی محاسبہ نہیں کرے گا؟ اگر آپ لوگوں کے سوا اسلام کے کوئی اور پیشوا اور نگہبان ہیں تو مجھے ان کا پتہ دیں، مَیں ان کے پاس چلا جاؤں۔ شاید مجھے ان کے ہاں وہ چیز مل جائے جو آپ کے پاس نہیں ہے؟" —— محفل پر حیرت افزا سکوت طاری ہو گیا۔ شیخ دجویؒ اشکبار ہو گئے اور آنسوؤں سے ان کی ڈاڑھی تر ہو گئی۔ حاضرین میں سے کچھ اور حضرات بھی رو پڑے۔

شیخ رحمہ اللہ نے پردۂ سکوت چاک کیا اور گہرے غم اور شدید تاثر میں ڈوب کر فرمایا: "صاحب، میں کیا کروں؟" میں نے کہا: "یا سیّدی، بات آسان ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ اہلِ علم، ذی وجاہت اور با اثر لوگوں میں سے ان افراد کے نام تجویز کریں جن میں دینی غیرت و حمیت کے آثار ہویدا ہوں۔ یہ لوگ سر جوڑ کر بیٹھیں کہ ان حالات میں انھیں کیا کچھ کرنا چاہیے۔ الحاد و

اباحیت کے علم بردار اخبارات کے مقابلے میں کوئی اخبار ہی جاری کریں خواہ ہفت روزہ ہی سہی۔ اور اس زہریلے لٹریچر کا رد کریں اور جوابی لٹریچر میدان میں لائیں۔ انجمنیں تشکیل دیں۔ جن کی طرف نوجوان رجوع کریں۔ وعظ و تبلیغ کی مہم کو تیز تر کریں۔ اس طرح کے متعدد کام سرانجام دیئے جا سکتے ہیں۔"

شیخ رحمہ اللہ نے فرمایا: " خوب "۔ اور ساتھ ہی طشتری اور سامان خورد و نوش کو آگے سے اُٹھانے کا حکم دیا۔ اور کاغذ قلم طلب کیا اور فرمایا: " لو لکھو "۔ ہم نے مختلف ناموں پر بحث کی۔ اور پھر جلیل المرتبت اور بلند پایہ علماء کی طویل فہرست تیار کر لی۔ ان علماء میں سے چند نام مجھے یاد ہیں۔ خود شیخ دجوی[۱] رحمہ اللہ، شیخ محمد الخضر حسین، شیخ عبدالعزیز جاویش[۲]، شیخ عبدالوہاب نجار، شیخ محمد الخضری[۳]، شیخ محمد احمد ابراہیم اور شیخ عبدالعزیز الخولی ـــــــ اللہ تعالیٰ ان سب حضرات پر رحمت نازل فرمائے۔

---

[۱] ۱۹۱۹ء میں انگریزوں کے خلاف مصر میں جو بغاوت برپا ہوئی تھی اس میں شیخ دجوی بھی شریک تھے۔ اور ازہر کے جن علماء نے اس بغاوت میں بھرپور عملی حصہ لیا تھا ان میں سرِفہرست تھے۔

[۲] عبدالعزیز جاویش، جمال الدین افغانی مرحوم، اور شیخ محمد عبدہٗ کے جانشین سمجھے جاتے تھے۔ انھوں نے صحافت اور تعلیم و تربیت کے ذریعہ اسلامی احیاء کی قابلِ قدر کوششیں انجام دیں۔ زندگی بھر مصر کی آزادی اور خلافتِ عثمانیہ کے تحت عالمِ اسلامی کے اتحاد کے لیے کوشاں رہے " الاسلام دین الفطرۃ " ان کی ایک عمدہ تالیف ہے۔

[۳] یہ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں " نور الیقین فی سیرۃ الرسول الامین " سیرت نبوی پر ہے اور " محاضرات فی تاریخ الامم الاسلامیۃ " کے نام سے اسلامی تاریخ پر ان کی عظیم الشان تقریروں کا مجموعہ ہے۔ اسی طرح ان کی کتاب " تاریخ التشریع الاسلامی " اسلامی فقہ کی نہایت مستند تاریخ ہے۔

سید محمد رشید رضا رحمہ اللہ کا نام سامنے آیا۔ شیخ دجوی فرمانے لگے: لکھو، لکھو ان کا نام بھی ضرور لکھو۔ یہ کوئی فروعی مسئلہ نہیں ہے جس میں ہم اختلاف کریں۔ بلکہ یہ اسلام اور کفر کا مسئلہ ہے۔ شیخ رشید سب سے بہتر طور پر اپنے قلم اور علم اور اخبار کے ذریعہ اسلام کا دفاع کر سکتے ہیں۔" شیخ رشید اور شیخ دجوی کے مابین بعض امور میں اختلافِ رائے پایا جاتا تھا۔ مگر اس کے باوجود شیخ دجوی کی طرف سے شیخ رشید کی اسلامی خدمات کے حق میں یہ ایک اچھا سرٹیفکیٹ ہے۔ معزز اور بااثر حضرات میں سے جن لوگوں کے نام قلم بند کیے گئے وہ یہ ہیں:

" احمد تیمور پاشا، نسیم پاشا، ابوبکر یحیٰی پاشا، متولی بک غنیم، عبدالعزیز بک محمد —— جواب عبدالعزیز پاشا محمد کہلاتے ہیں —— اور عبدالحمید بک سعید رحمہم اللہ اور ان کے علاوہ اور بہت سارے حضرات۔

اس کے بعد شیخ نے فرمایا " اب یہ تمہاری ذمہ داری ہے کہ ان میں سے جنہیں تم جانتے ہو ان کے پاس تم جاؤ۔ اور جنہیں میں جانتا ہوں ان کے پاس میں جاؤں گا، اور ایک ہفتہ کے بعد ان شاء اللہ ہم باہم ملیں گے۔

ہم بارہا ملتے رہے اور مذکورہ بالا اصحابِ علم و فضل حضرات پر مشتمل اسلامی حرکت کے لیے عمدہ بیج اور کامیاب نیو فراہم ہوگئی۔ عید الفطر کے بعد اس جماعتِ فضلاء نے یکے بعد دیگرے اجتماعات شروع کر دیئے۔ اور پھر ایک طاقت ور اسلامی جریدہ " الفتح " منصۂ ظہور پر آگیا۔ اس کے رئیس التحریر شیخ عبدالباقی سرور نعیم رحمہ اللہ تھے اور منیجر سید محب الدین خطیب۔ بعد میں اس کی ایڈیٹری سید محب الدین کے ہاتھ میں آگئی۔ موصوف نے اسے خوب پروان چڑھایا اور عروج بخشا۔ اور فی الواقع یہ جریدہ موجودہ تعلیم یافتہ، غیور اور اسلام پسند نوجوان نسل کے لیے مشعلِ ہدایت اور قندیلِ نور تھا۔

یہ علماء و فضلاء کا چیدہ و خجستہ گروہ دارالعلوم کو میرے خیر باد کہہ دینے کے بعد

بھی متواتر سرگرمِ عمل رہا۔ اور مخلص نوجوانوں کا ایک گروہ اسے حرکت میں لاتا رہا۔ اور یہی کوششیں اور سرگرمیاں ہی بعد میں "جمعیت الشبان المسلمین" کی شکل اختیار کرگئیں۔

انشاپردازی کا موضوع

ہمارے استاذ محترم شیخ احمد یوسف نجاتی ـــــــ اللہ تعالٰی انھیں نیک صلہ دے ـــــــ انشاپردازی کے لیے مزے دار عنوانات منتخب کرنے کے بہت شوقین تھے۔ اس باب میں وہ ہمارے ساتھ بڑی بذلہ سنجی دکھاتے رہے اور ہمیں دلچسپ چٹکلوں اور طرفہ پھبتیوں سے نوازتے رہتے۔ جب وہ ہمارے لمبے لمبے مضامین کی تصحیح سے اُکتا جاتے اور اس حال میں کہ انھوں نے کاپیاں ہاتھ میں لے رکھی ہوتیں اور وہ ان کے بار سے اسی طرح دب رہے ہوتے جس طرح وہ رات بھر ان کی تصحیح کرتے کرتے تھک چکے ہوتے تھے فرماتے:

"پکڑو مولویو! اپنی یہ نام نہاد انشائیہ کاوشیں اور انھیں بانٹ دو۔ اے میری قوم میانہ روی اختیار کر۔ بلاغت نام ہے ایجاز کا۔ بخدا میں تمھاری انشاپردازی اور مضمون نویسی کو بالشتوں اور ہاتھوں سے ہرگز نہیں ناپ کر دیکھتا"۔

ہم ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوجاتے اور کاپیاں طلبہ میں تقسیم کر دیتے۔

تعلیمی سال کے اختتام کی مناسبت سے ـــــــ اور یہ سال میرے اور میرے کلاس کے لیے آخری سال تھا۔ اور ۱۹۲۷ سن عیسوی تھا ـــــــ شیخ نجاتی نے انشاپردازی کے لیے جو عنوان ہمیں دیئے ان میں سے ایک عنوان یہ تھا:

"تکمیل تعلیم کے بعد تیری سب سے عظیم خواہش کیا ہے۔ اسے تفصیل سے لکھ اور وہ وسائل بھی بیان کر جو تو اپنی خواہش کو بروئے کار لانے کے لیے اختیار کرے گا"۔

میرا جواب موضوع یہ تھا:

"میرا عقیدہ یہ ہے کہ نفوس انسانی میں سے سب سے بہتر وہ نیک سرشت

انسان ہے جو اپنی سعادت انسانوں کی فلاح اور رہنمائی میں تلاش کرتا ہے۔ اور اپنی مسرت و شادمانی اس میں پاتا ہے کہ انسانوں کو مسرت سے ہمکنار کرے اور ان کی تکالیف دُور کرے۔ اور اصلاحِ خلق کی راہ میں قربانی کو وہ نفع اور غنیمت شمار کرتا ہے، اور حق و ہدایت کے راستے میں ـــــــ یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ راستہ پُرخار ہے اور صعوبتوں اور آزمائشوں میں سے گزرتا ہے ـــــــ جہاد کو اپنے لیے لذت و راحت سمجھتا ہے، اور انسانی دلوں کی گہرائیوں میں اُتر کر ان کی بیماریوں کا شعور حاصل کرتا ہے اور معاشرے کے ظاہری حالات کے اندر جھانک کر اُن امور سے آگاہی حاصل کرتا ہے جو انسانی زندگی کے چشمۂ صافی کو مکدّر اور انسان کی مسرت کو مبدّل بہ الم کر دیتے ہیں۔ اور پھر ایسے نسخے تجویز کرتا ہے جو انسان کی پاکیزگی میں اضافہ اور مسرت کو دوچند کرتے ہیں۔ بنی آدم کے ساتھ رحمت و محبت کا احساس ہی اس کے اندر ان کاموں کی کشش پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ وہ تگ و دو کرتا ہے کہ بیمار دلوں کو آشنائے صحت کرے، گھٹے ہوئے سینوں کو کشادہ کرے اور پژمُردہ روحوں کو طراوت بخشے۔ اس گھڑی سے زیادہ کوئی گھڑی اس کے لیے موجبِ سعادت نہیں جس میں وہ کسی متنفّس کو دائمی شقاوت یا دائمی کرب کے گڑھے سے نکالتا ہے اور استقامت و سعادت کی راہ پر اسے ڈال دیتا ہے۔"

(بقیہ حاشیہ صـ۲۰۱)

حسن البنّا کو احمد السکری سے جو محبت اور تعلق تھا اس کا اندازہ اب قارئین کو اچھی طرح ہو چکا ہوگا۔ اب شاید آئندہ ڈائری کے صفحات پر احمد السکری کا کہیں ذکر نہ آئے گا۔ اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قارئین کو یہ بھی بتا دیا جائے کہ جب حسن البنّا مرحوم نے "الاخوان المسلمون" کی داغ بیل ڈالی تو احمد السکری اس کے پہلے سکریٹری جنرل بنائے گئے۔ آگے چل کر ۱۹۴۰ء سال کے بعد جب الاخوان ایک طاقت بن گئے اور انھوں نے ملکی سیاست میں قدم رکھا تو احمد السکری درپردہ وفد پارٹی کے ساتھ مل گئے۔ اور آخر کار

"میرا عقیدہ ہے کہ وہ کام جس کا اثر کارکن کی ذات سے آگے نہ بڑھے اور جس کا فائدہ دوسروں تک تجاوز نہ کرے، وہ ناقص، نارسا اور ہیچ ہے۔ سب سے بہتر اور عظیم عمل وہ ہے جس کے نتائج سے صاحبِ عمل بھی متمتع ہو اور اس کے رشتہ دار، ہم قوم اور ہم جنس بھی۔ کام کی افادیت جتنی ہمہ گیر ہوگی وہ اسی قدر عظیم و گراں بہا ہوگا۔ اپنے اسی عقیدہ و نظریہ کی بنا پر میں نے معلّمین کا راستہ اختیار کیا ہے۔ میرے نزدیک یہ معلّمین ایک ایسا فروزاں چراغ ہیں جس سے خلق کثیر اکتساب نور کرتی ہے اور انسانی بھیڑ کے اندر وہ اپنے راستوں کے سراغ پاتی ہے۔ گویہ معلّمین اس شمع کی مانند ہیں جو خود جل جاتی ہے مگر انسانوں کے لیے روشنی فراہم کرتی ہے۔"

"میرا عقیدہ ہے کہ وہ بلند تر مقصد جسے انسان کو اپنا مطمح نظر بنانا چاہئے اور وہ عظیم تر نفع جس کے لیے بھرپور تگ و دو کرنی چاہیے، اللہ کی خوشنودی کا حصول ہے۔ یعنی اللہ تعالےٰ انسان کو اپنے حظیرۂ قدس میں داخل فرمالے اور اپنی محبت کی خلعت اُسے پہنلئے اور اُسے عذاب دوزخ سے اور اپنے غضب سے دور رکھے۔ جو شخص اس بلند تر مقصد کا رخ کرتا ہے وہ ایک دوراہے سے دوچار ہوتا ہے اور ان دونوں راستوں میں سے ہر راستے کی اپنی خصوصیات و امتیازات ہیں، اور ان دونوں میں سے جسے چاہے منتخب کرلے:

(بقیہ ص گذشتہ) وفد پارٹی کے اشارے پر الاخوان کو شدید نقصان پہنچانے کا منصوبہ بنا لیا۔ الاخوان کو بر وقت اس کی اطلاع مل گئی اور انھوں نے اس کو جماعت سے نکال دیا۔ (مترجم)

پہلا راستہ تصوّفِ صادق کا راستہ ہے جس کا خلاصہ ہے :
اخلاص، عمل، ہر قسم کی مخلوق کے ساتھ خواہ اچھی ہو یا بُری، دل کو مشغول کرنے سے باز رکھنا ——— یہ راستہ قریب تر اور محفوظ تر ہے۔

دوسرا راستہ تعلیم وارشاد کا راستہ ہے۔ اخلاص اور عمل میں تو یہ پہلے راستے سے ملتا ہے۔ مگر انسانوں کے ساتھ اختلاط، انسانوں کے حالات کے مطالعہ، ان کے معاشروں میں شرکت اور ان کی بیماریوں کے لیے کارگر علاج کی تجویز، یہ وہ امور ہیں جو اس راستے کو اوّل الذکر راستے سے جدا کر دیتے ہیں۔ لیکن یہ دوسرا راستہ اللہ کے نزدیک زیادہ افضل اور زیادہ پُرعظمت ہے۔ قرآن کریم اسی راستے کو اولیٰ گردانتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کی فضیلت واہمیت واضح فرمائی ہے۔ تصوّف کی راہ نوردی کے بعد میں نے اب اسی دوسرے راستے کو کثرتِ فوائد اور عظمت فضیلت کے سبب ترجیح دی ہے اور اس لئے بھی کہ جو شخص علم سے بہرہ اندوز ہو اور جسے کچھ تفقّہ و بصیرت حاصل ہو چکی ہو اس کے لیے دوسرا راستہ اختیار کرنا زیادہ لازم اور زیادہ افضل و اولیٰ ہے ،
لینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم لعلھم یحذرون۔

" اور میں دیکھ رہا ہوں کہ میری قوم ——— اس سیاسی مدّوجزر کی وجہ سے جس سے وہ گزر رہی ہے ان اجتماعی تحرکات کی بنا پر جن سے دوچار رہی ہے، مغربی تہذیب، یورپ کی نقالی، مادّی فلسفہ اور تقلید افرنگ کے اثرات کی بدولت ——— اپنے دین کے مقاصد اور اپنی کتاب کے تقاضوں سے بیگانہ ہو چکی ہے۔ اپنے آباء واجداد کی

شان و شوکت اور اپنے اسلاف کے کارنامے فراموش کر چکی ہے۔ یہ دین حق جس میں جہالت و نادانی کی بنا پر بہت سے غلط عقائد و افکار کی آمیزش کر دی گئی ہے۔ مسلمان قوم پر گڈمڈ ہو چکا ہے۔ اور دین کی تابناک اور روشن حقیقت اور اس کی اصل اور سادہ تعلیم اس کی نگاہ سے اوجھل ہو چکی ہے۔ درمیان میں اوہام کے پردے حائل ہو چکے ہیں۔ جن سے ٹکرا کر نظریں نامراد لوٹ آتی ہیں اور فکر ٹھٹھر کر رہ جاتی ہے۔ چنانچہ عوام النّاس جہالت کی تاریکیوں میں غرق ہیں۔ نوجوان اور تعلیم یافتہ لوگ حیرت و شک کے دشت میں سرگرداں ہیں۔ اور اسی حیرت و شک کی کیفیت نے ان کے عقائد کو بگاڑ دیا ہے اور ان کے ایمان کو الحاد سے تبدیل کر دیا ہے"۔

"میرا یہ نظریہ ہے کہ انسانی نفس فطرۃً محبت پسند ہے۔ اس کے لیے ایسی ہستی ناگزیر ہوتی ہے جس کی طرف اپنے جذبات محبت منتقل کرے۔ میں اپنے جذبۂ محبّت کا مرکز اس دوست سے زیادہ کسی کو بہتر نہیں سمجھتا ہوں جس کی روح میں میری روح پیوست ہو چکی ہے۔ میں نے دامنِ محبت اس کے لیے بچھا دیا ہے اور اسی کو محورِ دوستی ٹھیرا لیا ہے[۱]۔

"ان امور پر میرا اعتقاد اس قدر محکم ہے کہ میرے دل میں اس کی جڑیں گہری اُتر چکی ہیں، اس کی شاخیں پھیل چکی ہیں۔ اس کے برگ سبز و شاداب ہو چکے ہیں۔ اب صرف اس کا بار آور ہونا باقی رہ گیا ہے۔ تعلیمی زندگی کی تکمیل کے بعد میری سب سے بڑی آرزو جسے میں بروئے کار

۱؎ حسن البنّا رحمہ اللہ کا اشارہ محمودیہ کے احمد السکری کی طرف ہے۔ جن کا پچھلے صفحات میں انھوں نے بار بار ذکر کیا ہے۔

لانا چاہتا ہوں دو حصّوں پر مشتمل ہے:

تمنّائے خاص : اپنے خاندان اور اہلِ قرابت کی بہبود و فلاح اور عزیز دوست کے ساتھ وفاداری بشرطِ استواری[1]۔ جس قدر بھی میری استطاعت ہوئی۔ جس حد تک میرے حالات نے اجازت دی، اور جس درجہ اللہ نے مجھے قدرت بخشی۔"

تمنّائے عام : میں معلّم اور رہنما بن جاؤں۔ دن کا وقت اور سال کا بیشتر حصّہ بچوں کی تعلیم و تدریس میں گزاروں اور رات کو ان کے والدین کو یہ سکھاؤں کہ دین کا نصب العین کیا ہے۔ ان کی سعادت کے سرچشمے کہاں ہیں اور ان کی خوشیوں کا راز کس بات میں مضمر ہے۔ گاہ خطابت اور گفتگو کے ذریعہ سے، گاہ تالیف و تحریر کے رنگ میں اور گاہ گردش و سیاحت اختیار کر کے۔

اوّل الذکر تمنّا کو پورا کرنے کے لیے میں نے اپنے اندر احسان شناسی کا ذوق اور نیکی کی قدردانی کا شعور پروان چڑھا لیا ہے: وھل جزاء الاحسان الا الاحسان۔ اور دوسری تمنّا کو بروئے کار لانے کے لیے میں نے دو اخلاقی ہتھیار: استقامت اور جذبۂ قربانی تیار کر لیے ہیں۔ یہ دونوں ہتھیار مصلح کے لیے لازم و ملزوم کا درجہ رکھتے ہیں۔ انہی میں ان کی کامیابی کا راز پنہاں ہے۔ ان دونوں ہتھیاروں سے جو مصلح لیس ہوتا ہے اسے کبھی ایسی شکست نہیں ہوتی جو اس کے وقار کو مجروح کر دے یا اُس کے چہرے کو غبار آلود کرے ——— اسی طرح عملی وسائل

---

[1] یہاں بھی اشارہ احمد السکری کی جانب ہے۔

میں سے بھی چند وسائل میں نے فراہم کر لیے ہیں ۔ مثلاً اعلیٰ تعلیم کوشش کر رہا ہوں کہ سرکاری دستاویزات کے ذریعہ اس تعلیم کی شہادت مل جائے ۔ ان لوگوں سے شناسائی جو یہی نظریہ قبول کر چکے ہیں اور اس نظریہ کے علم برداروں سے محبت رکھتے ہیں ۔ جسدِ خاکی جو لاغر و نحیف ہونے کے باوصف سخت کوشی کا عادی بن چکا ہے ، اور ناتوانی کے باوجود مشقت سے اُنس رکھتا ہے ۔ جان جسے میں نے اللہ کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے ۔ یہ ایک کامیاب سودا ہے ان شاء اللہ ، اور ایک نجات بخش تجارت ہے ۔ خدا سے درخواست ہے کہ وہ اس سودے کو قبول فرمائے اور اسے مکمل کرنے کی ہمت دے ۔ نیز جسم و جان دونوں کو فرض شناسی کی توفیق ارزانی عطا فرمائے ۔ اور اپنی اس مدد و نصرت کا فیضان کرے جسے میں اس کے اس ارشاد میں پڑھتا رہتا ہوں کہ :

" إن تنصروا الله ينصركم ويثبت اقدامكم "

" اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری نصرت فرمائے گا اور تمہیں ثابت قدمی بخشے گا "

" یہ تحریر میرے اور میرے رب کے مابین ایک عہد نامہ ہے ۔ اس عہد نامے کو میں اپنے آپ پر لازم کرتے ہوئے اپنے ہاتھ سے قلم بند کر رہا ہوں ، اور اپنے استاذ کو اس کا گواہ ٹھیراتا ہوں ، خلوت میں ہوں جہاں ضمیر کے سوا اور کوئی چیز اثر انداز نہیں ہے ۔ اور رات کی تنہائی ہے جس میں سوائے لطیف و خبیر ذات کے کسی کو کوئی خبر نہیں ۔ ومن اوفى بما عاهد عليه الله فسيؤتيه اجراً عظيماً "

استاذ حسن یوسف نجاتی رحمہ اللہ نے میرے اس جواب مضمون میں بعض جگہ

اصلاح کی اور مجھے یاد ہے کہ انھوں نے اس مضمون پر اچھے نمبر عطا فرمائے۔ دس میں سے ساڑھے سات۔

مضمون میں جس دوست کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ استاذ احمد السکری ہیں۔ جو میرے ان احساسات و جذبات میں برابر کے شریک تھے۔ یہاں تک کہ انھوں نے اپنی دوکان بھی بڑھادی اور تجارتی کاروبار ٹھپ کر دیا۔ اور البحیرۃ کے ضلعی بورڈ آف ایجوکیشن میں اس خیال سے سرکاری ملازمت کرلی کہ جب میں فراغت کے بعد وزارتِ تعلیم میں ملازمت کروں تو وہ بھی وہاں منتقل ہوجائیں یا مجھے بورڈ میں آجانے کا موقع مل جائے۔ اور یوں بہر حال ہم دونوں یکجا ہوجائیں۔ کچھ عرصہ بعد اللہ تعالےٰ نے یہ آرزو برلایا۔ مجھے وزارتِ تعلیم میں ملازمت مل گئی۔ احمد السکری بھی وزارت میں منتقل ہوگئے۔ اور طویل انتظار کے بعد آخر کار ہم دونوں قاہرہ میں اکٹھے ہوگئے۔

دار العلوم کی یادیں

یہ میرا آخری سال تھا۔ میں دار العلوم کے ڈپلومے کے امتحان کی تیاری میں ہمہ تن مصروف ہوگیا۔ جونہی مجھے یہ خیال گزرتا کہ میں اس خجستہ درس گاہ سے عنقریب جدا ہوجاؤنگا تو درس گاہ کی عجیب کشش دل میں پیدا ہوجاتی اور ہم جماعت بھائیوں کی محبت دل میں موجزن ہوجاتی۔ میں یہ بھی نہیں بھول سکتا کہ کبھی کبھی میں مسجد المنیرہ اور دار العلوم کے درمیان یا کمرۂ تعلیم کے ایک گوشے میں تصویرِ غم بنا کھڑا رہتا، دار العلوم اور ساکنانِ دار العلوم کو شوق و سوز کے جذبۂ بے اختیار کے ساتھ ٹک ٹک دیکھا کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

" واحبب من شئت فانك مفارقه "

" تو جس سے چاہے محبت کر آخر اُسے چھوڑ ہی جانا ہے "

اور کلاس روموں میں میرے اور استاد بدیر بک رحمہ اللہ کے درمیان جو پُرلطف اٹھکھیلیاں چلتی رہتی تھیں وہ بھی ناقابلِ فراموش ہیں۔ ہمارے حق میں ان کا یہ کارنامہ بھی

کبھی نہیں بھلایا جا سکتا کہ جب اسکول کی انتظامیہ نے عربی ادبیات اور انشاء پردازی کی تدریس ان کے سپرد کردی تو وہ ہماری کلاس میں آئے، بڑے مغموم وملول۔ ہم اس وقت تیسرے سال میں تھے۔ ہم سے فرمانے لگے: کیا تمہیں معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایک ایسے المیے سے دوچار کردیا ہے جس کی کوئی مثال نہیں ہے؟ ہم نے کہا:

"کون سا المیہ؟" فرمانے لگے: "سال سوم کی عربی ادبیات کی تدریس بدیر کے گلے میں منڈھ دی گئی ہے اور بالخصوص عباسی دور کی ادبیات ——— جو تاریخ ادب عربی کا ایک حصہ ہے ——— مجھے اس کے متعلق کچھ معلومات نہیں ہیں۔ کیا میں تمہیں ایک ایسے استاذ کی نشان دہی نہ کردوں جو اس مضمون کا شاہسوار اور رمز شناس ہے۔ یہ استاذ نجاتی ہے۔ اس سے چمٹ جاؤ، اور مدرسہ کی انتظامیہ سے یہ مطالبہ کرو کہ مجھے اس بار سے سبک دوش کردے اور استاذ نجاتی کو یہ ذمہ داری سونپ دے۔ یقین رکھو کہ میں تمہیں بہتری کا مشورہ دے رہا ہوں۔ اور حق ہی اتباع کا زیادہ مستحق ہے"۔ ہم نے استاذ بدیر کی چاپلوسی شروع کردی، اسی انداز میں جو شاگرد اپنے استاذ کے لیے اختیار کرتا ہے۔ مگر ان کا جواب یہ تھا کہ: "مجھے میرے نفس کے بارے میں فریب نہ دو، میں اپنے آپ کو تم سے زیادہ جانتا ہوں اور تمہارے مفاد کو بھی خوب سمجھتا ہوں۔ میں تمہارے لیے بھلائی کے سوا اور کسی چیز کا خواہاں نہیں ہوں"۔

چنانچہ ہم نے استاذ بدیر کے مشورہ پر عمل کیا۔ پرنسپل صاحب کے پاس گئے اور مذکورہ بالا تجویز ان کی خدمت میں گزاری جو انھوں نے قبول فرمائی۔ اور چنانچہ ہم نے فی الواقع استاذ نجاتی سے بہت اکتساب فیض کیا۔ اور ہم نے استاذ بدیر کے اس شریفانہ موقف اور کریمانہ اخلاق پر ان کا بے حد شکریہ ادا کیا۔ اللہ تعالےٰ ان پر اپنی رحمت کے پھول برسائے۔

قاہرہ میں استاذ فرید بک وجدی کا دولت کدہ بھی ایک ناقابلِ فراموش یاد ہے۔

میں مجلّہ الحیاۃ کا قاری تھا، اور اسلام اور اسلامی تمدّن کے بارے میں فرید وجدی کی بکثرت تالیفات کا مطالعہ کرتا رہتا تھا۔ اور خاص طور پر ان کے دائرہ معارف اسلامیہ کے عشّاق میں سے تھا۔ قاہرہ میں اقامت پذیر ہوتے ہی میں نے ان کے کاشانے پر حاضری دی، جو ان دنوں خلیج مصری میں واقع تھا۔ والد صاحب کے ساتھ فرید وجدی کے بہت قریبی دوستانہ مراسم تھے۔ ان کا گھر ارباب علم و دانش کا مرجع و مرکز تھا۔ مختلف اہلِ ذوق عصر کے بعد وہاں جمع ہوتے۔ پہلے گوناگوں علوم و فنون پر ان کے درمیان مذاکرات ہوتے اور پھر یہ سب لوگ نزہت و تفریح کے لیے نکل جاتے۔ میں بھی بشوق استفادہ اکثر و بیشتر اس بزم فضلاء میں شریک ہوتا رہتا تھا۔ اسی محفل میں ایک مرتبہ ایک مسئلہ پر میرے اور استاذ فرید بک کے درمیان نزاع برپا ہوگئی۔ اس نزاع میں فرید بک کے دوست احمد بک ابوستیت بھی ان کے ساتھ شامل ہوگئے۔ یہ مسئلہ استحضارِ ارواح کے متعلق تھا۔ فرید بک کی رائے یہ تھی کہ یہ جو روحیں حاضر کی جاتی ہیں یہ خود مُردوں ہی کی روحیں ہوتی ہیں۔ مگر میری رائے اس کے برعکس تھی۔ اس موضوع پر ہماری بحث نے بے شمار پہلو اختیار کر لیے۔ اور بالآخر ہم نے اس حالت میں یہ بحث ختم کر دی کہ ہم میں سے ہر ایک اپنی رائے سے سرِمو نہ ہٹا۔ ان قیمتی مجالس سے میں نے بہت استفادہ کیا۔

یہ تھے قاہرہ میں میری زندگی کے اطوار۔ ایک طرفہ مرکب: شیخ حصافی کے مکان یا علی افندی غالب کے مکان پر "محفلِ ذکر" میں شرکت، مکتبۂ سلفیہ کا طواف اور سیّد محب الدین الخطیب سے میل جول، دار المنار اور سیّد رشید رضا کے ہاں آمد و رفت، شیخ دجوی کے کاشانہ پر حاضری، پھر فرید بک وجدی کی مجالس علم و دانش میں شمولیت، اور کبھی دار الکتب کی فضائے بصیرت افروز میں اور کبھی مسجد شیخون کی چٹائیوں پر۔

اور ڈپلوما لے لیا

امتحان کے دن آئے اور گزر گئے۔ نتیجہ بھی نکل آیا۔ جولائی ۱۹۲۷ء میں میں نے دارالعلوم کا ڈپلوما حاصل کرلیا۔ زبانی امتحان کا واقعہ ناقابلِ فراموش ہے۔میں یہ امتحان دینے کیلئے کمیٹی کے سامنے گیا۔جو استاد ابوالفتح الفقیؒ اور استاد نجانی پر مشتمل تھی۔میں نے نظم و نثر کا ایک خاصا ذخیرہ حفظ کر رکھا تھا جو اٹھارہ ہزار اشعار اور اسی حجم کی نثری نگارشات پر مشتمل تھا۔

طرفہ بن لبید کا پورا معلّقہ حفظ تھا۔ مگر مجھ سے صرف معلقہ کے ایک شعر اور نپولین پر شوقی بک کی نظم کے چار اشعار کے بارے میں سوال کیا گیا۔ اور عمر خیّام پر کچھ بحث کی گئی۔ اور بس۔ میں نے تیاری کے لیے جو محنت شاقہ کی تھی اس پر مجھے کوئی افسوس نہیں ہے۔ اس لیے کہ میں پہلے ہی روز سے یہ محنت امتحان کی خاطر نہیں بلکہ علم کی خاطر کر رہا تھا۔

اسکالرشپ یا ملازمت

میں نے دیکھا کہ بعض احباب کرام یہ سوچ رہے ہیں کہ بیرونی اسکالرشپ کے لیے درخواست دائر کردیں۔ اس لحاظ سے کہ یہ اسکالرشپ ہمیشہ اس طالب علم کا حق سمجھا جاتا ہے جو ڈپلومے کے امتحان میں اوّل آیا ہو۔ لیکن میں دو محرکات کی بنا پر اس بارے میں پس وپیش میں تھا۔ پہلا محرک مزید علم حاصل کرنے کا شوق خواہ یورپ اور چین میں ہو۔ حکمت مومن کی متاع گم گشتہ ہے۔ جہاں بھی وہ اسے پائے دوسرے لوگوں کی بہ نسبت وہی اس کا زیادہ مستحق ہوتا ہے۔ دوسرا محرک ظاہری ٹھاٹھ باٹھ سے کنارہ کشی، اور اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے فوری کارروائی کا شوق جو میرے دل و دماغ پر پوری طرح محیط ہوچکا تھا۔ یعنی اسلامی تعلیمات کی طرف رجوع کی دعوت اور مغرب کی اندھی تقلید اور مغربی تمدّن کے سطحی مظاہر کی پیدا کردہ خرابیوں کے سدّباب کے لیے منظم تحریک جاری کرنا۔ اس تردّد و تامّل سے مجھے خود دارالعلوم نے ہی نجات دے دی۔ کیونکہ اس

سال دار العلوم نے بیرونی اسکالرشپ کے لیے کسی کو نامزد نہیں کیا۔ اب ملازمت ہی کا راستہ باقی رہ گیا تھا۔

میرا خیال تھا کہ سرکاری ملازمت قاہرہ کے اسکولوں سے آگے نہیں بڑھے گی۔ لیکن سالِ رواں میں فارغ ہونے والوں کی کثرت تھی اور وزارت تعلیم نے جو اساتذہ طلب کیے ان کی تعداد بہت قلیل تھی ـــــــ وزارت تعلیم نے آٹھ سے زیادہ افراد نہیں طلب کیے۔ اور باقی لوگوں کو صوبائی بورڈوں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا ـــــــ اس صورتِ حال نے قاہرہ تو کسی ایک کی قسمت میں نہ رہنے دیا۔ صرف دو کے بارے میں ـــــــ یعنی اول اور دوم آنے والے کے بارے میں ـــــــ خصوصی احکام صادر ہوئے۔ ان کی رو سے اسماعیلیہ کا قرعہ میرے نام نکلا اور اسکندریہ استاذ ابراہیم مدکور ـــــــ جواب ڈاکٹر ابراہیم مدکور کہلاتے ہیں[1] ـــــــ کے حصے میں آیا۔ پھر سیاست کی کرشمہ سازی نے انھیں اسکندریہ سے ادفو جا پھینکا۔ مگر انھوں نے استعفےٰ دے دیا اور یورپ چلے گئے تاکہ اپنے خرچ پر تکمیل تعلیم کرلیں۔ بعد میں انھیں وہاں سرکاری اسکالرشپ پر تعلیم پانے والوں میں شامل کر دیا گیا ـــــــ ہمارے باقی چھ ساتھیوں کو قسمت نے جنوبی مصر کی ہواؤں کے حوالے کر دیا۔

میں اپنی تقرری پر ہکا بکا رہ گیا۔ میں ٹھیک سے یہ بھی نہ جانتا تھا کہ اسماعیلیہ کدھر ہے۔ میں محکمہ تعلیم کے دفتر گیا اور اس تعیناتی پر لے دے کی۔ استاذ محترم جناب عبد الحمید بک حسنی سے مڈبھیڑ ہوئی۔ انھوں نے اپنی بذلہ سنجی اور دل لگی کی باتوں سے میرے طیش کو فرو کر دیا۔ انھوں نے فضیلت مآب شیخ عبد الحمید الخولی رحمۃ اللہ علیہ جو ان

---

[1] موصوف ان دنوں کویت یونی ورسٹی میں اسلامی فقہ کے استاذ ہیں۔ اصول فقہ پر ان کی تصنیفات خاصی شہرت حاصل کر چکی ہیں۔ (مترجم)

دلنوں ان سے ملنے آیا کرتے تھے کا بھی سہارا لیا۔ اسماعیلیہ کے سپوت استاذ علی حسب اللہ بھی تشریف فرما ہو گئے۔ استاذ عبدالحمید بک نے ان دونوں سے یہ گواہی دلوا دی کہ اسماعیلیہ اللہ کے اچھے شہروں میں سے ایک شہر ہے۔ مجھے وہاں بہت راحت وعافیت نصیب ہوگی۔ پُرسکون شہر ہے، قدرتی حُسن سے مالا مال ہے۔ کثرت پیداوار میں نام آور ہے۔ میں دفتر سے لوٹ آیا۔ والدِ محترم سے مشورہ کیا۔ فرمانے لگے: علی برکۃ اللہ (اللہ کا نام لے کر چلے جاؤ)۔ بہتر وہی ہے جسے اللہ پسند فرمائے۔ اس بات سے مجھے بھی انشراح صدر حاصل ہو گیا، اور میں نے رختِ سفر باندھنا شروع کر دیا۔ اس سفر میں حکمتِ الٰہی کے جو راز پنہاں تھے وہ بعد میں پوری طرح عیاں ہو گئے ——— واللہ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ (یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ اپنا پیغام کس جگہ اُتارے)۔ میں نے اللہ کا نام لے کر کوچ کر دیا۔ میرا ذہن اس سوچ میں مستغرق تھا کہ وہاں جا کر دعوت کے لیے کیا اسلوب اختیار کروں۔ کیونکہ اب یہی خیال پختہ ہو چکا تھا کہ اصلاح و دعوت کا بارِ امانت اسماعیلیہ میں مَیں اُٹھاؤں گا اور راخ احمد افندی السکری محمودیہ میں اس مشن کو سنبھالے گا دو فاضل دوستوں: شیخ حامد عسکریہ ——— رحمۃ اللہ علیہ ——— اور شیخ عبدالحمید کو ہم نے قاہرہ کے لیے چھوڑ دیا۔ اوّل الذکر عالمیہ (ازہر کی اعلیٰ ڈگری) لینے کے بعد زقازیق میں واعظ مقرر کر دیئے گئے۔ اور وہاں انھوں نے دعوت کی ذمہ داری اُٹھا لی اور مؤخر الذکر نے ——— عالمیہ کی ڈگری لینے کے بعد بلکہ کچھ عرصہ تخصص میں صرف کرنے کے بعد ——— کفر الدوار میں زراعت کا آزاد کاروبار اختیار کر لیا۔ اور ساتھ ساتھ دعوت کا فریضہ بھی انجام دینا شروع کر دیا۔ یوں ہم سب شاعر کے اس قول کی تمثیل بن گئے:

بالشام اھلی وبغداد الھوی وانا
بالرقمتین وبالفسطاط جیرانی

”شام میں میرے اہل وعیال ہیں، بغداد میں دل اٹکا ہوا ہے
اور میں رقتین میں بیٹھا ہوں اور میرے ہمسائے فسطاط میں “۔

ہم میں سے ہر ایک اپنے اپنے طریقِ کار کے مطابق جس کی اللہ نے اسے سوجھ بوجھ عطا کی، وقفِ دعوت ہوگیا۔ سفرِ اسماعیلیہ کے تقریباً ایک سال بعد، اسماعیلیہ کی دلنواز و سکون آمیز فضا میں اور اسماعیلیہ کے نیک نہاد و خجستہ خصال فرزندوں کے دم قدم سے الاخوان المسلمون کی تنظیمات اور شاخوں کی خشتِ اوّل رکھی گئی۔

اسماعیلیہ کو

بروز پیر ۱۹ ستمبر ۱۹۲۷ء ——— مجھے افسوس ہے کہ یہ اب یاد نہیں کہ اس روز ہجری تاریخ کیا تھی ——— احباب اپنے دوست کو الوداع کرنے کے لیے جمع ہوئے جو اسماعیلیہ کا سفر اختیار کر رہا تھا تاکہ وہ وہاں پہنچ کر اپنے نئے مفوضہ کام (اسماعیلیہ کے گورنمنٹ اسکول میں تدریس) کا چارج سنبھال لے۔ بیشتر ازیں ان کا یہ مسافر دوست اسماعیلیہ کے بارے میں کچھ زیادہ معلومات نہ رکھتا تھا۔ اس کا ذخیرۂ معلومات بس اس قدر تھا کہ یہ شہر ڈیلٹا کے انتہائی مشرق میں دور دراز مقام کا نام ہے۔ اس کے اور قاہرہ کے درمیان مشرقی صحرا کی ریت کا ایک کشادہ خلا حائل ہے۔ نہر سوئز سے متّصل التمساح جھیل کے کنارے واقع ہے۔ یہ ——— احقر ——— دوستوں کا دوست اور اپنے دوستوں کا استقبال کرتا رہا اور انھیں الوداع کرتا رہا اور وہ اُسے الوداع کہتے رہے۔ دوستوں کے درمیان اِدھر اُدھر کی مختلف گفتگوئیں ہوئیں۔ ان میں محمد افندی الشرنوبی بھی تھے۔ بڑے پاکیزہ سرشت اور نیکوکار انسان۔ انھوں نے دوران گفتگو کہا:

”پاک طینت انسان جہاں بھی پڑاؤ ڈالتا ہے پاکیزہ اثرات ہی چھوڑ کر جاتا ہے ہم امید کرتے ہیں کہ ہمارا دوست بھی اس شہر ——— اسماعیلیہ ——— میں جو اس کے لیے نیا ہے اچھے اثرات چھوڑے گا“۔ محمد افندی الشرنوبی کے یہ الفاظ ان

کے مسافر دوست کے دل پر نقش ہو گئے۔ تمام احباب منتشر ہو گئے۔ مسافر نے چاشت کی ریل پکڑلی تاکہ ظہر کے وقت اسماعیلیہ وارد ہو جائے اور پہلی مرتبہ اپنی عملی زندگی کا دوبدو سامنا کرے۔ گاڑی روانۂ منزل ہوگئی۔ گاڑی کے اندر راہ نورد کی ملاقات اپنے چند ہم پیشہ ساتھیوں سے ہوگئی۔ جو حال ہی میں اسی اسکول میں مقرر کیے گئے جس میں نووارد مقرر کیا گیا ہے۔ اگر حافظہ غلطی نہیں کرتا تو ان میں محمد بہی الدین سند افندی، احمد حافظ افندی، عبدالجید عزت افندی اور محمود عبدالنبی افندی نام کے مدرسین بھی تھے۔

سویز کے پرائمری اسکول کے ایک ٹیچر رفیق سے ملاقات ہوئی۔ یہ سلسلۂ حامدیہ شاذلیہ سے نسبت رکھتے ہیں۔ راہ نورد نے اسلام کے احیاء اور دعوتِ اسلامی کے بارے میں اپنے خیالات اور امنگیں ان کے گوش گزار کیں۔ اور اب راقم ان کے متعلق اپنی ڈائری میں یہ تاثرات ثبت کر رہا ہے:

> "یہ چند لمحات اس بات کے لیے کافی نہیں ہیں کہ ان صاحب کی نفسیاتی کیفیت اور روحانی حالت کے بارے میں کوئی رائے قائم کی جاسکے۔ البتہ اتنا اندازہ ہوا ہے کہ ان کا مقصدِ زیست یہ ہے کہ کاروبار کے ذریعہ اپنی زندگی کا تحفظ کریں۔ اپنے رب، اپنے دین اور اپنے شیخ کے ساتھ عقیدہ کو باعثِ سعادت سمجھتے ہیں۔ اور اپنے ارگرد اپنے عقیدت مند بھائیوں کے مظاہر احترام و توقیر دیکھ کر خوش ہوتے ہیں مگر احقر قطعاً یہ ارادہ نہیں رکھتا کہ وہ عمل کو صرف تحفظ حیات ہی کا ذریعہ بنا کر جئے۔ راہ نورد کو یہ بھی پسند نہیں ہے کہ اس کے فکری اثرات صرف اس کی ذات تک محدود رہیں۔ اپنے بھائی بندوں کے احترام و توقیر کے مظاہر میں بھی وہ نہیں الجھتا۔ اسے کسی اور ہی بات نے آشنائے تب و تاب کر رکھا ہے۔"

گاڑی اسماعیلیہ کے اسٹیشن پر پہنچ گئی۔ مسافر اپنی اپنی سمتوں کو چلے گئے۔ خاکسار نے اس جنت نگاہ شہر کو جھانکا شہر کا حسن اس وقت فزوں تر نظر آیا جب ریلوے اسٹیشن کے پُل سے راہ نوردنے اس پر نگاہ ڈالی۔ ان حسین مناظر نے نو وارد کے دل کو موہ لیا، اور اس کی عقل وخرد کو مسحور کر دیا۔ نو وارد لحظہ بھر کے لیے رُکا اور فوراً تخیل والتجا کی دنیا میں محو پرواز ہوگیا وہ یہ پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ لوح غیب کے اندر اس بلد طیب میں اس کے لیے کیا کچھ ثبت ہو چکا ہے۔ وہ بڑی تب وتاب کے ساتھ اور شستہ التجاؤں کے ساتھ اپنے رب سے درخواست کر رہا تھا کہ:

"اے پروردگار اس شہر میں وہی چیز اس کے مقدر میں رکھیو جس میں بھلائی ہو۔ اور اس چیز سے باز رکھیو جس میں شر اور گناہ مضمر ہو۔ وہ دل کی گہرائیوں میں یہ محسوس کر رہا ہے کہ اس شہر میں اس کی چلت پھرت ان سب لوگوں کی چلت پھرت سے یقیناً مختلف ہوگی جو یہاں بس رہے ہیں یا باہر سے آجا رہے ہیں۔"

ہوٹل میں

راہی ایک ہوٹل میں پہنچ جاتا ہے، اور اپنا بیگ ہوٹل کے حوالے کر دیتا ہے۔ بیگ کے سوا اس کے پاس اور کوئی سامان نہیں ہے۔ اور اس اسکول میں پہنچ جاتا ہے جہاں وہ اب کام کرے گا۔ ہیڈ ماسٹر اور مدرسین سے ملتا ہے۔ اور ان کے ساتھ طرح طرح کی گفتگوئیں ہوتی ہیں۔ پھر اس کا تعارف اپنے ایک دیرینہ دوست استاذ ابراہیم بہاوی افندی کے ساتھ ہو جاتا ہے جو اسی اسکول کے پرانے ٹیچر ہیں۔ نو وارد کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اپنے دیرینہ دوست کے ساتھ ہی رہائش رکھ لے۔ چنانچہ اس کا دوست خود ہی اسے یہ پیش کش کرتا ہے کہ کسی معمولی درجے کے ہوٹل میں سکونت رکھی جائے۔ یہ مہمان مدرس اس رائے پر موافقت کا اظہار کرتا ہے۔ اور دونوں دوست ایک ہی کمرے میں رہنے لگتے ہیں۔ پہلے ایک انگریز عورت مسز ایم گیمی کی بلڈنگ میں کرائے پر کمرہ لیتے ہیں اور وہاں سے ایک اطالوی

خاتون میڈم ببینا کی عمارت میں منتقل ہو جاتے ہیں۔

مدرسہ سے مسجد تک

نو وارد مدرس اپنا وقت مسجد، مدرسہ اور مکان پر گزارتا رہا۔ اور اس نے کبھی کسی سے میل ملاپ رکھنے کی کوشش نہ کی۔ اور نہ اس نے اپنے مخصوص ماحول کے رفقائے کار کے علاوہ کسی سے جان پہچان استوار کی۔ رہے اوقاتِ فرصت تو ان میں وہ ریاضت میں لگ جاتا۔ یا نئے وطن کا مطالعہ کرتا اور یہاں کے باشندوں، یہاں کے مناظر اور یہاں کی خصوصیات کو سمجھنے کی کوشش کرتا، یا قرآن کی تلاوت اور علمی مطالعے میں مشغول رہتا۔ پورے چالیس روز تک اس نے اپنی ان مصروفیات میں کسی نوع کا اضافہ نہیں کیا۔ اور نہ کسی لحظہ اس کے دل سے الوداع کرنے والے دوست کے یہ الفاظ محو ہوئے:

"پاک طینت انسان جہاں بھی اُترتا ہے پاکیزہ اثرات ہی چھوڑ کر جاتا ہے۔
ہم امید رکھتے ہیں کہ ہمارا دوست بھی اسماعیلیہ میں اچھے اثرات چھوڑے گا"!!

مذہبی جھگڑے

اس تازہ واردِ شہر نے مسجد کے اندر ہی بہت حد تک اسماعیلیہ کی مذہبی خبریں اور اس کے معاشرتی احوال جان لیے۔ اسے یہ بھی پتہ چلا کہ اس شہر پر فرنگیت کا غلبہ ہے۔ کیونکہ اس کے مغرب میں برطانوی کیمپ ہیں اور مشرق میں سویز کینال کمپنی کے ملازمین کی کالونی ہے۔ اور شہر دونوں کے درمیان محصور ہے۔ یہاں کے اکثر لوگ ان دونوں جگہوں میں کاروبار کرتے ہیں۔ اور یورپی زندگی کے ساتھ ان کا قریبی اتصال رہتا ہے اور ہر طرف یورپی بود و باش کے نمونے ہی ان کا استقبال کرتے ہیں۔

لیکن یہ شہر جس پر اس درجہ فرنگی ذوق چھا رہا ہے۔ اس سب کے باوجود بڑا مضبوط اسلامی جذبہ رکھتا ہے۔ لوگ علماء کے گرد جمع ہوتے ہیں اور ان کی باتوں کا اثر لیتے ہیں۔ راقم کو یہ بھی علم ہوا کہ اس سے پہلے یہاں ایک اسلام پسند مدرس رہ چکا ہے اور نظریۂ اسلام کے بارے

ہیں اُس نے اہلِ شہر کے سامنے کچھ ایسے خیالات پیش کیے ہیں جو اکثر باشندوں کے لیے نامانوس تھے۔ چنانچہ شہر کے کچھ علماء نے ان خیالات کے خلاف کمر باندھ لی۔ نتیجۃً لوگوں کے اندر افتراق پیدا ہوگیا۔ اور ایسے افکار وآراء کی طرفداری کی جانے لگی جو کبھی دلوں کو یکجا نہیں کر سکتے اور جن کے ہوتے ہوئے وہ وحدت و یگانگت استوار نہیں ہوسکتی، جس کے بغیر کوئی بات بن نہیں آتی۔

پھر قہوہ خانوں کی طرف رجوع

راقم سوچنے لگا کہ اب کیا کیا جائے اور اس افتراق سے کیسے نمٹا جائے۔ راقم یہ دیکھ رہا تھا کہ جو شخص بھی اسلام پر گفتگو کرنے اُٹھتا ہے، یہاں کا ہر گروہ اپنا ہی عقیدہ ومسلک اس کے سامنے رکھ دیتا ہے اور اسے اپنی بوتل میں اُتار لینا چاہتا ہے یا کم از کم وہ یہ ضرور جان لینا چاہتا ہے کہ یہ نیا مبلّغ اُس کی پارٹی میں سے ہے یا اس کے مخالفین میں سے ہے۔ حالانکہ وہ چاہتا ہے کہ سب کو اپنا مخاطب بنائے۔ سب کے ساتھ رابطہ استوار کرے اور سب کی شیرازہ بندی کرے مگر حالات اس کا ساتھ نہیں دیتے۔

خاکسار نے اس پہلو پر بہت سوچ بچار کی۔ اور یہی طے کیا کہ ان تمام گروہوں اور فرقوں سے کنارہ کش رہے اور جہاں تک ہو سکے مساجد کے اندر لوگوں سے ہمکلام ہونے سے پرہیز کیا جائے۔ مسجد اور اہلِ مسجد ہی اختلافی جھگڑوں کا چرچا کرتے رہتے ہیں، اور جب بھی انھیں موقع ملتا ہے انھیں بھڑکاتے رہتے ہیں۔ لہٰذا خاکسار مسجد اور اہلِ مسجد کو نشانۂ دعوت نہ بنائے۔ لوگوں سے رابطے کے دیگر ذرائع تلاش کرے ــــــ کیوں نہ "اصحابِ قہوہ" کو قہوہ خانوں کے اندر مخاطب کیا جائے؟۔

کچھ عرصہ تک یہ خیال ذہن میں انگڑائیاں لیتا رہا اور دماغ کے اندر اس کی پختگی پرورش ہوتی رہی اور پھر اسے عملی جامہ پہنا دیا۔ اس غرض کے لیے تین بڑے بڑے قہوہ خانے

منتخب کر لیے گئے۔ جن میں ہزاروں افراد جمع ہوتے رہتے ہیں۔ ہر قہوہ خانے میں ہفتہ میں دو درس دینے کا پروگرام بنالیا۔ اور ان تینوں جگہوں پر پابندی کے ساتھ درس و تبلیغ کی طرح ڈال دی۔ شروع شروع میں دینی وعظ و درس کا یہ طرزِ نو لوگوں کے لیے ایک اچنبھا تھا۔ مگر وہ جلدی ہی اس سے مانوس ہو گئے اور دلچسپی لینے لگے۔

مدرس اپنے نئے اور نرالے اسلوبِ تبلیغ میں بڑی دقت ریزی سے کام لے رہا تھا۔ وہ ہمیشہ ایسے عنوان کو ترجیح دیتا جس پر وہ خوبی کے ساتھ گفتگو کر سکے۔ نیز وہ اصولی تبلیغ سے متجاوز نہ ہوا ور اللہ اور یومِ آخرت کی تذکیر، نیکی کی ترغیب اور برائیوں سے تخویف تک ہی محدود رہے۔ دل آزاری کی باتوں اور طعن و تشنیع کے پہلوؤں سے تعرض نہ کرتا۔ اور نہ ان منکرات اور برائیوں پر براہ راست ملامت زنی کرتا جن کے حاضرین رسیا تھے۔ وہ اتنے پر قناعت کرتا کہ حاضرین کے دلوں کے اندر کچھ نہ کچھ اثر پیدا کرے۔ وہ طرزِ بیان کی بھی خوب تراش خراش کرتا اور اسے سلیس، پُرکشش اور شوق انگیز بناتا۔ عامی زبان کی حسبِ ضرورت آمیزش کر لیتا۔ مشاہدات اور امثال کی چاشنی لگاتا۔ قصے کہانیوں سے بھی کام لیتا۔ اور اکثر اپنے طرزِ ادا کو واعظانہ اور اثر انگیز بنا کر پیش کرتا۔ اور یوں وہ ہمیشہ انسانی دلوں کو اپنی جانب کھینچنے کے لیے پوری چارہ سازی کرتا اور اپنی بات کی طرف لوگوں کی رغبت و شوق کو مہمیز لگاتا۔ لمبی تقریر نہ کرتا جو حاضرین کو بیزار کر دے۔

اس کا درس دس منٹ سے زیادہ نہ ہوتا۔ اگر بضرورت لمبا بھی کرتا تو پندرہ منٹ سے ہرگز تجاوز نہ کرتا۔ بایں ہمہ اس کی یہ پوری کوشش ہوتی کہ اس قلیل وقت میں زیرِ بحث موضوع کا پوری طرح استیعاب کرے اور سامعین کے دلوں کے اندر اُسے ہمہ پہلو وضاحت و جامعیت کے ساتھ اُتار دے۔ اگر اسے کوئی آیتِ قرآنی یا حدیثِ نبویؐ پیش کرنا ہوتی تو پہلے وہ موقع و محل کے لحاظ سے اس کا مناسب انتخاب کرتا، پھر خشوع و

خضوع کے ساتھ اُس کی تلاوت کرتا، اصطلاحی تاویلوں اور فنّی تشریحات سے اجتناب کرتا۔ اس کے اجمالی معنی اختیار کرکے اس کی توضیح کرتا اور مطلوبہ استدلال کی تشریح پر کفایت کرتا۔

اسماعیلیہ کے عوام کے اندر اس طرزِ دعوت نے خوشگوار اثرات پیدا کر دیئے۔ لوگوں میں اس پر پہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ لوگ ان قہوہ خانوں کا رُخ کرتے اور درس کا انتظار کرتے۔ سامعین کے دلوں کے اندر بھی اس تبلیغ نے حرکت پیدا کر دی، اور خاص طور پر جو لوگ پابندی کے ساتھ سُنتے رہے وہ بیدار ہونے لگے اور غور و فکر پر مجبور ہو گئے۔ آہستہ آہستہ معاملہ یہاں تک بڑھا کہ وہ یہ سوال کرنے لگے کہ اب انھیں کیا کرنا چاہیے تاکہ وہ اللہ کی طرف سے عائد شدہ حق کو قائم کریں اور دین و ملت کے بارے میں اپنا فرض ادا کریں، تاکہ عذابِ خداوندی سے انھیں نجات مل جائے اور جنت کا حصول یقینی ہو جائے۔

مدرس نے انھیں سوالوں کے جوابات دینے شروع کر دیئے مگر یہ جوابات دو ٹوک نہ ہوتے۔ تاکہ ان میں جذبِ دروں مزید اُجاگر ہو اور ان کے دل خوب پختہ ہو جائیں۔ وہ سرکش نفوس کو مزید ہموار کرنا چاہتا تھا اور اپنی بات صاف صاف کہنے کے لیے وہ مناسب موقع کا منتظر تھا۔

عملی تعلیم

مگر مدرس پر ان پاکباز اور ایمان سے معمور انسانوں کی طرف سے سوالات کی پے در پے بارش ہوتی، اور رواں دواں جوابات سے ان کی تشنگی دور نہ ہوتی۔ احباب کی ایک جماعت نے اصرار کیا کہ ایسا طریقِ کار وضع کیا جانا چاہیے جس پر وہ چل کر حقیقی مسلمان بن جائیں اور اسلام کی صفات سے صحیح معنوں میں متصف ہو سکیں۔ اسلامی احساس نے ان کے وجدان کو سیماب آسا کر دیا ہے۔ اب وہ اسلام کے احکام سیکھنا چاہتے ہیں۔ مدرس نے انھیں مشورہ دیا کہ وہ کسی مخصوص جگہ کا انتخاب کریں جہاں قہوہ خانے کے درس سے پہلے

یا بعد میں جمع ہوجایا کریں اور اسلامی احکام کا اجتماعی مطالعہ کریں ۔ اس غرض کے لیے ان کی نگاہِ انتخاب ایک دور دراز زاویے پر جا پڑی جہاں اجتماع کرنے کے لیے اور دوسرے اسلامی شعائر ادا کرنے کے لیے اسے کچھ مرمت کرنے کی ضرورت تھی ۔

خدایا ! ——— یہ قوم کتنی پاکیزہ دل ہے ۔ اور خیر و فلاح کی طرف کس قدر تیزی سے لپک پڑتی ہے ۔ بشرطیکہ اسے مخلص اور پاک دامن رہنما نصیب ہوجائے ۔ رفقاء اور احباب جن میں مختلف تعمیراتی شعبوں کے پیشہ ور اصحاب بھی تھے ۔ تیزی کے ساتھ اس زاویئے کی مرمت میں لگ گئے ۔ اور اس کی ضرورت کی اشیاء کی فراہمی اور اسے مطلوبہ مقصد کے مطابق درست کرنے میں مشغول ہوگئے ۔ صرف دو راتوں کے اندر انھوں نے اس مہم کو بوجوہ احسن سرانجام دے دیا اور زاویہ کے اندر پہلا اجتماع منعقد ہوگیا ۔

شرکائے اجتماع نماز و عبادت کے کوچے میں نئے نئے وارد ہو رہے تھے ۔ یا صحیح ترین الفاظ میں ان کی اکثریت نوآموز تھی ۔ اس معلّم نے ان کے ساتھ خالص عملی طریق کار اختیار کیا ۔ یہ کوشش نہیں کی کہ انھیں عبارات پڑھ پڑھ کر سنائے یا نظری احکام و مسائل کی رٹ ان کے سامنے لگائے ۔ بلکہ وہ انھیں سیدھا پانی کی ٹونٹیوں کی طرف لے گیا ۔ اور انھیں ایک قطار میں بٹھا دیا ۔ اور خود ان کے درمیان رہنما بن کر کھڑا ہوگیا ، اور انھیں وضو کے ایک ایک جزء کا طریقہ سکھایا ۔ جب ان لوگوں نے اپنا وضو مکمل کرلیا تو دوسرے گروپ اور اس کے بعد تیسرے گروپ کے ساتھ بھی اس نے یہی طریقہ اختیار کیا ۔ اس عملی تعلیم سے تمام لوگ وضو کے افعال و آداب میں اچھی طرح پختہ ہوگئے ۔ پھر ان کے سامنے وضو کرکے روحانی ، جسمانی اور دنیوی فضائل بیان کرنے لگا ۔ اور احادیث میں وضو کا جو اجر و ثواب بیان کیا گیا ہے حاضرین کے اندر اس کے حصول کا شوق ابھارنے لگا ۔ مثلاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مبارک کہ :۔

من توضأ فأحسن الوضوء خرجت خطاياه من جسده حتى تخرج من تحت اظفاره۔

"جو شخص حسن وخوبی کے ساتھ وضو کرتا ہے اس کے جسم سے تمام گناہ اُتر جاتے ہیں حتیٰ کہ ناخنوں کے نیچے سے بھی گناہ صاف ہو جاتے ہیں"۔

یا یہ ارشاد مبارک کہ :۔

ما من احد یتوضأ فیحسن الوضوء ویصلی رکعتین، یقبل بقلبه ووجهه علیهما الا وجبت له الجنة۔

"جو شخص بھی وضو کرتا ہے، اور اُسے خوب سنوار کر کرتا ہے، اور پھر دو رکعت ادا کرتا ہے، اور اپنے دل کو اور رُخ کو ان میں یکسو رکھتا ہے، اس کے لیے جنّت لازم ہو جاتی ہے"۔

اس طرح کی احادیث کی بدولت یہ معلّم اپنے زیرِ تربیت بھائیوں کے اندر مستحبات اور مستحسن کام کرنے کا ولولہ اُبھارتا اور ان کے ذوق وشوق کو ہوا دیتا۔

معلّم پھر انھیں نماز کی طرف لاتا، نماز کے ایک ایک رکن کی ان کے سامنے تشریح کرتا۔ اور ان سے درخواست کرتا کہ اب وہ ان کے سامنے عملاً نماز ادا کریں۔ پھر انھیں نماز کے ماثورہ فضائل وبرکات سے آگاہ کرتا۔ ترکِ نماز کا خوف دلاتا۔ ان سب کاموں کے دوران ایک ایک کر کے ان کے ساتھ سورہ الفاتحہ کو زبانی دہراتا، اور انھیں پہلے سے جتنی چھوٹی چھوٹی سورتیں یاد تھیں ان میں سے ایک ایک سورت ان سے سُنتا اور اس کی تصحیح کرتا۔ ان نوگرفتاروں کے ساتھ اس کی گفتگو صرف ان کیفیات وواردات کو بیان کرنے تک محدود ہوتی جو خوف ورجاء سے لبریز ہوتی ہیں۔ وہ فروعی اور جزوی مسائل کی باریکیوں میں نہ جاتا اور نہ مبہم اصطلاحات کا سہارا لیتا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حاضرین کے دل احکامِ اسلام کے لیے گداز ہو گئے۔ اور ان کے ذہنوں میں ہر مسئلہ خوب واضح اور روشن ہو گیا۔

اس طرح احکام کا خالصۃً فقہی پہلوان کے لیے خشک و بے لطف نہ رہا۔

عقیدہ پر توجہ

معلّم اپنی ہر گفتگو کے دوران اور ہر نشست میں اسلام کے صحیح عقیدہ کو بھی چھیڑتا رہتا۔ اور اُسے برابر نشو و نما دیتا رہتا۔ اور مضبوط کرنے کی کوشش کرتا۔ اور قرآن کریم کی آیات، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث صلحار کی سیرتیں اور اہلِ ایمان و ایقان کی سرگزشتیں بیان کرکے اُن کے قلوب واذہان میں اسے ثبت کرنے کی تدبیریں کرتا۔ اس باب میں بھی وہ فلسفیانہ نظریات اور منطقی قیاسات سے تعرض نہ کرتا۔ بلکہ وہ کائنات کے اندر ذاتِ باری کی عظمت وکبریائی اور مخلوق کے اندر صفاتِ خداوندی کی جلوہ آرائی کی طرف نگاہوں کو مبذول کرتا، آخرت کی یاد دلاتا، ان تمام حقائق کو وہ وعظ و تذکیر کے اسلوب میں اسی حد تک بیان کرتا جس سے ان حقائق کے بارے میں قرآن کریم کی جلالتِ شان اور شوکت وعظمت اُجاگر ہو۔

مزید براں وہ کسی فاسد اور غلط عقیدہ کو اس وقت تک پاش پاش نہ کرتا جب تک وہ پہلے ذہنوں میں صحیح اور صالح عقیدہ تعمیر نہ کرلیتا۔ تعمیر کے بعد انہدام جتنا آسان تر ہے تعمیر سے پہلے اتنا ہی دشوار تر۔ یہ نہایت باریک نکتہ ہے، جو اکثر مصلحین اور مبلّغین کے فہم وادراک سے غائب رہتا ہے۔

الحاج مصطفٰے کے زاویہ میں

ایک دوسرا زاویہ بھی ہماری پناہ گاہ تھا۔ اس زاویہ کو حاجی مصطفٰی نے فی سبیل اللہ تعمیر کروایا تھا۔ وہاں بھی جویانِ علم کی ایک جماعت جمع ہوتی اور اخوت و پاکیزہ نفسی کی فضا میں آیاتِ الٰہی اور حکمتِ خداوندی کا مطالعہ کرتی۔

زیادہ عرصہ نہ گزرنے پایا کہ ہمارے اس درس واجتماع کی خبر دُور دُور تک پھیل گئی یہ درس مغرب اور عشاء کے درمیان میں ہوتا۔ اس درس کے بعد راقم قہوہ خانوں کے

اندر جاری کردہ درسوں کے لیے نکل جاتا۔ اب ان درسوں کے اندر ہر رنگ کے لوگ کثرت سے آنے لگے۔ ان میں خلافیات کے مشاق، جدل پسند اور سابقہ فتنوں کی لکیر پیٹنے والے بھی تھے۔

ایک رات میں نے حاضرین کے اندر ایک انوکھی اسپرٹ محسوس کی۔ تفرقہ پسندی کی اسپرٹ اور اُچھل پڑنے کی کیفیت۔ میں نے دیکھا کہ سامعین الگ الگ بیٹھے ہوئے ہیں۔ حتیٰ کہ نشستوں کے اندر بھی امتیازات قائم ہو چکے ہیں۔ میں نے درس کی ابتدا ہی کی تھی کہ یکایک مجھ سے یہ سوال پوچھا گیا:

"وسیلے کے بارے میں جناب کی کیا رائے ہے؟"

میں نے کہا: "میرا خیال ہے کہ آپ مجھ سے صرف اسی ایک مسئلے کے بارے میں سوال نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ آپ یہ بھی پوچھیں گے کہ اذان کے بعد درود و سلام پڑھنا چاہیے یا نہیں۔ جمعہ کے روز سورۂ کہف کی تلاوت جائز ہے یا نہیں۔ تشہد کے اندر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم مبارک کے ساتھ "سیّدنا" کا لفظ پڑھا جائے یا نہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کس کیفیت میں ہیں۔ اور اب ان کا کس جگہ ٹھکانا ہے۔ قرآن خوانی کا ثواب مُردے کو پہنچتا ہے یا نہیں؟۔ صوفیاء اور اہلِ طریقت کی موجودہ مجالس معصیت ہیں یا تقرب الی اللہ کا ذریعہ۔" میں نے وہ تمام اختلافی مسائل گنوانے شروع کر دیئے جو سابقہ فتنہ میں مابہ النزاع تھے اور جن پر ان لوگوں کے اندر شدید سر پھٹول ہو چکی تھی۔ سائل میری تقریر سُن کر انگشت بدنداں ہوگیا، اور کہنے لگا: "جی ہاں، میں ان تمام باتوں کا جواب معلوم کرنا چاہتا ہوں۔

میں نے عرض کیا: "میرے بھائی میں عالم نہیں ہوں۔ میں ایک مدرس (درس و وعظ سے دلچسپی رکھنے والا اشہری) ہوں۔ مجھے کچھ قرآن کریم کی آیات حفظ ہیں۔ چند احادیث شریفہ ازبر ہیں اور کتابوں کا مطالعہ کر کے میں نے کچھ دینی احکام و مسائل کا ذخیرہ

جمع کر رکھا ہے۔ اور رضا کارانہ طور پر لوگوں کو دینی درس دیتا رہتا ہوں۔ اگر ان حدود سے مجھے آپ باہر لے جائیں تو مجھے نازک پوزیشن میں مبتلا کر دیں گے، اور جو شخص یہ کہہ دے کہ لاادری (میں کچھ نہیں جانتا) تو یہ بھی اس کا ایک فتویٰ ہے۔ اگر آپ کو میری باتیں بھلی لگیں اور ان کے اندر آپ کو خیر کا کوئی پہلو نظر آئے تو براہِ کرم انھیں سماعت فرمائیں۔ اور اگر معلومات میں مزید اضافہ چاہتے ہیں تو میرے سوا دوسرے علماء و فضلاء کی طرف رجوع کریں۔ جس مسئلے کے بارے میں آپ کو ضرورت درپیش ہے اس پر وہ آپ کو فتویٰ دے دیں گے۔ میرا مبلغِ علم تو اتنا ہی ہے جو میں نے آپ کے سامنے رکھ دیا ہے۔ اور اللہ تعالےٰ ہر متنفّس کو اتنی ہی تکلیف دیتا ہے جو اس کی وسعت میں ہوتی ہے۔ سائل میری تدبیر کی گرفت میں آگیا اور اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ یوں میں نے اس نرالے اسلوب ——— سادہ و پُرکار اسلوب ——— کی مدد سے اُسے فتنہ آرائی سے روک دیا۔ تمام حاضرین نہ سہی مگر اکثر حاضرین میری اس گلوخلاصی پر مطمئن ہو گئے۔ لیکن میں نے بھی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ حاضرین کی طرف متوجہ ہو کر میں نے عرض کیا:

> محترم برادران! مجھے خوب معلوم ہے کہ جناب سائل اور آپ حضرات میں سے اکثر افراد اس سوال کے پردے میں دراصل یہ جاننا چاہتے ہیں کہ یہ نیا مبلّغ کس پارٹی سے تعلق رکھتا ہے۔ کیا شیخ موسیٰ کی پارٹی کا آدمی ہے یا شیخ عبدالسمیع کی حزب سے وابستگی رکھتا ہے۔ یہ تحقیق آپ کے لیے قطعاً مفید نہیں ہے۔ اس فتنہ آرائی اور پارٹی بازی میں آپ لوگ پورے آٹھ سال صرف کر چکے ہیں۔ اب اسی پر کفایت کریں۔ ان مسائل کے اندر مسلمان صدیوں سے باہمی اختلاف کرتے چلے آرہے ہیں۔ اور اب تک ان کے اندر اختلاف قائم ہے۔ اللہ تبارک وتعالےٰ کو ہماری باہمی محبت اور وحدت پسند ہے۔ اور اختلاف اور تفرقہ اندازی

ناپسند۔ میں امید رکھتا ہوں کہ آپ لوگ اللہ سے عہد کریں گے کہ ان بحثوں کو ترک کردیں گے اور یہ کوشش کریں گے کہ دین کے اصول و قواعد سیکھیں۔ دین کے اخلاق پر کاربند ہوں اور عمومی فضائل کو حرزِ جاں بنائیں اور متفق علیہ تعلیمات پر عمل کریں۔ فرائض و سنن کو ادا کریں، خوردہ گیری اور موشگافی سے دست بردار ہوجائیں تاکہ دلوں کی دنیا آئینہ رنگ صاف و شفاف ہوجائے۔ اور ہم سب کا مطمح نظر معرفت حق ہو نہ کہ محض مسلک کی حمایت۔ اگر ہمارے اندر یہ ذوق اُبھر آیا تو ہم ان تمام مسائل پر باہم محبت و اعتماد کی فضا میں اور اتحاد و اخلاص کے جلو میں اظہار خیال کرتے رہیں گے۔ میں امید رکھتا ہوں کہ آپ لوگوں کو میری رائے قبول ہوگی اور اس پر قائم رہنے کے لیے ہمارے درمیان ایک پختہ عہد استوار ہوجائے گا۔"

میری دردبھری اپیل کارگر ثابت ہوئی۔ اس محفل سے ہم اس حالت سے رخصت ہوئے کہ ہم یہ باہم عہد کرچکے تھے کہ ہمارا مقصودِ نظر تعاون اور دین حنیف کی خدمت ہوگا۔ ہم دین کے لیے یکجہت ہوکر کام کریں گے۔ اختلافی امور کو نظرانداز کریں گے۔ اور ان امور میں ہر شخص اپنی اپنی رائے پر قائم رہے گا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالےٰ اپنا فیصلہ صادر فرمادے جو اٹل ہے۔ اس کے بعد زاویے کا درس بتوفیق ایزدی اختلافی فضا سے محفوظ و مامون جاری و ساری رہا۔ اب میں ہر موضوع کے اندر اہلِ ایمان کی باہمی اخوت و مؤدت کے پہلوؤں کو مدارِ گفتگو بناتا تاکہ دلوں کے اندر حقوق اخوت کو زیادہ سے زیادہ نقش کروں۔ بعض ایسے اختلافی گوشوں کو بھی منتخب کرلیتا جو ان کے درمیان محلِ نزاع نہ تھے۔ اور جو سب کے لیے موجب احترام و عقیدت تھے۔ ان گوشوں کو میں اس لیے چھیڑتا کہ انھیں سلف صالحین رحمہم اللہ کی مسامحت و رواداری کی دلیل میں پیش کروں اور یہ بتاسکوں کہ اختلافی آراء کا احترام اور ان میں ہمارا باہم رواداری اختیار کرنا واجب ہے۔

ایک مثال

مجھے یاد ہے کہ میں نے ایک مرتبہ اس موضوع پر ان کے سامنے ایک عملی مثال بھی بیان کی۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ آپ لوگوں میں سے کون صاحب حنفی المسلک ہیں ؟۔

ایک شخص اُٹھ کر میرے پاس آگیا۔

پھر میں نے پوچھا: شافعی المسلک کون ہے ؟۔

ایک اور صاحب یہ سُن کر آگے بڑھے۔

میں نے ان سے کہا کہ: یہ دونوں ابھی میری امامت میں نماز پڑھیں گے۔ اے حنفی! قرأت فاتحہ کے بارے میں تو کیا مسلک اختیار کرے گا ؟۔

حنفی نے کہا: میں خاموش رہوں گا اور فاتحہ نہیں پڑھوں گا "

شافعی سے میں نے دریافت کیا: " تم کون سا طریقہ اختیار کرو گے ؟"

اس نے جواب دیا: " میں لازماً فاتحہ پڑھوں گا "

اس پر میں نے کہا: " جب ہم نماز سے فارغ ہوں گے تو اے شافعی بتا کہ تیرے بھائی حنفی کے بارے میں تیری کیا رائے ہوگی ؟"

اس نے کہا: " اس کی نماز باطل ہوگئی۔ کیونکہ اس نے امام کے پیچھے فاتحہ نہیں پڑھی، اور فاتحہ ارکانِ نماز میں سے ایک رکن ہے "

میں نے حنفی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ حنفی صاحب شافعی بھائی کے عمل کے بارے میں تو کیا رائے رکھتا ہے ؟۔

اس نے جواب دیا: " اس نے مکروہ تحریمی کا ارتکاب کیا۔ مقتدی کا امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنا مکروہ تحریمی ہے "

میں نے دونوں سے مخاطب ہو کر کہا: " کیا تم ایک دوسرے کے فعل کو منکر سمجھ کر اُسے مٹانے کی کوشش کرو گے ؟"

دونوں نے یک زبان ہو کر جواب دیا: "ہرگز نہیں!"۔

میں نے دیگر سامعین سے پوچھا کہ تم سب لوگ ان پر نکیر کرو گے؟

سب نے نفی میں جواب دیا۔

میں نے کہا: سبحان اللہ۔ اس معاملے میں تو تم سکوت کے لیے گنجائش نکال لو گے حالانکہ یہ نماز کے باطل ہونے یا صحیح ہونے کا معاملہ ہے۔ مگر تم کسی نمازی کے ساتھ اس بارے میں رواداری کا پہلو اختیار کرنے کے لیے تیار نہیں ہو کہ اس نے تشہد میں "اللّٰھم صلّ علیٰ محمّد" کیوں پڑھا ہے یا "اللّٰھم صلّ علیٰ سیّدنا محمّد" کیوں پڑھا ہے۔ اور اتنی سی بات کو تم لوگ اختلافی قضیہ بنا لو گے اور ایک ہنگامۂ رستاخیز برپا کر دو گے!!

——— میرا یہ طریقِ دعوت خاصا مؤثر رہا۔ لوگ اپنے باہمی رویّے پر نظرِ ثانی کرنے لگے۔ اور ان کے اندر یہ خیال راسخ ہو گیا کہ اللہ کا دین بہت کشادہ اور آسان ہے اور اس میں کسی ایک فرد یا گروہ کی اجارہ داری نہیں ہے۔ ہر چیز کا مرجع اللہ کی ذات اور اس کا رسول ﷺ ہے۔ یا پھر مسلمین کی جماعت اور امام کی طرف رجوع کیا جائے گا اگر فی الواقع ان کی کوئی جماعت اور ان کا کوئی امام موجود ہو۔

اسماعیلیہ کا معاشرہ

اسماعیلیہ کے اندر اپنے تدریسی سال کے نصف اوّل کا اکثر حصّہ میں نے اسی رنگ ڈھنگ میں گزارا۔ یعنی ۱۹۲۷ء کے بقیہ ماہ اور ۱۹۲۸ء کا اوائل اسی طرز میں بسر کیا۔ اس پورے عرصے میں میرا یہ ہدف تھا کہ میں یہاں کے لوگوں اور شہر کے حالات کا باریک بینی اور دقّتِ نظر کے ساتھ مطالعہ کروں۔ اور ان محرکات وعوامل کا کھوج لگاؤں جو اس معاشرے پر اثر انداز ہیں۔ چنانچہ میرا حاصل مطالعہ یہ ہے کہ یہاں چار عناصر کی کارفرمائی ہے۔ ایک علماء، دوسرے مشائخ طریقت، تیسرے اعیان شہر اور چوتھے کلب۔

رہے علماء، تو میں نے ان کے ساتھ دوستی اور پورے احترام و توقیر کی روش اختیار

کی۔ اور میں نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ درس یا تقریر یا خطبہ میں میں کسی عالمِ دین سے پیشقدمی نہیں کروں گا۔ چنانچہ اگر میں درس دے رہا ہوتا اور کوئی مولوی صاحب تشریف فرما ہو جاتے میں فوراً درس سے دست بردار ہو جاتا اور مولوی صاحب کو حاضرین کی خدمت میں پیش کر دیتا۔ میری اس روش نے علماء کے دلوں پر اچھا اثر قائم کیا اور انھوں نے ہمیشہ میرے حق میں کلمۂ خیر ہی کہا۔

ان دنوں ایک بڑا دلچسپ لطیفہ پیش آیا۔ ایک قدیم ازہری شیخ جنھوں نے ازہر شریف میں ازہر کے نظام قدیم کے تحت کئی سال گزارے تھے۔ ——— اور وہ بحث ومباحثہ کے بڑے شائق تھے۔ اور ہمیشہ واعظین، علماء اور اصحاب درس کو نامانوس مسائل چھیڑ کر تنگ کرتے رہتے تھے۔ اور ایسے ایسے موضوعات ومطالب کو زیر بحث لاتے جو کتابوں کے قدیم حواشی اور دقیق وعمیق تاویلات سے ماخوذ ہوتے ——— ایک روز انھوں نے مجھے بھی الجھانا چاہا۔ میں لوگوں کے سامنے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ بیان کر رہا تھا۔ شیخ موصوف نے مجھ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام دریافت کیا۔ میں مسکرایا اور ان سے عرض کیا: مولانا شیخ عبدالسلام ——— اللہ تعالےٰ ان پر رحمت نازل فرمائے ——— روایات میں ہے کہ اس کا نام تارِخ ہے۔ اور آذر حضرت ابراہیم کے چچا کا نام ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ آزر ان کا باپ تھا۔ اور اگر آزر کو چچا بھی تسلیم کر لیا جائے تو اس میں کوئی مانع نہیں ہے۔ اس لیے کہ لغتِ عرب میں چچا کو والد کہہ دیا جاتا ہے۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ آذر بت کا نام ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد یا چچا کا نام نہیں ہے۔ اور آیت بتقدیر محذوف یوں ہوگی کہ اذقال ابراھیم لابیہ "اترک" آزر اتتخذ اصنامًا الھۃ (جب ابراہیمؑ نے اپنے باپ سے کہا ترک کر دے آزر صنم کو، کیا تو بتوں کو خدا بنائے رکھے گا) میں نے لفظِ تارخ کو ر کے زیر کے ساتھ پڑھا۔ یہ بیان ایجاز واختصار

کے باوجود میرے جیسے لوگوں کے لیے چونکہ تسلّی بخش تھا اس لیے شیخ نے یہ پسند نہ کیا کہ یہ معرکہ یوں ہی سکون کے ساتھ گزر جائے۔ فرمانے لگے:

" حضرت ابراہیمؑ کے والد کا نام "تارخ" رٓ کی پیش کے ساتھ ہے۔ آپ نے زیر پڑھی ہے "

میں نے کہا: " چلیے پیش کے ساتھ ہی ہوگا۔ یہ بہر حال عجمی نام ہے۔ اس کا درست تلفّظ اس زبان کے جاننے پر موقوف ہے۔ اصل مدّعا عبرت و نصیحت ہے"۔ شیخ رحمہ اللہ ہر درس کے اندر میرے ساتھ اسی طرح کی چٹکیاں لیتے رہتے۔ منشا، یہ تھا کہ عام سامعین اِن لاحاصل مجادلوں سے اُکتا کر بھاگ جائیں اور یہ خیر سے خالی معرکہ آرائی دو مولویوں پر چھوڑ دیں۔ میں نے شیخ کے علاج کی ایک تدبیر سوچی۔ انھیں اپنے مکان پر دعوت دی۔ اور ان کی خوب پذیرائی کی، اور فقہ اور تصوّف پر دو کتابیں ان کی خدمت میں ہدیۃً پیش کیں۔ اور انھیں اطمینان دلایا کہ جو کتابیں وہ پسند فرمائیں میں انھیں ہدیۃً پیش کرنے کے لیے تیار ہوں۔ حضرت شیخ اس پیش کش سے بے حد مسرور ہوئے۔ درس میں پابندی سے آتے رہے اور خوب توجہ و انہماک سے سنتے رہے۔ اور لوگوں کو بھی درس میں شریک ہونے کی اصرار و تاکید کے ساتھ دعوت دینے لگے۔ میں نے دل میں کہا:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس قدر درست فرمایا ہے کہ:- تھادوا تحابوا۔ (باہم ہدیوں کا تبادلہ کرو اس سے محبّت پیدا ہوگی)۔ کچھ دیر تک تو یہ طریق کار خوب کامیاب رہا۔ مگر انسانی نفس برابر قلابازیاں کھاتا رہتا ہے۔ مشائخ اور پیران طریقت کو لیجیے اس شہر کے باشندے بڑے نیک دل ہیں اور پیران طریقت کی گھما گھمی ہے اور باہر سے بھی بکثرت مشائخ کا یہاں پھیرا رہتا تھا۔ شیخ حسن عبداللہ المسلمی، شیخ عبود الشاذلی، اور شیخ عبدالوہاب الدندراوی وغیرہم کی مجلسیں میرے حافظے میں محفوظ ہیں۔ اسی زمانے کی بات ہے کہ شیخ عبدالرحمان سعد اسماعیلیہ کے دورے پر آئے۔ موصوف شیخ حصافی کے خلفاء میں سے تھے اور ہمارے

پیر بھائی ۔ ان کا طریقہ یہ تھا کہ وہ پہلے درس دیتے اور وعظ فرماتے اور اس کے بعد محفلِ ذکر کی سرپرستی فرماتے ۔ وہ مسجد میں تشریف لائے ۔ میں انھیں نہیں پہچانتا تھا اور نہ وہ مجھے جانتے تھے ۔ انھوں نے مسجد میں پہلے درس و وعظ کیا ۔ اور پھر لوگوں کو ذکر میں شریک ہونے کی دعوت دی ۔ میں نے دیکھا کہ یہ ذکر طریقۂ حصافیہ کے اسلوب کے مطابق ہے ۔ چنانچہ میں نے موصوف سے اپنا تعارف کرایا ۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ میں دعوت کو ایک مخصوص طریقے کے طور پر پھیلانے کا قطعاً کوئی جذبہ نہ رکھتا تھا ۔ اس کے متعدد اسباب تھے ۔ سب سے اہم سبب یہ تھا کہ میں دوسرے سلسلوں کے ہمنواؤں کے ساتھ رقابت وخصومت کو جنم نہیں دینا چاہتا تھا ، اور نہیں چاہتا تھا کہ ہماری دعوت مسلمانوں کے چند مخصوص افراد کے اندر محصور رہے یا اسلام کے اصلاحی مشن کے صرف ایک گوشے پر مرکوز رہے ۔ بلکہ میں نے پوری جدوجہد کی کہ میری دعوت عمومی رنگ سے آراستہ رہے ۔ اس کا محور علم وآگہی ہو ۔ تربیت وتزکیہ ہو اور جہاد وعمل ہو ۔ اور یہ تینوں اُمور اسلامی دعوت کے بڑے بڑے ستون ہیں ——— اور جو شخص اس کے بعد کسی مخصوص نوعیت کی تربیت میں ترقی کرنا چاہتا ہو وہ اپنی پسند پر عمل پیرا ہو سکتا ہے ——— لیکن اپنے اس نصب العین کے باوجود میں نے حصافی سلسلہ کے ایک اہم رہنما شیخ عبدالرحمٰن سعد کی پذیرائی کی اور ان کا پُرتپاک استقبال کیا اور سلسلہ حصافیہ سے دلچسپی رکھنے والوں کو اُن سے اخذ واستفادہ کرنے اور ان کے وعظ سننے کی تلقین کرتا رہا ۔ کچھ عرصہ قیام کے بعد شیخ عبدالرحمٰن واپس چلے گئے ۔

انہی ایام میں میرا تعارف سید محمد الحافظ تیجانی سے ہوا ۔ جو اسماعیلیہ خاص طور پر اس غرض سے آئے تھے کہ لوگوں کو بہائیوں کی دسیسہ کاریوں اور مکارانہ چالوں سے ہوشیار کریں ۔ کیونکہ ان دنوں اسماعیلیہ کے نواح میں بہائی دعوت بڑی شدّومد کے ساتھ پھیل رہی تھی ۔ اور بہائی مبلّغین کمر کس کر میدان میں اُترے ہوئے تھے ۔ سید محمد الحافظ

نے عوام النّاس کو بہائیوں سے خبردار کرنے، بہائیوں کی فریب کاریوں کا پردہ چاک کرنے اور ان کے افکارِ باطلہ کا پول کھولنے میں بڑے قابلِ قدر کارنامے سرانجام دیئے۔ ان کے علم و فضل، دین پسندی اور غیرتِ اسلامی کو دیکھ کر میں بڑا متاثر ہوا۔ لوگ سلسلہ اسماعیلیہ پر غلو اور مبالغہ آرائی اور شریعت کی خلاف ورزی کے جو اعتراضات عائد کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں میں نے ان سے طول طویل بحثیں کیں۔ اور انہی باتوں میں کئی کئی راتیں جاگ کر کاٹیں۔ موصوف اہلِ فرقہ کے اُن افکار کو جن میں تاویل کی گنجائش ہوتی تاویل سے کام لیتے اور جو اسلام کے صاف و شفّاف عقیدے سے متصادم ہوتے ان کی نفی کرتے اور ان سے سختی کے ساتھ برأت کا اظہار کرتے۔

الغرض ان اکثر مشائخ اور پیرانِ کرام کے ساتھ، جو وقتاً فوقتاً اسماعیلیہ وارد ہوتے رہتے تھے۔ میرا رویہ یہ تھا کہ میں آدابِ طریقت کے مطابق ان کے سامنے زانوئے ادب طے کرتا، اور طریقت ہی کی زبان میں ان سے ہمکلام ہوتا۔ اور پھر جب ان سے خلوت آرا ہوتا تو ہر ایک کو مسلمانوں کی دُکھ بھری داستان سُناتا کہ کس طرح مسلمان دین کی مبادیات سے بھی بے خبر ہو چکے ہیں۔ ان کا شیرازہ پراگندگی کی نذر ہو چکا ہے۔ انھیں اپنے دینی اور دنیوی مفادات کا ہوش بھی نہیں رہا ہے۔ ان کا دین بھی عظیم الشان خطرات کی زد میں ہے۔ کیونکہ اباحیت والحاد کی یلغار ان کے اصل مراکز سے ٹکرا رہی ہے۔ اور ان کی دنیا بھی تباہی سے دوچار ہے۔ کیونکہ غیر ملکی حملہ آور ان کے ملک کی دولت پر غالب و قابض ہوتے جا رہے ہیں۔ اسماعیلیہ کی مغربی سمت میں برطانوی فوج کا کیمپ اور مشرقی جانب کینال سوئز کمپنی کے دفاتر میرے واویلے کی جیتی جاگتی مثال ہیں۔ میں ان پیرانِ طریقت کو یاد دلاتا کہ آپ کے پیروکار آپ پر پورا پورا اعتماد کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنی نکیل آپ کے ہاتھ میں دے رکھی ہے۔ لہٰذا ان کی طرف سے آپ کے کندھوں پر یہ سخت ذمہ داری عائد ہو چکی ہے کہ آپ انھیں راہِ خدا کی نشان دہی کریں اور

خیر و فلاح کی جانب ان کی رہنمائی کریں۔ پھر میں ان حضرات سے آخر میں یہ مطالبہ بھی کرتا کہ آپ لوگ اپنی تمام تر مساعی اس بات پر صرف کریں کہ مریدوں کے ذہن علم و آگہی کی روشنی سے منوّر ہوں۔ اور وہ اسلام کی صحیح تربیت سے مزین ہوں۔ اور اسلام کی برتری اور اسلامی شان و شوکت کی بحالی کے لیے یک جان و یک زبان ہو جائیں۔

شیخ عبدالوہاب الدندراوی رحمہ اللہ کی ملاقات بھی مجھے ابھی تک یاد ہے۔ میں نے انھیں تقریباً اپنا ہی جیسا ہم عمر نوجوان پایا۔ کوئی بیس یا اکیس برس کی عمر ہوگی۔ راست بازی اور نیکوکاری ان کے اندر نظر آئی۔ میں ان کی مجلس میں بڑے ادب و احترام کے ساتھ بیٹھا رہا۔ جب مجلسِ عام ختم ہوئی تو میں نے درخواست کی کہ میں پرائیوٹ کمرے کے اندر ان سے خلوت میں ملنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ جب میں کمرے میں داخل ہوا تو میں نے اپنی رومی ٹوپی سر سے اُتار کر کرسی پر رکھ دی اور ٹوپی پر جو عمامہ باندھ رکھا تھا اسے بھی اُتار کر ٹوپی کے ساتھ رکھ دیا۔

موصوف کو میرے اس فعل پر اچنبھا ہوا، کیونکہ اس سے پہلے انھیں ایسی صورتِ حال سے سابقہ پیش نہ آیا تھا۔ میں نے اُن سے کہا: برادرم میری اس کارروائی کو ہدفِ تنقید نہ بناؤ۔ میں نے یہ کام اس لیے کیا ہے کہ تاکہ میں اس ظاہری فرق کو ختم کر دوں جو میرے اور آپ کے درمیان پایا جاتا ہے۔ تاکہ میں صرف ایک مسلمان نوجوان سے ہم کلام ہو سکوں جس کا نام عبدالوہاب الدندراوی ہے۔ رہے شیخ عبدالوہاب تو انھیں ہم مجلسِ عام میں چھوڑ آئے ہیں۔

برادرم، آپ عمر کی بیسویں بہاریں ہیں۔ اور بحمد اللہ آپ سرتاپا شباب، زندگی اور جذبہ ہیں۔ یہ انسانی اجتماعات آپ کے سامنے ہیں۔ ان انسانی گروہوں کو اللہ تعالےٰ نے آپ کے گرد جمع کر دیا ہے۔ یہ راتیں ذکر و مناجات میں گزار دیتے ہیں۔ اور اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کرتے۔ ان میں سے اکثر کی حالت دوسرے مسلمانوں کی حالت سے مختلف نہیں ہے۔ وہی دین سے ناواقفیت، وہی اسلام کی عزّت و عظمت کے احساس سے بے نیازی۔ کیا یہ صورتِ حال

آپ کو پسند ہے ؟"

موصوف نے برجستہ جواب میں کہا: "میں کیا کروں ؟"

میں نے عرض کیا: "ان کے اندر علم و آگہی پیدا کریں، انھیں منظم کریں اور ان کا محاسبہ کریں۔ سلف صالحین کی سیرت و کردار کی انھیں تربیت دیں، اور اسلام کے نامور مجاہدوں کی تاریخ انھیں بتائیں"

الغرض ان موضوعات پر ہمارے درمیان دیر تک بات چیت ہوتی رہی۔ شیخ عبدالوہاب نے ان باتوں سے بڑا گہرا اثر لیا۔ اور ہم دونوں نے عملی جدوجہد کا عہد کیا۔ یعنی ہم دونوں دینی بھائی بن کر اسلام کی ہمہ پہلو خدمت کریں گے۔ اسلام کی دعوت لوگوں کے دلوں میں نقش کریں گے۔ ہم میں سے ہر ایک اپنے اپنے میدان میں اور ماحول میں یہ فرض سر انجام دے گا۔ میں یہ شہادت دے سکتا ہوں کہ موصوف اس کے بعد جب بھی اسماعیلیہ آتے سب سے پہلے مجھ سے ملتے اور مجھے اطمینان دلاتے کہ وہ اپنے عہد پر بدستور قائم اور کار بند ہیں۔ اپنی وفات تک وہ اسی وطیرے کے پابند رہے۔ اللہ تعالےٰ ان پر رحمتیں نازل فرمائے اور اس وفا شعاری کا انھیں نیک صلہ عطا فرمائے۔

معززین شہر کے ساتھ

اسماعیلیہ کے اعیان و معززین اس زمانے میں دو قسم کے افکار کی نمائندگی کر رہے تھے۔ اس کی تہ میں دراصل وہی مذہبی اختلاف تھا جو بعض مسائل میں علماء کے اختلاف کی وجہ سے رونما ہو چکا تھا ـــــــــــ مگر درحقیقت اس اختلاف کو ہوا دینے میں شخصی اور خاندانی امور کا بہت بڑا دخل تھا۔ اور یہ بات مصری معاشرے میں بالعموم پائی جاتی ہے۔ شہر سے باہر کا اگر کوئی ملازم یہاں آجاتا تو اس کے لیے ناگزیر ہوتا تھا کہ وہ اعیانِ شہر سے رابطہ استوار کرے اور ان کے گھروں میں آمد و رفت رکھے۔ چنانچہ سرکاری ملازم جو اعیان شہر سے میل جول رکھتے تھے۔ تقریباً دو کیمپوں میں تقسیم ہو چکے تھے۔

ہر شخص اعیان شہر کے دونوں کیمپوں میں سے کسی ایک کیمپ کے ساتھ اپنا رشتہ استوار کر چکا تھا۔ لیکن میرا احساس یہ تھا کہ دعوت کا عمومی مزاج ——— جب کہ یہ دعوت اخوّت کی دعوت ہے اور مودّت والفت سے اس کا خمیر تیار ہوا ہے ——— مجھ پر لازم ٹھیراتا ہے کہ میں بیک وقت دونوں فریقوں سے مربوط رہوں۔ اور ان سے میرا رابطہ بالکل واضح اور عیاں ہونا چاہیے۔

چنانچہ میں جب دونوں فریقوں کے زعماء میں سے کسی کے مکان پر جاتا تو میں یہ طے کر لیتا کہ میں یہاں اس کے حریف اور مدّمقابل کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور کہوں گا۔ اور یہ تأثر دوں گا کہ وہ آپ کے حق میں خیر و فلاح کے سوا قطعاً کوئی جذبہ نہیں رکھتے۔ اور ہمیشہ نیک نامی کے ساتھ یاد کرتے رہتے ہیں۔ اور اب دونوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ہر اس کام میں باہمی تعاون کریں۔ جس میں ان کے شہر کی بہبود و فلاح ہے۔ اور خود اسلام بھی تعاون علی الخیر کا حکم دیتا ہے۔

الغرض میں ان محفلوں میں اسی نوعیت کے مسائل چھیڑے رہتا جس سے دلوں میں تقارب پیدا ہو۔ اور اگر میں کسی دوسرے شخص کو بھی ایک فریق کے مکان پر دوسرے فریق کی تنقیص و عیب جوئی کرتے ہوئے سُن لیتا تو میں فوراً اسے ٹوک دیتا اور اسے توجہ دلاتا کہ بھلائی اس میں ہے کہ آپ اتحاد و یگانگت کے سفیر بنیں اور کوئی ایسی بات ادھر سے اُدھر منتقل نہ کریں جو اس کارِ خیر کے لیے مددگار نہ ہو۔ اور غیبت و بدگوئی میں ملوّث ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ غیبت گناہِ کبیرہ ہے ——— میری یہ باتیں یقیناً دوسرے فریق کی طرف بھی پہنچا دی جاتی تھیں ——— جیسا کہ ایک چھوٹے پیمانے کے شہر میں یہ بیماری بالعموم پائی جاتی ہے ——— اور فریق ثانی کے لیے خوشی اور مسرت کا موجب ہوتیں۔ اس اسلوبِ کار کی بدولت میں بیک وقت دونوں فریقوں کی دوستی اور احترام حاصل کرنے میں کامیاب رہا، اور پھر جب بعد میں "اخوان المسلمون" کی باقاعدہ

تنظیم وجود میں آئی تو اخوان کی دعوت پر مختلف الخیال طبقات کے مجتمع ہو جانے میں میرے اس اسلوب کا بہت بڑا دخل تھا۔

کلبوں کی دنیا

اس زمانے میں اسماعیلیہ کے اندر ایک لیبر کلب تھا جسے انجمن امداد باہمی نے قائم کیا تھا۔ اور مزدوروں کے حلقے میں یہ کلب اپنا مشن بحسن وخوبی انجام دے رہا تھا۔ اس کلب کے اندر تعلیم یافتہ نوجوانوں کا ایک چیدہ گروہ بھی تھا جس کے اندر بھلائی کی بات سننے اور سیکھنے کی آمادگی پائی جاتی تھی۔ انجمن انسداد مسکرات کی ایک برانچ بھی قائم تھی۔ جس میں مسکرات سے متعلق لیکچر اور مذاکرات ہوتے رہتے تھے۔ میں نے اس موقع سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا اور دونوں اداروں کے ساتھ راہ ورسم پیدا کرلی، اور مذہب، معاشرت اور تاریخ کے موضوعات پر لیکچروں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ میرے یہ لیکچر بہت سے تعلیم یافتہ افراد کے دلوں کو آئندہ دعوت کے لیے تیار کرنے کا کارگر ذریعہ ثابت ہوئے۔

قاہرہ سے رابطہ

گو اسماعیلیہ کے اندر میری تمام تر توجہ فکری دعوت کو راسخ کرنے اور اس کے لیے ذہن وقلب ہموار کرنے پر مرکوز تھی۔ مگر بایں ہمہ میں قاہرہ کے اندر ان دنوں اٹھنے والی خفیف سی اسلامی لہر اور اس کے رجحانات ومقاصد سے بھی غافل نہ تھا۔ مجلہ الفتح کے ساتھ میرا مکمل رابطہ قائم تھا۔ اور اسماعیلیہ کے اندر میں الفتح کی دعوت کو پوری جدّ وجہد کے ساتھ پھیلا رہا تھا۔ اور زیادہ سے زیادہ اس کے خریدار پیدا کر رہا تھا۔ کیونکہ یہ مجلّہ روشنی کی پہلی کرن تھی جس کی ضو میں اسلامی تحریک کے علم بردار آغازِ سفر کرنے والے تھے۔

جمعیت شبان المسلمین

نوجوانوں کے اس گروپ کے ساتھ بھی میرا رشتہ برابر استوار تھا جن کے ساتھ قاہرہ میں تعارف ہو چکا تھا۔ اور جن کے ساتھ یہ عہد ہو چکا تھا کہ ہم سب مِل جُل کر اسلام کی ہمہ گیر دعوت

کا کام کریں گے۔

مجھے اس وقت کس قدر شدید فرحت ہوئی جب میں نے ایک صبح اخبارات کے اندر یہ خبر پڑھی کہ "شبان المسلمین" کے نام سے ایک جمعیت قائم کرنے کے لیے پہلا اجتماع منعقد ہو چکا ہے اور مرحوم عبدالحمید بک سعید کو اس کا صدر منتخب کرلیا گیا ہے۔ یہ سب کچھ ان اہلِ ایمان نوجوان بھائیوں کی کوششوں کا نتیجہ تھا جن کا ذکر میں اوپر کر آیا ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے خبر پڑھتے ہی عبدالحمید بک سعید کو ایک خط لکھا جس میں میں نے اعلان کر دیا کہ میں بھی اس جمعیت میں شریک ہوں۔ چنانچہ میں بڑی پابندی کے ساتھ جمعیت کو مقررہ اعانت بھیجتا رہا اور اس کی رفتارِ کار کا مسلسل جائزہ لیتا رہا اور جو انقلابات و حوادث اسے پیش آتے رہے ان کا پورے انہماک سے مطالعہ کرتا رہا۔ قاہرہ کے اندر میری پہلی اہم تقریر شارع مجلس النواب میں جمعیت کے کلب کے اندر ہوئی۔ میرا گمان یہ ہے کہ اس تقریر کا عنوان تھا:

"دو تہذیبوں کا موازنہ" ——— میں ہمیشہ ——— اور اب بھی ——— جمعیت شبان المسلمین کے بانیوں اور کارکنوں کی زرّیں اسلامی خدمات کی قدر دانی کرتا رہا ہوں۔ ان میں سے چند حضرات کے نام ابھی تک مجھے یاد ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر یحییٰ الدردیری، استاذ محمود علی فضلی، استاذ محمد النمراوی، سیّد محب الدین الخطیب وغیرہم۔ اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کو اسلام اور مسلمانوں کی طرف سے نیک جزا عطا فرمائے۔[1]

ایک دلچسپ واقعہ

ایک طرفہ صورت پیش آئی۔ اسماعیلیہ میں ہمیں اُترے ہوئے چالیس روز ہو گئے

---

[1] جمعیت الشبان المسلمین ابھی تک مصر میں قائم ہے۔ فوجی انقلاب کے بعد اسے نیم سرکاری ادارہ کی حیثیت دیدی گئی۔ اس کے موجودہ صدر ابراہیم الطحاوی حکومت کے نمائندے سمجھے جاتے تھے۔ (مترجم)

تھے۔ چھوٹے درجے کے ہوٹلوں میں (جنہیں ہم "بنسیونات" کہا کرتے تھے) مزید قیام رکھنا ہمارے لیے خوشگوار نہ رہا۔ ہم نے ایک پرائیوٹ مکان کرائے پر لے لیا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ ہمیں مکان کی سب سے آخری منزل میں جگہ ملی۔ اس مکان کی درمیانی منزل پوری کی پوری مصری عیسائیوں کے ایک گروپ نے لے رکھی تھی۔ اور وہاں انھوں نے اپنا ایک کلب اور ایک کلیسا قائم کرلیا۔ اور سب سے نچلی منزل مکمل طور پر یہودیوں کی ایک جماعت نے کرایہ پر لے لی۔ انھوں نے بھی وہاں کچھ حصہ کلب اور صومعہ کے لیے مخصوص کرلیا۔ ہم بالاترین منزل پر تھے۔ ہم وہاں باقاعدہ نماز قائم کرتے اور اس غرض کے لیے ہم نے بھی ایک جگہ مسجد کے لیے مخصوص کرلی۔ گویا یہ مکان تینوں مذاہب کی نمائندگی کر رہا تھا۔ صومعہ کی کلید بردار بڑھیا اُم شالوم کبھی نہیں بھلائی جا سکتی۔ یہ بڑھیا ہر سبت (ہفتہ) کی رات ہم سے درخواست کرتی کہ ہم اس کی بتّیاں روشن کردیں، اور گیس کا چولہا جلانے میں اس کا ہاتھ بٹائیں۔ (کیونکہ یہودی سبت کی رات کو کوئی کام کرنا جائز نہیں سمجھتے) ہم اسے چھیڑتے رہتے اور کہتے :-

"کب تک یہ ڈھکوسلے اور مکر و فریب کا کاروبار چلاتے رہو گے۔ اللہ تعالیٰ کے آگے یہ مکر و فریب نہیں چلتے۔"

اگر اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے سبت کے دن روشنی اور آگ دونوں چیزیں حرام قرار دے دی ہیں۔ جیسا کہ تم دعویٰ کرتے ہو تو کیا روشنی اور آگ سے استفادہ بھی حرام ٹھیرایا ہے، یا نہیں ؟"۔ بڑھیا ہماری بات سُن کر معذرت پیش کردیتی۔ اور ہمارا مجادلہ بعافیت ختم ہو جاتا۔

عکس اسماعیلیہ

اسماعیلیہ دل و دماغ پر عجیب و غریب کیفیت پیدا کرتا تھا۔ اسماعیلیہ کے مغرب میں یہ انگریزی فوج کی چھاؤنی واقع ہے جو اپنے رُعب داب اور شان و شوکت کی دھاک

بٹھا رہی ہے۔ اور ہر غیور اور محبّ وطن شخص کے دل میں اندوہ و غم کے جذبات بھڑکا رہی ہے اور اُسے مجبور کر رہی ہے کہ وہ اس منحوس استعمار کی تاریخ بار بار یاد کرتا رہے۔ اُسے یہ یاد رہے کہ اس استعمار نے مصر پر کیا کیا ہولناک مصائب توڑے، مادی اور علمی طور پر اسے کیسے کیسے سنہرے مواقع سے محروم کیا۔ مصر کی ترقی و تعمیر کی راہ میں وہ کس طرح روڑا بنا ہوا ہے اور ساٹھ سال سے عربوں کی وحدت اور مسلمانوں کے اتحاد میں کیوں کر مانع ہو رہا ہے۔

یہ خوشنما اور پُر شکوہ دفتر ــــــــ سویز کینال کی کمپنی کا انتظامی دفتر ــــــــ اپنی پوری سطوت و شوکت اور حسن و جمال کے ساتھ موجود ہے۔ اس میں مصری آکر چاکری کرتے ہیں اور یہ دفتر ان کے ساتھ وہی سلوک کرتا ہے جو مظلوم غلام کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ مگر غیر ملکیوں کی یہاں بڑی تکریم و توقیر ہوتی ہے۔ اور انھیں حکمرانوں اور اہل کاروں کا مرتبہ دیا جاتا ہے۔ یہ دفتر شہر کے تمام عوامی امور کا واحد نگران اور اجارہ دار ہے۔ روشنی، پانی، صفائی اور تمام معاملات جو بلدیاتی کونسلروں کے ہاتھ میں ہوتے ہیں کمپنی نے اپنے ہاتھ میں لے رکھے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ تمام راستے اور سڑکیں جو اسماعیلیہ ــــــــ ایک روایتی مصری شہر ــــــــ کی طرف آتی ہیں کمپنی کے قبضے میں ہیں۔ کوئی شخص کمپنی کے پروانۂ راہداری کے بغیر یہاں داخل نہیں ہو سکتا اور نہ اس کی اجازت کے بغیر یہاں سے باہر جا سکتا ہے۔

یہ وسیع و عریض کوٹھیاں ہیں جو پوری افرنگی کالونی میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ان میں کمپنی کے غیر ملکی ملازم مقیم ہیں۔ ان کے بالمقابل عرب مزدوروں کے مکانات ہیں، پست اور تنگ و تاریک۔ تمام بڑی بڑی شاہراہوں پر جتنی تختیاں نصب ہیں وہ اسی معاشی استعمار کی زبان میں لکھی ہوئی ہیں۔ جو عربوں کے سر پر دندنا رہا ہے۔ یہاں تک کہ شارع مسجد کا نام بھی یوں لکھا ہوا ہے RUE DE LE MOSQUE۔ ان تختیوں کے ذریعہ غیر ملکی ناموں کو یہاں دوام بخشنے کا انتظام کیا گیا ہے۔ مثلاً نگرلی، البرٹ، ادجینے ..... وغیرہ وغیرہ۔

یہ تمام واردات وحقائق مل جل کر دل پر اثر انداز ہو رہے تھے۔ علی الخصوص ان کی اثر اندازی اس وقت اور شدید ہو جاتی جب کوئی شخص اسماعیلیہ کے گھنے باغات اور اس کے نغمہ ریز گلستانوں میں یا التمساح جھیل کے خوبصورت ساحل پر یا صحرا، کے قدرتی جنگلات کے وسط میں بیٹھ کر ان تمام امور پر گریبان میں منہ ڈالے غور کرتا۔

بے شک اسماعیلیہ کے ماحول نے راقم کے دل ودماغ پر ایسے بکثرت اثرات وواردات نقش کر دیئے۔ دعوت کی تشکیل اور داعی کی ساخت و پرداست میں ان اثرات وواردات کا بہت بڑا دخل تھا۔

الاخوان المسلمون

جہاں تک مجھے یاد ہے یہ ذوالقعدہ ۱۳۴۷ھ مطابق مارچ ۱۹۲۸ء کی بات ہے کہ مندرجہ ذیل چھ احباب گھر پر مجھے ملنے کے لیے آئے۔ حافظ عبدالحمید، احمد الحصری، فؤاد ابراہیم، عبدالرحمان حسب اللہ، اسماعیل عز، اور زکی المغربی۔ یہ حضرات میرے ان درسوں اور تقریروں سے متاثر تھے۔ جو میں اسماعیلیہ میں وقتاً فوقتاً کرتا رہتا تھا۔ ان لوگوں نے مجھ سے دعوت کی گفتگو چھیڑ دی۔ اس وقت ان کی آوازیں گرج، آنکھوں میں چمک اور چہروں پر ایمان وعزم کی روشنی دمک رہی تھی۔ کہنے لگے:

> "ہم نے آپ کی تقریریں سنی ہیں۔ انھیں دل کی گہرائیوں میں نقش کیا ہے اور ان کا ہم پر غیر معمولی اثر ہوا ہے۔ لیکن ہم یہ نہیں جانتے کہ اسلام کی عزت اور مسلمانوں کی بہبود کا عملی طریقہ کیا ہے۔ موجودہ طرزِ حیات سے ہم بیزار ہیں۔ یہ ذلت اور قید کی زندگی ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ اس ملک کے اندر عربوں اور مسلمانوں کا کوئی مقام و مرتبہ اور عزت و وقار نہیں ہے۔ وہ بس غیر ملکیوں کے فرمانبردار مزدوروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہمارے پاس صرف یہ خونِ گرم ہے جو رگوں میں غیرت و

وخودی کی حرارت لیے دوڑ رہا ہے۔ یہ جانیں ہیں جو ایمان وشرف کے احساس سے لبریز ہیں۔ یہ چند درہم ہمارے ہاتھ میں ہیں جو ہم اپنے بچوں کا پیٹ کاٹ کر لائے ہیں۔ جس طرح آپ کام کا راستہ سمجھ سکتے ہیں ہم نہیں سمجھ سکتے۔ جس طرح آپ وطن، دین اور ملّت کی خدمت کی سبیل جانتے ہیں ہم نہیں جان سکتے۔ ہم اس وقت جو خواہش لے کر یہاں آئے ہیں وہ یہ ہے کہ جو کچھ ہماری ملکیت میں ہے وہ آپ کو پیش کر دیں تاکہ ہم اللہ کے حضور اپنی ذمّہ داری سے بری ہو سکیں۔ ہمیں کیا کرنا چاہیے اس کی ذمّہ داری آپ پر ہے۔ جو گروہ اخلاص کے ساتھ اللہ تعالےٰ کے ساتھ یہ عہد باندھتا ہو کہ وہ اس کے دین کے لیے زندہ رہے گا اور دین کی راہ میں مرے گا اور اُسے صرف اللہ کی رضا درکار ہوگی ——— ایسا گروہ اس امر کا مستحق ہے کہ وہ کامیاب وکامران ہو خواہ اس کی تعداد کم ہو اور اس کے وسائل ہیچ ہوں۔"

اس مخلصانہ صدا نے میرے دل پر گہرا اثر ڈالا۔ جو بوجھ مجھ پر لادا گیا اس سے فرار کی راہ اختیار نہ کر سکا۔ یہ وہی بوجھ ہے جس کی میں خود دعوت پیش کر رہا ہوں اور جس کے لیے میں تگ ودو کر رہا ہوں، اور جس کے گرد لوگوں کو جمع کرنے کے لیے کوشش کر رہا ہوں۔ میں نے تازہ انفعال کے جذبات میں ڈوبتے ہوئے انھیں کہا:

"اللہ تعالےٰ آپ کی مساعی کو قبول فرمائے اور ان نیک ارادوں میں برکت بخشے اور ہم سب کو عمل صالح کی توفیق ارزاں فرمائے۔ جس سے اس کی رضا بھی حاصل ہو اور خلق خدا کو بھی فائدہ پہنچے۔ ہمارا فرض محنت وکوشش ہے۔ کامیابی اللہ کے ذمّے ہے۔ آیئے ہم اللہ سے عہد کریں کہ ہم اسلام کی دعوت کے سپاہی بنیں گے۔ اسی دعوت کے

اندرِ وطن کی زندگی اور قوم کی سرخروئی ہے"۔

چنانچہ عہد و بیعت وقوع پذیر ہوئی۔ ہم نے یہ حلف اٹھایا کہ ہم باہم بھائی (اخوان) بن کر جیئں گے۔ اسلام کے لئے کام کریں گے، اور اسلام کی راہ میں جہاد ہمارا شعار ہوگا۔

ایک دوست نے اٹھ کر کہا: ہم اپنے آپ کو کس نام سے پکاریں؟ کیا ہم کوئی انجمن ہوں گے یا کلب؟ یا سلسلہ یا کوئی ایسوسی ایشن۔ تاکہ ہم کوئی رسمی حیثیت اختیار کر سکیں؟۔

میں نے کہا: ان میں ہم کچھ بھی نہ ہوں گے۔ منظاہر پرستی اور رسمیات سے ہم دُور رہی اچھے۔ ہمارے اس اجتماع و اتحاد کی بنیاد ہونی چاہیے: ایک مخصوص نظریہ و عقیدہ، مخصوص اخلاقی تصورات اور مخصوص منہاج کار۔ اسلام کی خدمت کے لیے ہم آپس میں رشتۂ اخوت سے وابستہ ہیں۔ لہذا ہم مسلمان بھائی ہیں اور ہمارا نام ہے:

"الاخوان المسلمون"

یہ نام یکایک زبانوں پر جاری ہوگیا۔ اور پھر یہ ضرب المثل بن گیا۔ یوں ان چھ افراد کے اتحاد سے اخوان المسلمون کی پہلی جماعت تشکیل ہوئی۔ مذکورہ مقاصد کی خاطر، اس سادہ سی تقریب میں، اور اس ناگہانی اور اتفاقی اصطلاح کے تحت۔

مدرسہ تہذیب و تربیت

پھر ہم نے یہ مشورہ کیا کہ ہم اجتماع کہاں منعقد کیا کریں۔ اور اجتماع کا پروگرام کیا ہوا کرے۔ آخر کار ہم اس بات پر متفق ہو گئے کہ ہم شیخ علی الشریف کے مکتب میں شارع فاروق پر ۶۰ قرش ماہانہ کا ایک درویشانہ کمرہ کرایہ پر لے لیں۔ اس میں ہم اپنی ضروری اشیا بھی رکھیں، اور اپنے خصوصی اجتماعات بھی منعقد کریں۔ اس شرط پر کہ ہمیں یہ حق ہوگا کہ جب طلبہ گھروں کو چلے جایا کریں تو ہم عصر سے لے کر رات تک مکتب کے سامان سے استفادہ کر سکیں۔ اس جگہ کا نام الاخوان المسلمون کا مدرسۃ التہذیب رکھا جائے گا۔ اس کا نصاب اسلامیات کی تعلیم ہوگا۔ جس میں بنیادی مضمون قرآن مجید کی صحیح قرأت ہوگا۔ اس مدرسے سے تعلق رکھنے والا یا

دوسرے لفظوں میں اس دعوت سے وابستگی رکھنے والا اخ احکام تجوید کے مطابق قرآن کریم کی تلاوت کرے گا۔ پھر چند آیات اور سورتوں کے زبانی حفظ کی کوشش ہوگی اوران آیات اور سورتوں کی مناسب و موزوں تفسیر بیان کی جائے گی۔ چند احادیث بھی حفظ کرائی جائیں گی اوران کی تشریح کی جاے گی۔ عقائد و عبادات کی تصحیح، اسلامی قوانین اور اسلام کے اجتماعی آداب کے فلسفہ و حکمت کی تشریح، اسلامی تاریخ، سیرت رسول اللہ اور سلف صالحین کی سیرت کی آسان انداز میں تدریس ہوگی۔ جس کا مقصد عملی اور روحانی پہلوؤں کو اُجاگر کرنا ہوگا۔ نیز باصلاحیت افراد کو خطابت و تبلیغ کی تربیت دی جاے گی۔ اوراس غرض کے لیے انھیں نظم ونثر کے ضروری حصوں کو زبانی یاد کرایا جائے گا۔ یہ تمام امور مدرسہ کے نصاب میں شامل ہوں گے۔

نیز عملی مشق کے طور پر اخوانِ مدرسہ کو پہلے اپنے ہی ماحول میں تدریس و تقریر کی تکلیف دی جائے گی۔ اور پھر آہستہ آہستہ انھیں وسیع تر ماحول میں اس خدمت پر مامور کیا جائے گا۔ اس مخصوص نصاب تعلیم کے گرد اخوان المسلمون کا پہلا گروپ مدرسۃ التہذیب سے وابستہ ہوا جو ۱۹۲۷ء ـــــــ ۱۹۲۸ء کے تعلیمی سال کے اختتام پر ستر افراد کے لگ بھگ کی تعداد کو پہنچ گیا۔

آثار تربیت

مگر ہمارے لیے یہ تعلیمی پروگرام ہی سب کچھ نہ تھا۔ بلکہ عملی تربیت کے اثرات جوان حضرات کے دلوں میں باہمی میل ملاپ، عملی تصرفات، متبادل محبت و مودّت، امورِ زندگی میں کلّی تعاون اور ہر کارِ خیر کے لیے ان کی قلبی آمادگی کے سبب پیدا ہو رہے تھے۔ اس جماعت کی تعمیر و ساخت میں سب سے مضبوط اور قوی عامل تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میں ایک مرتبہ اخ سعید ابوالسعود رحمہ اللہ کے ہاں گیا۔ موصوف بساطی کی دوکان کرتے تھے۔ اخ مصطفیٰ یوسف ان سے خوشبودار تیل کی ایک بوتل خریدتے ہیں۔ خریدار اس

کے دس قرش دینا چاہتا ہے۔ مگر فروخت کنندہ ۸ قرش سے زیادہ لینے سے انکار کردیتا ہے دونوں میں کوئی شخص اپنے موقف سے ہٹنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس منظر نے میرے دل پر بہت اثر ڈالا۔ میں نے معاملہ میں دخل دیا۔ اور قیمت خرید کا بل مانگا۔ چنانچہ اس میں میں نے دیکھا کہ اصل قیمت جس میں اخ سعید ابوالسعودؒ نے یہ تیل خریدا ہے وہ "فی درجن ۹۶ قرش" ہے۔ اور اسی قیمت پر وہ اپنے بھائی کے ہاتھ بیچنا چاہتا ہے۔ میں نے سعید ابوالسعود سے کہا کہ اگر آپ اپنے دوست سے کوئی نفع نہ لیں، اور آپ کا دشمن آپ سے کوئی چیز نہ خریدے تو بتائیے آپ کھائیں گے کہاں سے ؟"

وہ کہنے لگے:

میرے اور میرے بھائی کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ میری خوشی اسی میں ہے کہ وہ میری اس پیش کش کو قبول کرلے۔

میں نے اخ مصطفیٰ یوسف سے کہا: تم اپنے بھائی کی اس پیش کش کو قبول کیوں نہیں کرلیتے ؟۔

کہنے لگے: " اگر میں کسی اور دوکان دار سے یہی مال دس قرش میں خریدتا ہوں تو میرا بھائی اس قیمت کا زیادہ مستحق ہے۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ وہ اس سے بھی زیادہ قبول کرنے کے لیے تیار ہیں تو میں اور بھی اضافہ کردیتا۔"

بہرحال میں نے دخل دیا اور ۹ قرش پر معاملہ ختم ہوا۔

حقیقت یہ ہے کہ بات ایک قرش یا دو قرشوں کی نہیں ہے۔ بلکہ یہ اس نفسیاتی کیفیت کی بات ہے جو اگر انسانوں کے اندر عام ہوجائے۔ اور وہ اس کا احساس کرنے لگیں اور ان کے ذہن و قلب پر چھاجائے تو اس کی برکت سے انفرادی، اجتماعی، اور عالمی مشکلات حل ہوجائیں اور انسان امن و سعادت کی زندگی بسر کرنے لگیں۔

ان اخوان کے علم میں یہ بات آئی کہ ان کا ایک رفیق بے روزگار ہے۔ چنانچہ

ان میں سے دس سے زیادہ رفقاء اس کے پاس آئے۔ ہر ایک نے الگ الگ اس کے کان میں کچھ کہا اور اپنی جمع شدہ پونجی کا ایک حصہ پیش کیا تا کہ کچھ سرمایہ جمع ہو جائے اور ان کا بے روزگار بھائی اس سے کوئی کاروبار کر سکے۔ میں نے بعض کی پیش کش پر اکتفا کیا۔ اور باقی کو شکریہ کے ساتھ معذرت کر دی۔ چنانچہ وہ افسوس و اندوہ کے جذبات کے ساتھ واپس ہوئے، کیونکہ وہ امداد کے اجر و ثواب سے محروم ہو گئے تھے۔

جماعت کے اوّلین بانیوں کے کردار کی چند مثالیں

یہ اخوان تمام معاملات و تصرفات میں احکام اسلام کی پابندی اور اپنے تمام اقوال و افعال میں خواہ اپنے ساتھیوں سے متعلق ہوں یا دوسرے انسانوں سے، اسلامی اخلاق و احساسات کا مظاہرہ کرنے میں ایک عمدہ مثال اور پاکیزہ نمونہ بن چکے تھے۔

کینال کمپنی کے چیف انجنیئر اور سکیون ڈیپارٹمنٹ کے انچارج مسٹر سولنٹ نے اخ حافظ کو بلوایا اور ان سے اپنی رہائش گاہ پر نجاری کے بعض آلات کی مرمت کروانا چاہی۔ مسٹر سولنٹ نے ان سے مزدوری دریافت کی۔ اخ حافظ نے ۱۳۰ قرش مزدوری بتائی۔

مسٹر سولنٹ نے فوراً عربی میں کہا: "تم لٹیرے ہو"

اخ حافظ نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے بڑے اطمینان کے ساتھ اُسے کہا: "کیونکر"۔

مسٹر سولنٹ نے کہا: "اس لیے کہ تم اپنے حق سے زیادہ مانگ رہے ہو"۔

اخ حافظ نے کہا: "میں آپ سے کچھ نہیں لوں گا۔ آپ اپنے ماتحت انجنیئروں میں

سے دریافت کرلیں۔ اگر اس کی رائے ہو کہ میں نے مناسب مقدار سے زیادہ اُجرت طلب کی ہے تو میں بطورِ سزا یہ کام مُفت کردوں گا اور اگر اس کا خیال ہو کہ میرا مطالبہ صحیح ہے تو میں اس زیادتی پر آپ سے مسامحت سے کام لوں گا۔

مسٹر سولنٹ نے بالفعل ایک انجنیئر کو بلوایا اور اس سے اُجرت دریافت کی۔ اس نے اندازے سے کہا کہ یہ کام دو سو قرش میں ہوگا۔ چنانچہ مسٹر سولنٹ نے اخ حافظ سے کہا کہ :

" چلو کام شروع کردو "۔

حافظ نے کہا : " میں کام شروع کردوں گا۔ لیکن تم نے میری توہین کی ہے، لہٰذا تمہیں پہلے معذرت کرنا چاہیے اور اپنے الفاظ واپس لینے چاہئیں "۔

یہ فرانسیسی افسر غصّے سے لال پیلا ہوگیا۔ اور فرانسیسیوں کی مشہور گرمیٔ طبع اُس پر غالب آگئی۔ اور قرآنی آیت اخذته العزة بالاثم کا مصداق بن گیا، اور کہنے لگا : " تو چاہتا ہے کہ میں تجھ سے معذرت کروں۔ تو کون ہوتا ہے ؟ اگر خود شاہ فؤاد بھی آجائے تو میں اس سے معذرت نہ کروں "۔

حافظ نے بڑے دھیمے انداز میں اس سے کہا : " مسٹر سولنٹ، آپ یہ دوسری غلطی کر رہے ہیں، آپ شاہ فواد کے ملک میں ہیں اور آدابِ مہمانی اور احسان شناسی دونوں کا تقاضا ہے کہ آپ ایسی بات ہرگز منہ سے نہ نکالیں۔ میں ہرگز یہ اجازت نہ دوں گا کہ آپ اس طرح شاہ فؤاد کا ذکر کریں

مسٹر سولنٹ حافظ سے مُنہ پھیر کر وسیع ہال کے اندر چہل قدمی کرنے لگا، اس کے دونوں ہاتھ پتلون کی جیبوں میں تھے۔ حافظ نے اپنے آلات نیچے رکھ دیئے اور ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور ایک میز پر ٹیک لگالی۔ کچھ دیر تک فضا میں سکوت طاری رہا، صرف غضبناک، اور حیران و ششدر مسٹر سولنٹ کے پاؤں کی آہٹ سُنائی دیتی ؛

تھوڑی دیر کے بعد مسٹر سولنٹ حافظ کی جانب بڑھا اور کہنے لگا : " فرض کرو،

میں تم سے معذرت نہیں کرتا، تم میرا کیا کر لو گے؟"۔

حافظ نے کہا: "معاملہ آسان ہے پہلے تمہارے قنصل اور تمہارے سفیر کے نام ایک رپورٹ لکھوں گا، پھر پیرس میں سویز کمپنی کی اعلیٰ انتظامی کونسل کے دفتر کو اس سے مطلع کروں گا۔ پھر فرانس کے مقامی اخبارات اور دوسرے غیر ملکی اخبارات کو اس سلسلے میں خطوط لکھوں گا۔ اور پھر انتظامی کونسل کا جو رکن بھی یہاں آئے گا اس کی جستجو کروں گا اور اس تک یہ شکایت پہنچاؤں گا اور اگر بایں ہمہ مجھے اپنا حق وصول نہ ہوا تو پھر میرا آخری حربہ یہ ہو سکتا ہے کہ سڑک کے بیچوں بیچ علیٰ رؤوس الاشہاد آپ کی توہین کر ڈالوں۔ اور شاید اس طرح میں وہ مقصد حاصل کر لوں جس کا میں نے مصمّم ارادہ کر رکھا ہے۔ آپ یہ خیال مت کریں کہ میں مصری حکومت سے آپ کی شکایت کروں گا جسے تم لوگوں نے غیر ملکی اور ظالمانہ ٹھیکوں کی زنجیروں میں کس رکھا ہے۔ مجھے اس وقت تک ہرگز چین نہ آئے گا جب تک میں کسی نہ کسی ذریعہ سے اپنا وقار بحال نہ کر لوں۔"

مسٹر سولنٹ کہنے لگا: "یوں معلوم ہوتا ہے کہ میں کسی نجار سے نہیں بلکہ افسرِ اعلیٰ سے ہم کلام ہوں۔ کیا تمہیں یہ خبر نہیں ہے کہ میں سویز کمپنی کا چیف انجنیئر ہوں؟ لہٰذا تم یہ کیسے تصوّر کر سکتے ہو کہ میں تم سے معافی مانگوں گا؟"

حافظ نے جواب دیا: "اور کیا آپ کو یہ خبر نہیں ہے کہ سوئز کمپنی میرے وطن کے اندر ہے نہ کہ آپ کے وطن کے اندر، اور یہ کہ سوئز کمپنی پر تمہارا قبضہ عارضی ہے اور آخر کار یہ ختم ہو جائے گا اور پھر اس کی ملکیت ہماری طرف لوٹ آئے گی۔ پھر آپ اور آپ جیسے دوسرے لوگ ہمارے ملازم ہوں گے۔ لہٰذا آپ یہ کیسے تصوّر کر سکتے ہیں کہ میں اپنے حق سے دست بردار ہو جاؤں گا؟"

اس گفتگو کے بعد مسٹر سولنٹ نے دوبارہ چہل قدمی شروع کر دی۔ کچھ مدت کے بعد پھر وہ حافظ کی طرف لوٹ آیا۔ اس وقت اس کا چہرہ عرق انفعال کے قطروں سے لبریز

تھا۔ اس نے نہایت قوّت کے ساتھ کئی مرتبہ اپنا ہاتھ میز پر مارا۔ اور کہنے لگا:

" حافظ! میں تجھ سے معذرت چاہتا ہوں، اور اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔"

چنانچہ اخ حافظ سکون و اطمینان کے ساتھ کھڑا ہو گیا اور مسٹر سولنٹ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنا کام شروع کر دیا اور اسے تھوڑے ہی وقت میں پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔

کام مکمل ہو جانے کے بعد مسٹر سولنٹ نے اخ حافظ کو ۱۵۰ قرش پیش کیے۔ حافظ نے ان میں سے ۱۳۰ لے لیے اور باقی ۲۰ قرش واپس لوٹا دیئے۔ مسٹر سولنٹ نے ان سے کہا کہ یہ ۲۰ بھی آپ لے لیں۔ یہ آپ کی "بخشش" ہے۔

حافظ نے فوراً کہا: " ہرگز نہیں، ہرگز نہیں۔ میں اپنے حق سے زیادہ لے کر "لٹیرا" نہیں بننا چاہتا۔

مسٹر سولنٹ یہ جواب سن کر ششدر رہ گیا۔ اور کہنے لگا: " مجھے حیرت ہے کہ تمام عرب کاریگر آپ جیسے کیوں نہ ہو پائے ہ کیا تم "محمڈن فیملی" ہو ؟"

حافظ نے کہا: " مسٹر سولنٹ، ہر مسلمان محمڈن فیملی ہے۔ مگر وجہ یہ ہے کہ ان میں بہت سے لوگوں نے " صاحب لوگوں" کے ساتھ اپنی معاشرت وابستہ کر رکھی ہے۔ اور وہ ان کی نقالی کرنے لگے ہیں۔ اور اس طرح ان کے اخلاق و عادات خراب ہو گئے ہیں۔"

مسٹر سولنٹ نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا اور کہنے لگا: " متشکّر، متشکّر، کثر خیرک (شکریہ، شکریہ، تمہارا بھلا ہو)۔ یہ جواب رخصت ہو جانے کی اجازت تھا۔

اخ حسن مرسی ایک صاحب بہادر مانیو کے پاس کام کرتے تھے۔ اور ریڈیو کے بکسوں کے نہایت اعلیٰ نمونے تیار کرتے تھے۔ ان دنوں ریڈیو کا ایک بکس تقریباً ایک پونڈ میں تیار ہوتا تھا۔ مانیو کا ایک ہم وطن دوست مانیو کے پاس آیا اور چپکے سے اخ حسن سے یہ سودا بازی کرنا چاہی کہ اخ حسن اس کے لیے چند بکس آدھی قیمت پر تیار کر دے۔ اس شرط پر کہ

مانیو کو ان بکسوں کی تیاری کی قطعًا اطلاع نہ دی جائے۔ یوں یہ نصف پونڈ فی بکس اخ حسن کی جیب میں رہ جائے گا۔ اور بابو صاحب کو یہ فائدہ ہوگا کہ اسے آدھی قیمت پر یہ بکس مل جائیں گے۔ مانیو اخ حسن پر غیر معمولی اعتماد رکھتا تھا۔ اس نے اپنی ورکشاپ کا تمام خام مال اور آلات اخ حسن کے سپرد کر رکھے تھے۔ مانیو کے اس دوست نے اسی اعتماد سے ناجائز فائدہ اُٹھانا چاہا۔ لیکن اخ حسن نے اسے اس سودے بازی کے جواب میں نہایت تند و تیز اخلاقی درس دے دیا۔ اُسے کہا :

"اسلام، بلکہ دنیا کا ہر مذہب، سرے سے خیانت کو حرام ٹھیراتا ہے۔ کجا اس شخص کے ساتھ میں ارتکاب خیانت کروں جس نے میری ذات پر غیر معمولی اعتماد کر رکھا ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ آپ اس کے دوست اس کے ہم قوم اور ہم مذہب ہو کر بھی اس کے حق میں ایسی خیانت کی سوچتے ہو۔ اور پھر مجھے بھی اس کے ارتکاب پر اُکسا رہے ہو۔ بابو صاحب اس غلط خیال پر آپ کو شرم آنی چاہیے اور آپ یقین رکھیں کہ میں آپ کی اس حرکت سے مانیو صاحب کو ہرگز مطلع نہ کروں گا تاکہ آپ دونوں کی دوستی کو خراب کر دینے کا موجب نہ بنوں۔ مگر اس شرط پر کہ آپ مجھ سے یہ سچا عہد کریں کہ آپ آئندہ ایسی حرکت نہیں کریں گے۔"

یہ بابو بھی کوڑھ مغز تھا۔ کہنے لگا کہ : "میں خود مانیو کو یہ کہوں گا کہ آپ کے کاریگر نے مجھے ایسی پیش کش کی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مانیو میری تصدیق کرے گا اور میری بات پر کلی اعتماد کرے گا۔ اور نتیجتہً تمہیں اس ورکشاپ سے بیک بینی و دوگوش نکال باہر کرے گا۔ اور یہ عزت احترام جو تو نے اس کے دل میں حاصل کر رکھا ہے سب ختم ہو جائے گا۔ لہٰذا تمہارے لیے بھلا اسی میں ہے کہ میری بات کو قبول کر لو اور جو میں چاہتا ہوں اُسے کر ڈالو۔"

اخ حسن کو طیش آگیا۔ اس نے کہا : "تو جو چاہتا ہے کرلے انشاءاللہ تو روسیاہ

ہو کر رہے گا۔"

اس شخص نے فی الواقع مانیو سے وہی کہہ دیا جس کی اس نے اخ حسن کو دھمکی دی تھی۔ مانیو نے معاملے کی تحقیق شروع کر دی۔ چنانچہ حق پرستی کی روشنی نے باطل کی تاریکیوں کو کافور کر دیا۔ اخ حسن نے مانیو کو حقیقتِ حال سے پوری طرح آگاہ کر دیا۔ مانیو نے اخ حسن کے بیان پر کسی قسم کا کوئی شبہ نہ کیا۔ اور آخر کار اپنے خائن دوست کو دھکے دے کر گھر سے نکال دیا۔ اور اس سے تعلقات منقطع کر لیے۔ اور امانت داری کے صلے میں اخ حسن کی تنخواہ میں اضافہ کر دیا۔

عبدالعزیز غلام نبی بھی ہمارے ایک رفیق تھے۔ یہ اصلاً ہندوستان کے تھے۔ اور انگریزی چھاؤنی میں درزی کا کام کرتے تھے۔ ایک بڑے افسر کی بیوی نے بعض کاموں کے لیے انھیں اپنے بنگلے پر بلایا اور خلوت میں انہیں طرح طرح کے ہتھکنڈوں سے بدکاری پر ورغلانے لگی۔ مگر وہ اسے پہلے وعظ و نصیحت سے سمجھاتے رہے اور پھر اسے زجر و توبیخ بھی کرنے لگے۔ مگر میم صاحب کبھی عبدالعزیز کو یہ دھمکی دیتی، کہ اگر تم نہ مانے تو میں صاحب سے الٹی تمہاری دراز دستی کی شکایت کروں گی۔ اور کبھی اس کی طرف پستول کا رُخ کر دیتی۔ مگر عبدالعزیز اپنے مؤقف سے سرِمو نہ سرکا۔ اور اسے کہنے لگا:

" میں اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں (انی اخاف اللہ رب العالمین)"

دونوں کے نزاع نے ایک دلچسپ بلکہ کسی حد تک مضحکہ خیز منظر پیدا کر دیا۔ ایک طرف یہ ناہنجار عورت بڑے اعتماد و وثوق کے ساتھ عبدالعزیز کو اس وہم میں ڈالتی ہے کہ اس نے عبدالعزیز کے قتل کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اور اس کا جواز یہ تراشا ہے کہ عبدالعزیز نے اس پر حملہ کیا ہے۔ اور بُری نیت کے ساتھ اس سے دست درازی کی ہے۔ وہ عورت بالفعل عبدالعزیز کو نشانہ بنا کر پستول تان لیتی ہے۔ اور عبدالعزیز بھی اس یقین کے ساتھ کہ اب اس کی زندگی کا خاتمہ ہوا چاہتا ہے آنکھیں موند لیتا ہے اور چیخ چیخ کر " لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" پڑھنا

شروع کر دیتا ہے ۔ اس کی چیخوں سے عورت کا دل دہل جاتا ہے ۔ اور پستول اس کے ہاتھ سے نیچے گر جاتا ہے ۔ اور اس کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ جاتے ہیں ۔ اور وہ بوکھلا کر اپنے دونوں ہاتھوں سے عبدالعزیز کو باہر دھکیل دیتی ہے ۔ عبدالعزیز بنگلے سے باہر نکلتے ہی سیدھا دارالاخوان المسلمون کی طرف دوڑ کر آ جاتا ہے اور اپنا تمام ماجرا آ کر بیان کرتا ہے ۔

اس رنگ ڈھنگ کے تھے دورِ اوّل کے اخوان ، اخلاقی پاکیزگی اور روحانی بلندی کے بارے میں ان کے بے شمار واقعات پیش کیے جا سکتے ہیں ۔ اسی اخلاص و للّٰہیت کی بدولت اللہ تعالیٰ نے اس دعوت کے اندر جس نے ایسے منور قلوب اور مصفّا نفوس پیدا کر دیئے بڑی برکت و تاثیر بھر دی ۔ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد برحق ہے کہ :

مثل کلمة طیبة کشجرة طیبة أصلها ثابت، وفرعها فی السماء تؤتی اکلها کل حین باذن ربها ۔ ویضرب الله الامثال للناس لعلهم یتذکرون ۔

” پاکیزہ کلمے کی مثال پاکیزہ درخت کی ہے ۔ جس کی جڑ گہری اور پائیدار ۔ ہے اور جس کی شاخیں آسمان کی پہنائیوں میں ہیں ۔ وہ اپنے رب کے حکم سے ہر وقت اپنا پھل دیتا رہتا ہے اللہ انسانوں کے لیے ایسی مثالیں بیان کرتا ہے تاکہ وہ نصیحت اخذ کریں ۔ “

چھٹیوں کا زمانہ آ گیا ۔ یہ زمانہ میں نے کچھ قاہرہ میں اور کچھ محمودیہ میں بسر کیا ۔ اسی زمانے کی بات ہے کہ محمودیہ کی جمعیتِ حصافیہ نے نظم اور اغراض و مقاصد کے لحاظ سے بالکل اُسی طرح کی نئی صورت اختیار کر لی جو اسماعیلیہ کے اندر دعوت اختیار کر چکی تھی ۔ یعنی ” الاخوان المسلمون “ کے طرز کی تشکیل و تنظیم ۔ چھٹیاں گزر جانے کے بعد میں اسماعیلیہ لوٹ آیا ۔ میرا دوسرا تعلیمی سال بے شمار لطائف و نکات اور شخصی اور دعوتی واقعات سے پُر رہے ۔

حجاز جانے کا پروگرام

پورے عرصے میں جمعیت الشبان المسلمین کے ساتھ میرے روابط برابر قائم رہے۔ میں بھی اپنی طرف سے جمعیت کو بکثرت رپورٹیں اور تبصرے اور جائزے بھیجتا رہتا تھا۔ اور جمعیت کے ذمہ دار حضرات بھی اس روحانی رشتے کا پورا پورا احساس رکھتے تھے۔ جو قاہرہ سے دوری کے باوجود ہمیں ایک دوسرے سے باہم پیوست کیے ہوئے تھا۔ ملک عبدالعزیز ابن سعود کے مشیر شیخ حافظ وہبہ قاہرہ تشریف لائے اور انھوں نے وزارتِ تعلیم کی طرف سے کچھ مدرسین حجاز لے جانا چاہے جو حجاز کے نئے نئے قائم ہونے والے مدارس میں تعلیم کے فرائض انجام دیں۔ مصری حکومت نے ابھی تک سعودی حکومت کو تسلیم نہیں کیا تھا[۱]۔ یہ انگریز کی سیاست تھی جو ہمیشہ دو بھائیوں کے اندر تفریق کے اصولوں پر قائم ہوتی تھی۔ مصری قوم اس غیر طبعی صورت حال کے خلاف تھی۔ تعلیم یافتہ طبقہ حجاز کی نشاۃِ ثانیہ کے اندر اپنی امنگوں کی چمک اور اپنی خواہشات کی تعبیر دیکھ رہا تھا۔ حافظ وہبہ نے جمعیت الشبان المسلمین کے ساتھ رابطہ قائم کیا اور مدرسین کے انتخاب میں جمعیت سے مدد طلب کی۔ چنانچہ سید محب الدین الخطیب مجھ سے ملے اور اس موضوع پر مجھ سے گفتگو کی میں نے اصولی طور پر ان کی رائے سے اتفاق کا اظہار کیا۔ اس کے بعد جمعیت الشبان المسلمین کے سکریٹری استاذ محمود علی فضلی نے ۱۳ر اکتوبر ۱۹۲۸ء کو مجھے لکھا:

"عزیزم البنّا صاحب، سلام و تحیات پیش کرتا ہوں۔

مجھے امید ہے آپ بعافیت ہوں گے۔ استاذ محب الدین الخطیب آپ

---

[۱] سلطان عبدالعزیز نے حجاز پر شریفِ مکّہ کی حکومت ختم کر کے حجاز کو اپنی قلم رو میں شامل کر لیا تھا۔ مصری حکومت نے عبدالعزیز ابن سعود سے اختلاف کی وجہ سے ایک عرصہ تک اس کے قبضۂ حجاز کو تسلیم نہیں کیا تھا۔

سے حجاز میں تدریس کے لیے گفتگو کر چکے ہیں۔ عبدالحمید بک سعید نے ہمیں یہ پیغام بھیجا ہے کہ ہم آپ کو مطلع کریں کہ آپ وزیر تعلیم کے نام مدرسہ کی وساطت سے ایک درخواست لکھیں جس میں اس خواہش کا اظہار کریں کہ آپ مکّہ معظمہ کے مدرسہ المعہد السعودی میں جانا چاہتے ہیں۔ اس شرط پر کہ وزارت تعلیم مصر کے اندر ان کے حقوق ملازمت محفوظ رکھے۔ اور واپس آنے پر وہ تمام الاؤنس دیئے جائیں جو آپ کے باقی ہم پیشہ ساتھیوں کو دیئے جائیں گے۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس مضمون کی درخواست جلد از جلد ارسال فرمادیں گے تاکہ اُسے کونسل آف وزراء کے اجلاس میں پیش کیا جا سکے۔ وختاما تقبلوا فائق تحیاتی۔"

اس کے بعد مجھے ایک اور چٹھی ۶ر نومبر ۱۹۲۸ء کو ملی جس میں جمعیت الشبان المسلمین کے نگرانِ اعلیٰ ڈاکٹر یحییٰ الدردیری نے ابتدائی کلمات کے بعد لکھا:

"ہمیں امید ہے کہ آپ براہِ کرم آئندہ جمعرات کو سات بجے شام اخبار کے دفتر میں تشریف لائیں گے اور فضیلت مآب حافظ وہبہ مشیر شاہ ابن سعود سے ملاقات کریں گے تاکہ ان کے ساتھ سفر کا پروگرام طے کرلیں اور مکّہ کے المعہد السعودی میں تدریس کے لیے ملازمت کی شرائط طے کرلیں۔ ہم آپ کی تشریف آوری کا انتظار کریں گے۔ تفضلوا بقبول وافر تحیاتی واسمی اعتباراتی۔

مقررہ وقت پر ہماری ملاقات ہوگئی۔ اہم ترین شرط جو میں نے حافظ وہبہ کے سامنے رکھی یہ تھی کہ مجھے ملازم نہ سمجھا جائے جس کا کام ہدایات وصول کرنا اور انھیں نافذ کرنا ہو۔ بلکہ خاص نظریئے کا علمبردار سمجھا جائے جو یہ کوشش کرے گا کہ اس کا نظریہ ایک ایسی نوخیز مملکت کے اندر خوشگوار فضا سے ہمکنار ہو جو اسلام اور مسلمانوں کی ایک امیدگاہ ہے۔

جس کا شعار کتاب اللہ اور سنّت رسولؐ کی اتباع اور سلف صالحین کے رویئے کی جستجو ہے۔ رہے دوسرے امور مثلاً معاوضہ کیا ہوگا اور مادّی ترجیحات اور سہولتیں کیا حاصل ہوں گی۔ اس موضوع کو ہم نے سرے سے چھیڑا ہی نہیں۔ حافظ وہبہ نے میرے اس جذبہ پر اپنی مسرت کا اظہار کیا اور مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ مصر کے وزیر خارجہ سے ملیں گے اور ان سے اس بارے میں کوئی سمجھوتہ کر کے مجھے مطلع کریں گے۔ میں اس کے بعد اسماعیلیہ لوٹ آیا۔ حافظ وہبہ نے ۱۲ر نومبر ۱۹۲۸ء کو مجھے لکھا:

عزیزم استاذ حسن البنّا۔ تحیّات و احترام قبول ہو۔ میں آج ہز ایکسلنسی وزیر خارجہ سے ملا ہوں۔ آپ کے مسئلہ میں مَیں نے اُن سے گفتگو کی ہے۔ انھوں نے مجھے بتایا ہے کہ وہ پسند کریں گے کہ آپ ان سے ملاقات کرلیں تاکہ وہ آپ کو وزیر تعلیم کے نام ایک چٹھی دے دیں۔ وزیر تعلیم آپ سے اور ان دوسرے ملازمین سے جو حجاز جانا چاہتے ہیں پورا پورا تعاون کرنے کے لیے تیار ہیں۔ وتقبلو فائق احترامی۔"

میں اسماعیلیہ سے قاہرہ آیا اور حافظ وہبہ کی معیت میں وزیر خارجہ سے ملا۔ وزیر خارجہ نے وزیر تعلیم سے جو ان دنوں غالباً احمد پاشا لطفی تھے رابطہ قائم کیا مگر وہ موجود نہ تھے۔ میں اسماعیلیہ واپس آگیا۔ حافظ وہبہ نے برابر اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ لیکن انھیں کامیابی نہیں ہوئی۔ یہی رکاوٹ اس راستے میں حائل رہی کہ مصری حکومت نے ابھی حکومتِ حجاز کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ میں نے حافظ وہبہ کو ایک خط لکھا جس میں ان سے یہ دریافت کیا کہ ان کی کوشش کہاں تک پہنچی ہے۔

انھوں نے جواب دیا: "السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ اعلیٰ ترین جذبات، احترام و تکریم پیش کرنے کے بعد گزارش ہے کہ آپ کا گرامی نامہ مسرت افزا ہوا۔ مجھے شدید افسوس ہے کہ وزیر تعلیم نے ہماری درخواست کو مسترد کر دیا ہے۔ حالانکہ وزیرِ خارجہ اور خود وزیر تعلیم جناب عبد الحمید بک سعید کو درخواست قبول کر لینے کی یقین دہانی کرا چکے تھے۔

بہر حال میں اپنی مساعی جاری رکھوں گا۔ اللہ تعالےٰ ہم سب کو اپنی رضا جوئی کی توفیق دے۔
آپ نے میرے بارے میں جن پاکیزہ احساسات اور کریمانہ جذبات کا اظہار کیا ان کا میں تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ وتقبل فائق احترامی۔

قدرتاً حافظ وہبہ[۵۱] کی یہ مساعی بے نتیجہ رہیں۔ میں اسماعیلیہ ہی کے اندر رہا۔ اور اس مشن کے لیے میرے ایک محترم رفیق استاذ ابراہیم شوریٰ[۵۲] کی خدمات حاصل کی گئیں۔ انھوں نے یہ مشن بوجوہ احسن سرانجام دیا۔ اس دلچسپ جائزے سے ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ پہلے ہم کیا تھے اور اب ہم میں کیا تبدیلی آچکی ہے۔ کیونکہ اب حکومت مصر فراخدلانہ طور پر تمام دنیائے عرب و اسلام کے اندر اپنے وفود اور مدرسین بھیج رہی ہے اور ان ممالک کے ساتھ ہمارا ثقافتی تعاون اطمینان بخش حد تک ترقی پذیر ہے۔ والحمد للہ۔

وعظ و تبلیغ کا منصوبہ

دعوتِ اسلامی کے فروغ و ترقی کا ایک مظہر یہ بھی تھا کہ خود ازہر شریف نے شیخ الازہر استاذ المراغی[۵۳] رحمہ اللہ کے پہلے دورِ مشیخت میں بعض غیور اصحاب کی مساعی کی بدولت عوام کے

---

۵۱ حافظ وہبہ سعودی عرب کے نہایت زیرک سیاست داں تھے۔ پہلے یہ سلطان عبد العزیز ابن سعود کے مشیر رہے۔ اور پھر انگلستان میں سعودی عرب کے سفیر مقرر ہوئے۔ سعودی عرب کی جدید تاریخ پر انھوں نے ایک بے نظیر کتاب تالیف کی ہے۔ جس کا نام ہے "جزیرۃ العرب فی القرن العشرین" خاکسار ۱۹۶۷ء میں ریاض میں امیر عبد اللہ بن عبد الرحمان کے قصر میں ان سے مل چکا ہے۔ اب ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ (مترجم)

۵۲ ابراہیم شوریٰ اس وقت رابطہ عالمِ اسلامی مکہ مکرمہ میں شعبۂ ثقافت اسلامیہ سے وابستہ ہیں عرصۂ دراز سے سعودی عرب میں مقیم ہیں۔ رابطہ کے ماہانہ آرگن کے چیف ایڈیٹر بھی رہ چکے ہیں۔ صاحب علم و فضل ہیں۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اندر دینی تعلیمات اور دینی ثقافت کی اشاعت کا منصوبہ بنایا۔ چنانچہ ازہر کے اندر شعبۂ وعظ و تبلیغ قائم کیا گیا۔ جس کی سربراہی اور انتظام ایک غیور عالم شیخ عبد ربہٖ مفتاح رحمہ اللہ کو سونپا گیا۔ یہ چیز خود ہماری قدیم آرزوؤں کی آئینہ دار تھی۔ اس زمانے میں میرا اپنے نوجوان رفقائے دعوت کے ساتھ اور ازہر کے ذمہ دار علماء کے ساتھ تبادلۂ خیال ہوتا رہتا تھا۔ دعوت و تبلیغ کا فرض سرانجام دینے کے لیے شروع شروع میں جن لوگوں کے نام قرعۂ فال نکلا ان میں اخ عزیز شیخ حامد عسکریہ رحمہ اللہ بھی تھے۔ یہ اللہ کی توفیق خاص اور حکمتِ بالغہ تھی کہ ان کی تعیناتی اسماعیلیہ میں ہوگئی۔ اسماعیلیہ میں ہم میدانِ دعوت میں یکجا ہوگئے۔ دعوت کے سلسلے میں موصوف رحمہ اللہ ہمارے لیے بہترین مددگار ثابت ہوئے۔

اسماعیلیہ میں اخوان کا مرکز اور مسجد

اخوان کے ایک خصوصی اجتماع میں یہ بحث چھڑ گئی کہ اسماعیلیہ کے اصل باشندوں کے اندر اپنی دعوت کو خصوصی طور پر زیادہ سے زیادہ فروغ دینا نہایت ضروری ہے۔ اس وجہ سے بھی یہ ضروری ہے کہ یہاں جو اصحاب کارِ دعوت سرانجام دے رہے ہیں وہ سرکاری ملازم ہیں اور وہ ہمیشہ ادھر اُدھر تبدیلیوں کا نشانہ بنتے رہتے ہیں۔

چنانچہ ایک صاحب نے جماعت کا اپنا ایک مرکز تعمیر کرنے کی تجویز پیش کی۔ دوسرے صاحب نے اس میں یہ ترمیم پیش کی کہ مرکز کے ساتھ ایک مسجد بھی ہونی چاہیے۔ ایک اس لیے کہ شہر کے اندر مسجدوں کی قلت ہے اور دوسرے اس لیے کہ اس طرح عمارتِ مرکز کی تعمیر میں عامۃ المسلمین بھی ہماری مدد کریں گے۔ اس اجتماع میں حاضرین کی تعداد

(بقیہ صہ گذشتہ) جناب احمد مصطفےٰ المراغی مرحوم ازہر کے شیخ رہ چکے ہیں۔ عصر حاضر کے نہایت وسیع النظر علماء میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ "تفسیر المراغی" کے نام سے انھوں نے قرآن کریم کی ایک تفسیر تحریر کی ہے جو زبان بیان کے لحاظ سے دورِ حاضر کی مقبول ترین تفسیروں میں سے ہے۔ وفات ۱۹۳۸ء

بیس سے زیادہ نہ تھی۔ سب لوگ اس تجویز کے حق میں جوش وخروش کا اظہار کر رہے تھے۔ میں چپ چاپ ان کی باتیں سُنتا رہا۔ پھر مجھ سے پوچھنے لگے کہ اس بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟۔

میں نے عرض کیا: جہاں تک نظریئے اور اصول کا تعلق ہے تو یہ تجویز بہت خوب ہے۔ لیکن اسے روبعمل لانے کے لیے چند شرائط کی ضرورت ہے۔ پہلی یہ ہے کہ اس کام کی نیت خالصتہً اللہ تعالےٰ کے لیے ہو۔ اور دوسری یہ ہے کہ نفس کو مشقت اور صبر وعزیمت برداشت کرنے پر آمادہ کیا جائے۔ پھر اس بات کو پردۂ اخفا میں رکھا جائے اور اس کے لیے خاموشی سے لگاتار محنت کی جائے۔ بذل وسخاوت کی ابتدا ہم اپنی ذات سے کریں۔ اگر آپ لوگوں کا یہ جذبہ صادق ہے تو اس کی علامت یہ ہے کہ آپ لوگ خود اپنے اندر پہلے پچاس پونڈ بطور عطیہ جمع کریں۔ یہ رقم اسی اجلاس میں باہم تقسیم کرلیں۔ اور پھر ہر شخص اپنے حصّے کی رقم ایک ہفتے کے اندر اندر افندی ابوالسعود کے ہاں جمع کرادیں۔ اور آپ حضرات اس اسکیم کا کسی شخص سے ذکر نہ کریں۔ اور کسی محفل خاص یا محفل عام میں اس کا چرچا زبان پر نہ لائیں۔ آئندہ ہفتے ہم اسی رات کو دوبارہ جمع ہوں گے۔ اگر آپ لوگوں نے اپنا فنڈ مکمل کرلیا اور کتمان سے بھی کام لیا تو یقین رکھیں کہ آپ کی اسکیم بمشیئت الٰہی پایۂ تکمیل تک پہنچ کر رہے گی۔

چنانچہ مقررہ رات کو ہم دوبارہ اکٹھے ہوئے اور ہم نے افندی ابوالسعود کو پورے پچاس پونڈ جمع کرادیئے۔ یہ آغاز ایک نیک فال تھا اور سنجیدہ سعی وجہد کا غماز تھا۔

قربانی کی ایک مثال

میں نے دیکھا کہ اخ اسطی علی ابوالعلاء ہمارے شبینہ اجتماع میں مقررہ وقت سے نصف گھنٹہ دیر سے پہنچتا ہے۔ میں نے ان سے اس مسلسل تاخیر کی وجہ دریافت کی۔ انھوں نے بعض عذرات پیش کیے جو اس تاخیر کا جواز نہیں بن سکتے تھے۔ چھان کرید کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ انھوں نے فنڈ میں ڈیڑھ سو قرش دینے کا وعدہ کیا ہے۔ چونکہ ان کے پاس یہ رقم نہ

تھی ۔ اس لئے انھیں مجبوراً اپنی سائیکل فروخت کرنا پڑی ہے ۔ اب وہ اپنے دفتر سے ۶ نمبر بس کے ذریعہ آتے ہیں جو شہر سے ۶ کلو میٹر دور انھیں چھوڑ دیتی ہے ۔ اور وہ وہاں سے یہ مسافت پیدل طے کرتے ہیں ۔ سائیکل کی قیمت انھوں نے دارالاخوان کے تعمیر فنڈ میں جمع کرادی ہے ۔ اخوان کے دلوں پر اپنے بھائی کے اس اقدام کا بہت اثر ہوا ۔ چنانچہ انھوں نے ایک نئی سائیکل خریدنے کے لیے چندہ جمع کیا ۔ اور یہ نئی سائیکل انھیں ان کی مخلصانہ قربانی اور پاکیزہ جذبہ کی قدر دانی کے طور پر ہدیۃً پیش کردی گئی ۔

مسجد کے لیے قطعۂ زمین کا عطیہ

اب ہم نے چاہا کہ عامۃ النّاس کو حقیقتِ حال سے روشناس کرادیں اور انھیں پرکھیں ۔ چنانچہ ہم نے ایک ایسے قطعۂ اراضی کی تلاش شروع کردی جسے ہم دام دے کر خریدلیں یا اس کا مالک اس کارِ خیر کے لیے بطور عطیہ پیش کردے ۔ تلاش کے دوران ہمیں معلوم ہوا کہ جناب حاجی عبدالکریم ــــــ اللہ ان پر رحمتیں نازل فرمائے ــــــ کے پاس ایسا ایک ٹکڑا موجود ہے جو ہمارے مقصد کے لیے نہایت مناسب و موزوں ہے ۔ حاجی صاحب مرحوم بڑے نیک اور مخیّر انسان تھے ۔ ہمیں یہ اطلاع بھی ملی کہ وہ خود اس ٹکڑے پر ایک مسجد تعمیر کرنے کی خواہش رکھتے ہیں ۔ ہم نے اس سلسلے میں ان سے بات چیت کی ۔ وہ بڑے مسرور ہوئے اور انھوں نے ہماری خواہش منظور کرلی ۔ اور ان کے ساتھ ہم نے ابتدائی معاہدہ تحریر کرلیا جس کی رو سے وہ اس ٹکڑے سے دست بردار ہو گئے ــــــ ہم نے اس مہم کو اپنی پہلی کامیابی گردانا ۔

کانٹے اور روڑے

دعوتِ حق کو ہر دور اور ہر ملک کے اندر ایسے مخالفین اور معاندین سے سابقہ پیش آتا ہے جو اس کے راستے میں رکاوٹیں ڈالتے رہتے ہیں ۔ اور اس کی ناکامی کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے رہے ہیں ۔ لیکن آخر کار کامیابی حق کے قدم چومتی ہے ۔ یہ اللہ تعا

کی سنّت ہے۔

اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے کہ:

ولن تجد لسنّۃ اللّٰہ تبدیلا۔ (الفتح آیت ۲۳)

"تم اللہ کی سنّت میں کوئی تبدیلی نہ پاؤگے۔"

ولن تجد لسنّۃ اللّٰہ تحویلا۔ (فاطر آیت ۴۳)

"تم اللہ کی سنّت میں کوئی تغیر نہ پاؤگے۔"

وکذٰلک جعلنا لکل نبی عدوا من المجرمین وکفیٰ بربك هادیا ونصیرا۔ (الفرقان ۳۱)

"ہم نے اسی طرح مجرموں کو ہر نبی کا دشمن بنایا ہے اور تمہارے لیے تمہارا رب ہی رہنمائی اور مدد کو کافی ہے۔"

وکذٰلک جعلنا لکل نبی عدوا شیاطین الانس والجن یوحی بعضهم الیٰ بعض زخرف القول غرورا۔ ولوشاء ربك مافعلوهم فذرهم ومایفترون۔ (الانعام ۱۱۲)

"اور اسی طرح ہم نے شیطان انسانوں اور شیطان جنوں کو ہر نبی کا دشمن بنایا ہے جو ایک دوسرے پر خوش آئند باتیں دھوکے اور فریب سے القاء کرتے ہیں۔ اگر تمہارا رب چاہتا کہ وہ ایسا نہ کریں تو وہ ہرگز ایسا نہ کرتے۔ انھیں ان کے حال پر چھوڑدو کہ اپنی افتراء پردازیاں کرتے رہیں۔"

وما ارسلنا من قبلك من رسول ولا نبی الا اذا تمنی القی الشیطٰن فی امنیّته فینسخ اللّٰه مایلقی الشّیطٰن ثم یحکم اللّٰه اٰیاته واللّٰه علیم حکیم۔ (الحج ۵۲)

"اے محمدؐ ہم نے تم سے پہلے جو رسول اور نبی بھی بھیجا ہے اس کے ساتھ

یہ ضرور ہوا ہے کہ جب اس نے تمنّا کی تو شیطان اس کی تمنّا میں خلل انداز ہو گیا اس طرح شیطان جو کچھ بھی خلل اندازی کرتا ہے اللہ اسے مٹا دیتا ہے اور آیات کو پختہ کر دیتا ہے۔ اللہ علیم اور حکیم ہے۔

اسماعیلیہ کے اندر بھی دعوتِ اسلامی کا نصیبہ ایسا ہی رہا۔ جوں ہی اس دعوت سے لوگوں کی شیفتگی سامنے آئی اور لوگ اس کے گرد جمع ہونے شروع ہوئے اور اس کے کارکنوں کو احترام و عزّت کی نظروں سے دیکھا جانے لگا۔ بعض مفاد پرستوں کے سینوں پر حسد اور کینہ کے سانپ لوٹنے لگے۔ اور انھوں نے دعوت اور اہلِ دعوت کے بارے میں لوگوں کے ذہنوں میں طرح طرح کے شکوک پیدا کرنے شروع کر دیئے۔ کبھی وہ یہ کہتے کہ یہ لوگ ـــــــ اخوان المسلمون ـــــــ "پانچواں فرقہ" بن رہے ہیں۔ کبھی یہ کہتے کہ یہ چند سر پھرے اور آوارہ مزاج نوجوانوں کا گروہ ہے جنھیں کوئی کام بنانا نہیں آتا اور نہ یہ کسی منصوبے کے قائل ہیں۔ اور کبھی یہ الزام دیا جاتا کہ یہ لوگ طالع آزما اور ٹھگ ہیں، لوگوں کا مال ناجائز طریقے سے کھاتے ہیں۔ یہ اور اسی نوعیت کے اور الزام ہم پر چسپاں کیے جانے لگے۔ اور جب ان لوگوں کو یہ پتہ چلا کہ شیخ علی عبدالکریم نے ہمیں مسجد کے لیے ایک قطعۂ زمین دے دیا ہے تو یہ لوگ ان کے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑ گئے اور ان کی جان ضیق میں ڈال دی۔ اور ان کے ذہن کو طرح طرح کی چغل خوریوں اور دسیسہ کاریوں سے بھر ڈالا۔

شیخ موصوف ایک سیدھے اور صاف دل انسان تھے۔ اور وہ ان کی باتوں سے متاثر ہو رہے تھے۔ چنانچہ صورتِ حال سخت فتنہ خیز ہو گئی۔ اور آخر یہ فتنہ یوں فرو ہوا کہ میں نے زمین سے دست برداری کے کاغذات بڑی خوش دلی اور اطمینان قلب کے ساتھ انھیں واپس کر دیئے۔ کیونکہ میں اس گہرے احساس سے پوری طرح لبریز تھا کہ ہمارا منصوبہ اللہ کی مدد و نصرت سے کامیاب ہو کر رہے گا۔ مگر بدخواہوں کو ایک موقع ہاتھ آ گیا،

اور انھوں نے ہمارے منصوبے کی ناکامی کا پروپگنڈہ شروع کردیا۔ ہم نے بھی اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور اپنی جانب لوگوں کی توجہ دیکھ کر صورتِ حال سے استفادہ شروع کردیا۔ اور ان سے مل کر ذہنوں سے شکوک وشبہات دور کرنے لگے۔ اصل حقائق ان کے سامنے واضح کیے اور دلیل وحجّت کے ذریعہ سے انھیں اپنی دعوت کا قائل کرنے لگے۔ اور پھر انہی لوگوں سے عطیات بھی فراہم ہونے لگے۔ اللہ تعالیٰ اخ حامد عسکریہ کو جزائے خیر عطا فرمائے اور جنّت میں ان کی منزل کشادہ فرمائے وہ اس میدان میں گوئے سبقت لے گئے۔ اور انھوں نے اس مہم میں اپنا اتنا وقت اور کوشش صرف کی کہ اس کی صحیح قدردانی صرف اللہ تعالیٰ ہی کرسکتا ہے۔

موصوف نے اکثر راتیں عشاء سے لے کر فجر تک جاگ کر گزاریں۔ لوگوں کے گھروں میں جاتے، دوکانوں کا طواف کرتے اور ان کی چوپالوں تک پہنچتے اور بارہا ایسا ہوا کہ وہ اس مہم میں اتنے مگن ہوئے کہ ان پر خود فراموشی کا عالم طاری ہوگیا اور وہ رمضان المبارک کی سحری کھانے سے محروم رہ گئے۔ میں ایک اور زندہ دل اور نیک نہاد انسان کا بھی ذکر خیر کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ شیخ محمد حسین زملوط ہیں۔ انھوں نے بھی اپنے مال سے اور اپنے عملی تعاون سے اسکیم کی بھرپور مدد کی۔ اور پانچ سو پونڈ کا عطیہ پیش کیا۔ ابھی وہ ہمارے مالیات کے سکریٹری نہیں بنے تھے۔ ان کے اس فعل نے دوسرے انسانوں کے دلوں میں بھی اعتماد اور اطمینان کا جذبہ پیدا کردیا۔ اور وہ اس اسکیم کی اس وقت تک پُشت پناہی کرتے رہے جب تک اسے اللہ تعالیٰ نے خیروعافیت سے پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچایا۔

اس کے بعد ہم نے ایک اور قطعۂ ارض کی تلاش شروع کردی۔ عرب محلّہ کے بالکل آخری کنارے پر ہمیں ایک ٹکڑا ملا۔ چنانچہ ہم نے اسے خرید لیا اور بیعنامہ پر دو نیک انسانوں کے دستخط ہوگئے۔ ایک شیخ محمد حسین زملوط ــــــــ اللہ

ان پر رحمتیں نازل فرمائے ـــــــ اور دوسرے حاجی حسین الصولی۔ اللہ تعالیٰ انھیں سرخرو رکھے، اور ان کی عمر میں برکت عطا فرمائے۔ ان کے دستخطوں کی تفویض جمعیت کی طرف سے کردی گئی تھی۔ ہماری جمعیت اس وقت حکومت کے انجمن سازی کے قواعد کے تحت تشکیل دی جاچکی تھی۔ اس کے اغراض و مقاصد اور دستور وضع کرلیا گیا تھا۔ ایک انتظامیہ اور ایک جنرل کونسل بھی قائم کردی گئی تھی۔

شیخ حامد عسکریہ کی شبراخیت میں منتقلی

مفاد پرست ٹولے کی معاندانہ کارروائیاں آخر ختم ہوگئیں۔ اور ان کے ختم ہو جانے کی وجہ یہ ہوئی کہ ان لوگوں نے ادارہ وعظ و تبلیغ کو گمنام شکایات بھیجیں، جس کے نتیجے میں اخ حامد عسکریہ رحمہ اللہ کو شبراخیت منتقل کردیا گیا۔ ایک لحاظ سے یہ منتقلی دعوت کے لیے خیر و برکت کا موجب ثابت ہوئی۔ شبراخیت میں بھی تنظیم کی ایک شاخ کھول دی گئی۔ اور اس شاخ نے اتنی ترقی کی کہ اس کی طرف سے ایک حفظ قرآن کا مدرسہ جاری کیا گیا۔ ایک عظیم الشان مسجد بنائی گئی اور ایک پرشکوہ بلڈنگ تعمیر کی گئی جسے مدرسہ اور مسجد کے نام وقف کردیا گیا۔

خدا تعالیٰ شیخ قاسم جوبد کو دامن رحمت میں لے، یہ شبراخیت کے ایک خدا پرست اور وجیہ انسان تھے۔ اس پروجیکٹ کو بروئے کار لانے میں وہ شیخ حامد عسکریہ کا سہارا اور دایاں بازو تھے۔ اس زمانے میں شیخ حامد عسکریہ کا اسماعیلیہ کو چھوڑ جانا اسماعیلیہ کے اخوان کے لیے ایک صدمۂ جانکاہ تھا۔ مگر بعد میں اس کی حکمت و برکت سب پر عیاں ہوگئی۔

میں وہ دن ہرگز نہیں بھول سکتا ـــــــ وہ نہایت سخت گرم اور جان لیوا دن۔ ہم نے اس دن کا پچھلا پہر اپنے مکان کے سامنے ـــــــ جو عریش میں واقع تھا ـــــــ بیٹھ کر گزارا۔ بڑی ٹھنڈی چھاؤں میں ہم بیٹھے تھے، ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی اور مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ ہم آرزوؤں کے محلات تعمیر کرتے رہے اور

انتہائی روحانی سکون کی حالت میں بڑے اعتماد و یقین کے ساتھ ہم ان آرزوؤں کو بروئے کار لانے کی ٹھانتے رہے۔ اس محفل نے میرے اندر ایک دبے ہوئے احساس کو متحرک کر دیا میں نے شیخ حامد عسکریہ سے کہا:

جیسی روحانی تسکین اور قلبی جلا میں اب محسوس کر رہا ہوں ایسی کیفیت پہلے کبھی نہیں محسوس ہوئی۔ اور میرے دل میں یہ ضرب المثل چٹکی لے رہی ہے کہ: عند صفو اللیالی یحدث الکدر (جب راتیں خوشگوار ہو جاتی ہیں تو انھیں مکدر کرنے والی چیز پیدا ہو جاتی ہے)۔ میں اس خیال کی تہ کو نہیں سمجھ پا رہا جو اس وقت میری روحانی تسکین کے چشمۂ صافی کو بار بار گدلا کر رہا ہے۔

شیخ حامد عسکریہ مجھے تسلّی دینے لگے، اور اسی دوران ہم دار الاخوان کی جانب چلے گئے۔ وہاں کیا دیکھتے ہیں کہ حامد عسکریہ کی تبدیلی کی چٹھی پڑی ہے۔ ہم سب ایک دوسرے کا مُنہ تکنے لگے اور ہم میں سے ہر ایک دوسرے سے یہ کہنے لگا کہ: جو کچھ ہوا درست ہوا۔ اس نقل و حرکت سے بے شک دعوت کو فائدہ پہنچے گا۔ مومن جہاں بھی ہو خیر کا سفیر ہوتا ہے۔

مجھے یہ بھی یاد ہے کہ اس واقعہ سے پہلے اسماعیلیہ میں ادارۂ وعظ و تبلیغ کے انسپکٹر شیخ عبد ربہ مفتاح ہم سے ملنے تشریف لائے اور ہمارے ساتھ انھوں نے اسی مکان میں شب باشی کی جو عرلیش میں واقع تھا اور جس میں ہم سب اکٹھے سکونت پذیر تھے۔ شیخ عبد ربہ نے دیکھا کہ تقریباً ہر اخ کے پاس اس مکان کی کنجی ہے، اور صبح کے وقت ان میں اکثر لوگ ہمارے لیے ناشتہ لے کر آئے۔ کیونکہ ہمارے پاس کھانا پکانے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ محبّت و الفت کے یہ مظاہرے شیخ موصوف کے دل پر بڑا اثر کرتے رہے۔ وہ انتہائی تأثر کی کیفیت میں یہ پوچھنے لگے:

"آپ نے ان لوگوں کے ساتھ کیا کر رکھا ہے۔ انھیں کیسے یک جان دو

قالب بنا دیا ہے۔ ان کے دلوں کے اندر محبت و الفت کے ان اعلیٰ روحانی جذبات کا سحر کس طرح پھونک دیا ہے ؟ "

میں نے ان سے عرض کیا : " ہم نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ اور نہ ہمارے کسی کارنامے کو اس میں کوئی دخل ہے۔ بلکہ یہ اللہ تعالےٰ کے اس قولِ برحق کا مصداق ہیں کہ :

لو انفقت ما فی الارض جمیعا ما الفت بین قلوبھم ولکن

اللہ الف بینھم ۔ (الانفال ۶۳)

" اے نبی اگر زمین کے سارے خزانے بھی تو خرچ کر دیتا تو ان کے دلوں میں محبت نہ پیدا کر سکتا۔ لیکن اللہ تعالےٰ نے ان کے اندر محبت پیدا کر دی "

گرمیوں کی چھٹیاں آگئیں۔ اور کچھ قاہرہ میں گزریں اور کچھ محمودیہ میں۔ جب پڑھائی شروع ہوئی تو میں اسماعیلیہ لوٹ آیا۔ اور میں نے دیکھا کہ مسجد کی اسکیم کے بارے میں جو ابھی شرمندۂ تکمیل نہ ہوئی تھی۔ پھر طرح طرح کی سخن طرازیاں کی جارہی ہیں۔ اور ہر جگہ اس موضوع کو نقلِ محفل بنایا جارہا ہے۔ یہ پھبتی بھی کسی جارہی ہے کہ " مسجد کی اسکیم پورے آرام کے ساتھ چھٹیاں گزار رہی ہے " میں نے یہ کلمات سُنے اور ان پر کوئی دھیان نہ دیا اور نہ ان کا جواب دینے کی کوشش کی۔ میں ایک اصول سے واقف ہوں۔ اس اصول نے کارِ دعوت میں مجھے بہت نفع پہنچایا ہے۔ وہ یہ ہے کہ :-

افواہوں اور اکاذیب کا سدِباب جواب دینے یا جوابی افواہوں سے نہیں ہو سکتا بلکہ ایک ایسا مثبت اور مفید اقدام ان کا از خود خاتمہ کر دیتا ہے جو لوگوں کی نگاہیں اپنی طرف کھینچ لے اور ان کی زبانیں اس کا چرچا کرنے لگیں۔ یوں ایک " نئی افواہ " ——— جو حق اور حقیقت ہوگی ——— پرانی افواہ ——— جو باطل

اور جھوٹ ہوگی ــــــــ کی جگہ لے لے گی۔

اسی اصول کے تحت ہمارے لیے ضروری تھا کہ ہم کام کا آغاز کر دیں۔ چنانچہ میں نے اخوان کے ساتھ مل کر فوراً عملی اقدام کر ڈالا۔ اور پتھروں کی دو گاڑیاں ہم نے خرید لیں۔ اور جس روز وہ پہنچ گئیں ہم سب نے اس بات پر اتفاق کر لیا کہ ان پتھروں کو بندرگاہ سے لے کر مسجد تک ہم خود اپنے ہاتھوں سے ڈھوئیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ یہ دن اخوان کے حق میں بڑا اعظیم ثابت ہوا۔ عامۃ النّاس کی زبانوں پر اس واقعہ کا چرچا شروع ہوگیا اور انھیں لیقین ہوگیا کہ مسجد کی اسکیم سنجیدگی سے شروع ہو چکی ہے اور یہ کوئی بچکانہ حرکت نہیں ہے۔ چنانچہ لوگوں کے حوصلے متحرک ہو گئے اور لوگوں نے اپنے بقیہ عطیات دینے شروع کر دیئے۔ ہم نے سنگِ بنیاد رکھنے کا اعلان کر دیا۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ ہم نے اس غرض کے لیے ۵ محرّم ۱۳۴۸ھ کا دن مقرر کیا تھا۔ اللہ تعالےٰ محمد افندی سلیمان کو جزائے خیر دے۔ ہم نے زمین کا ٹکڑا ان سے خریدا تھا۔ انھوں نے مسجد اسکیم میں حصّہ لیتے ہوئے پلاٹ کے نہایت مناسب دام لئے۔ اور اخوان کو اس پر قبضہ کرنے کے لیے پوری سہولتیں فراہم کیں۔ یہ تمام امور اللہ تعالیٰ کی توفیق خاص کے مظہر تھے۔ اور بے شک توفیقِ الٰہی اس اسکیم کے سلسلے میں قدم قدم پر ہمارے شاملِ حال رہی ہے۔

سنگِ بُنیاد

مسجد اور مدرسہ ــــــــ جس کا نام ہم نے "دارالاخوان" رکھا تھا ــــــــ کے سنگِ بنیاد رکھنے کی مقررہ تاریخ قریب آگئی۔ اخوان نے اجتماع کیا اور اس میں یہ طے کیا کہ خاکسار سنگِ بنیاد رکھے گا۔ میں نے انھیں سمجھایا کہ میرے سامنے آنے سے اسکیم کو کوئی مادّی یا معنوی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ بہتر یہ ہے کہ ہم سب اس تقریب کو بھی اسکیم کے فائدے کے لیے استعمال کریں۔ چنانچہ سب لوگ بڑے بڑے سرکاری ملازمین اور شہر کی معزز شخصیتوں

کے ناموں کا جائزہ لینے لگے۔ ایک طرفہ صورت یہ پیش آئی کہ اگر میں کسی بڑے سرکاری ملازم کا نام پیش کر دیتا تو بعض اخوان اس پر تبصرہ کر دیتے کہ: نہ وہ کوئی نیک ہے کہ اس سے برکت ہی کی امید ہو اور نہ وہ سرمایہ دار ہے کہ اس سے مالی منفعت ہی حاصل ہو۔ یہ فقرہ اخوان کے ہاں ایک ضرب المثل بن گیا۔ اخوان مجھ سے پوچھنے لگے کہ آخر آپ کی کیا رائے ہے؟ میں نے عرض کیا کہ شیخ زلموطؒ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ وہ نیک نہاد شیخ جس نے شروع شروع میں تمہارا ساتھ دیا تھا اور اپنی وجاہت اور سرمائے سے تمہیں فائدہ پہنچایا تھا۔ وہ ایک خدا پرست اور راست رو آدمی ہے۔ مال و دولت بھی اس کے پاس ہے۔ اس سے تمہیں برکت بھی ملے گی اور پیسہ بھی۔ سب نے بیک زبان ہو کر کہا: خوب انتخاب ہے۔ چنانچہ سنگِ بنیاد رکھنے کے لیے ان پر سب کا اتفاق ہو گیا۔

مقررہ تاریخ کو اخوان نے ایک عظیم الشان پنڈال لگایا اور ہر طبقے کے لوگوں کو مدعو کیا گیا۔ یوں ایک طربناک منظر پیدا ہو گیا اور یہ اجتماع خالص عوامی شکل اختیار کر گیا۔ شیخ محمد حسین زلموط رحمۃ اللہ علیہ بنفس نفیس آگے بڑھے، اور انھوں نے دستِ مبارک سے سنگِ بنیاد رکھ دیا۔ اخوان نے اس واقعہ سے نیک شگون لیا۔ اور انھوں نے اعلان کر دیا کہ اس سال رمضان المبارک گزرنے سے پہلے پہلے بحکم خداوندی یہ مسجد پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گی۔

شبراخیت میں ایک شاخ کا قیام

شیخ حامد عسکریہ رحمہ اللہ نے شبراخیت میں فروغ دعوت کے لئے خوب محنت کی۔ انھیں شبراخیت میں منتقل ہوئے چند ماہ ہی گزرے تھے کہ وہاں اخوان المسلمون کی شاخ کی تاسیس عمل میں آ گئی۔ جب محرم الحرام کا مہینہ آیا اور ہجرت نبویؐ کی یاد میں تقریبات شروع ہوئیں تو ہم نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور انہی دنوں کے اندر ہم

نے شبراخیت کی شاخ کا افتتاح کرنے کا پروگرام طے کرلیا۔ ہم اسماعیلیہ کے اخوان نے ایک گاڑی کا انتظام کرلیا جس کی ڈرائیونگ اُخ حسن افندی مصطفےٰ نے کی۔ ہم نے اللہ بزرگ و برتر پر بھروسہ کرتے ہوئے محمودیہ کی طرف شدِّ رحال کیا۔ رات محمودیہ کے اخوان کے ساتھ بسر کی اور صبح ہم سب شبراخیت پہنچ گئے۔ محمودیہ کے اخوان ایک دوسری گاڑی میں ہمارے ساتھ آئے اور ہم نے شاخ کی افتتاحی تقریب میں شرکت کی اور پھر فوراً اسماعیلیہ لوٹ آئے۔ یہ سفر ہم نے دس گھنٹوں میں طے کرلیا تھا۔ اور اتنی ہی دیر واپس لوٹنے میں لگی۔ ہماری رفتار خاصی تیز تھی۔

جسے اللہ رکھے ....

مجھے یاد ہے کہ راستے میں جب ہم صبح دو بجے کے قریب زفتی پہنچ گئے تو ہمیں معلوم ہوا کہ دریا کا پُل بند کردیا گیا ہے۔ اب ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ ہم دھنورہ بیراج سے گزریں۔ یہ راستہ بڑے پیچ و تاب اور نشیب و فراز کا تھا۔ جن کا ہمارے ڈرائیور کو کوئی علم نہ تھا۔ اور نہ ایسے راستوں میں چلنے کا اسے تجربہ حاصل تھا۔ عربی مہینے کی دس تاریخ تھی۔ چاند اپنی روشنی پانی پر پھینک رہا تھا۔ اور یوں نظر آتا تھا کہ گویا زمین ہموار ہے۔ دھنورہ کا پُل ہم نے عبور کرلیا یا ہمیں ایسا خیال ہوا کہ ہم پُل عبور کر آئے ہیں۔ ڈرائیور گاڑی چلانے میں منہمک تھا۔ ہم بھی بے کھٹک بیٹھے رہے۔ مگر اچانک ڈرائیور نے گاڑی کھڑی کردی اور ہم سب خوفزدہ ہو گئے۔ جب ہم نے بنظرِ غائر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ہم جہاں پہنچ چکے ہیں وہ ایک لمبی زبان ہے جو پانی کے اندر چلی گئی ہے۔ اور اس کا عرض گاڑی کے پہیّوں کے عرض سے زیادہ نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر ہم گاڑی سے اُترنے کی کوشش کریں تو سیدھے پانی میں جائیں گے اور ہم گاڑی کو سرکاتے ہیں تو خدشہ ہے کہ ڈرائیور کا ہاتھ دائیں یا بائیں مڑ جائے اور گاڑی پانی میں لڑھک جائے۔ اور مزید براں تعجب کی بات یہ ہے کہ گاڑی کا اگلا حصّہ اتنا آگے ہو چکا تھا کہ اس کے اور بقیہ خشک حصّے

کے درمیان صرف ایک گز کا فاصلہ رہ گیا تھا۔

بعض اخوان نے اضطراب کا اظہار کیا اور اپنی جگہ سے ہلنے کی کوشش کی مگر صورتِ حال بہت احتیاط کی متقاضی تھی۔ اور اس امر کی شدید ضرورت تھی کہ قطعاً حرکت نہ کی جائے تاکہ گاڑی کو پوری طرح ٹھیراؤ ہو اور ہمارے اعصاب میں بھی سکون پیدا ہو اور پھر ہم سوچیں کہ کیا کرنا چاہیئے۔ میں یہ منظر دیکھ کر ہنس پڑا اور میں نے ناظمِ طعام سے کہا کہ آپ نے جو چائے بچا رکھی ہے وہ کہاں ہے؟ وہ کہنے لگا: کس لیے؟ میں نے کہا: "اب ہم چائے کا دور چلاتے ہیں۔"

وہ کہنے لگا: "اس نازک گھڑی کے موقع پر آپ کو مذاق کی سوجھی ہے؟" یہ صاحب اخ محمود افندی جعفری تھے۔ بڑے ظریف الطبع، شیریں زبان، فراخ دل اور با مروّت انسان۔ میں نے ان سے کہا: محمود صاحب، میں اس وقت بالکل سنجیدگی کے ساتھ آپ سے کہہ رہا ہوں چائے پلایئے۔ چنانچہ انھوں نے تعمیلِ حکم کی اور تھرماس میں سے چائے ڈال کر دینا شروع کر دی اور ہم اسے بڑے مزے سے پیتے رہے۔ حالانکہ ہم عین موت کے دروازے پر تھے۔ مگر جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ جب ہم لوگ اور ڈرائیور اور گاڑی سب ہر لحاظ سے بے حس و حرکت ہو گئے تو اخ حسن یوسف نے جو ہمارے قائد اور ہمارے چابکدست ڈرائیو تھے پیچھے کی طرف سرکنے لگے۔ سرکنے کی رفتار کچھوے کی رفتار سے زیادہ نہ تھی۔ وہ سراپا احتیاط اور ضبطِ اعصاب تھے۔ تقریباً نصف گھنٹہ تک ہماری یہی حالت رہی۔ اس کے بعد ہم مناسب چوڑائی پر آئے اور آخر کار شاہراہ مستقیم پر پہنچ گئے۔ یوں اللہ تعالیٰ نے ان ہولناک ساعتوں سے ہمیں نجات دے دی۔

مزید تعجب کی بات یہ ہے کہ جب ہم چھ بجے صبح کے قریب اسماعیلیہ پہنچے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ گاڑی کے اندر پٹرول بالکل ختم ہو چکا تھا اور یہ خدا جانے کس بل بوتے پر چلتی رہی۔ اسے بھی حسنِ اتفاق ہی کہا جا سکتا ہے کہ پٹرول ختم ہونے کا علم اس وقت ہوا جب ہم منزل پر

پہنچ گئے۔ اللہ تعالےٰ کے احسان و کرم اور لطف و عنایت کا ہزار شکر و سپاس ہے۔
ان ربی لطیف لما یشاء

خفیہ پولیس

یہ بھی مجھے یاد ہے کہ اس سفر میں ہم ایک مقام دیرب نجم کے قریب آکر رُک گئے تھے۔ ہمارے سامنے کئی ملتے جلتے کچے راستے تھے۔ اور ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ہم کس راستے پر چلیں۔ ہم ادھر ادھر لپکے تاکہ ہمیں کوئی آدمی مل جائے اور ہم اُس سے راستہ دریافت کریں۔ مگر ہمیں کھیتوں یا راستوں پر کوئی شخص نہ ملا۔ آخرکار ہمارے ایک ساتھی کارپورل محمد شلش کو جو ان دنوں روض الفرج کی برانچ میں ہوتے تھے۔ اور انھیں شوق تھا کہ اس سفر میں ہماری رفاقت کریں یاد آیا کہ ان کے پاس پولیس کا وسل ہے۔

چنانچہ انھوں نے اسے نکالا اور بجایا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف سے سپاہی دوڑے آئے۔ ایک سپاہی آگے بڑھ کر اپنی رائفل کے ساتھ عسکری آداب بجالایا۔ اور پوچھنے لگا: "آپ کون ہیں حضور؟" شلش نے جواب دیا: "اینٹلی جنس"۔ اس کے بعد اس کے کان میں کچھ کہا اور پھر اس سے پوچھا کہ راستہ کدھر ہے؟۔ سپاہی نے بڑے ادب و احترام کے ساتھ ہمیں راستہ بتایا۔ چنانچہ ہم اپنی صحیح سمت پر آگئے۔ میں نے اخ شلش سے کہا "تم نے جھوٹ کیوں بولا؟"۔ شلش مسکرا کر کہنے لگا: "میں نے جھوٹ نہیں بولا۔ ہم حق اور خیر اور دین کی ٹوہ لگانے والے ہیں۔ اگر میں اس سے کچھ اور کہتا تو وہ اس کے سوا ہرگز راضی نہ ہوتا کہ ہم اس کے ساتھ تھانیدار کے پاس جائیں۔ اور تھانیدار نہ معلوم ہمارے ساتھ کیا سلوک کرتا۔ ہو سکتا ہے ہمیں صبح تک اس کے پاس رُکنا پڑتا اور ہمارے پاس وقت بالکل نہیں تھا۔ یہ عجیب لطیفہ رہا اور خلاصی کی صورت عجیب تر۔

حکومت کی مخالفت کا الزام

مسجد کی تعمیر میں ہم نے کامیابی کے ساتھ پیش قدمی کی۔ عمارت اٹھادی گئی اور

وہ اختتام کے قریب پہنچ گئی۔ ساتھ ہی ہمارے خلاف فتنہ پردازیوں اور دسیسہ کاریوں کا سلسلہ بھی شدت اختیار کر گیا۔ ہر طرف سے مفاد پرست لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے اور اس مفید کام کی تکمیل میں آڑے آنے لگے۔ اس کے سوا انھیں کوئی حربہ نہ ملا کہ وہ ہمارے خلاف ریشہ دوانی کریں، چغل خوری کریں اور گمنام درخواستیں لکھ کر اسماعیلیہ کی پولیس، ڈپٹی کمشنر اور دوسرے اعلیٰ حکام کو بھیجیں۔ جب ان کی یہ ساری کوششیں بے سود ثابت ہوئیں تو ان لوگوں نے ایک محضر نامہ تیار کیا جس پر اسماعیلیہ کے کچھ باشندوں کے دستخط کرائے گئے اور اُسے براہ راست وزیر اعظم کو بھیج دیا۔ ان دنوں صدقی پاشا مصر کے وزیر اعظم تھے۔ اس محضر نامے میں عجیب و غریب باتیں بیان کی گئیں۔ مثلاً یہ کہا گیا کہ یہ ٹیچر ـــــــ حسن البنّا ـــــــ کمیونسٹ ہے۔ ماسکو کے ساتھ اس کا رابطہ ہے۔ اور وہاں سے مالی امداد حاصل کرتا ہے۔ وہ ان دنوں ایک مسجد اور ایک مرکز تعمیر کر رہا ہے۔ اپنی جماعت اور تبلیغی سرگرمیوں پر بھی سرمایہ خرچ کر رہا ہے۔ لوگوں سے کوئی مالی اعانت حاصل نہیں کرتا لہٰذا اُسے یہ تمام سرمایہ کہاں سے مل رہا ہے؟۔

اس زمانے میں کمیونزم کی بدعت مصر کے اندر " جدید فیشن " کے طور پر داخل ہو رہی تھی اور خود صدقی پاشا بھی اس کی بڑی سختی کے ساتھ سرکوبی کر رہا تھا۔ محضر نامے میں یہ بھی کہا گیا کہ یہ معلم وفد پارٹی کا حامی ہے اور موجودہ حکومت یعنی صدقی پاشا کی حکومت کے خلاف سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہے۔ اور یہ کہتا پھرتا ہے کہ موجودہ صورت میں جو انتخابات ہوئے ہیں یہ غلط ہیں اور ۱۹۳۰ء کا دستور بھی غلط ہے۔ چنانچہ یہ شخص موجودہ حکومت کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے کے لیے بحیرہ بھی گیا ہے۔ اور وہاں اس نے مزدوروں کے کلب میں اکتوبر ۱۹۳۰ء میں ایک تقریر کی ہے۔ جس کا موضوع تھا " ابوبکر صدیق رضؓ " اس نے اس تقریر میں کہا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کا انتخاب براہِ راست عمل میں آیا تھا۔ اور ان کا انتخاب دو مرحلوں پر مشتمل نہ تھا۔ لہٰذا دو مرحلوں کا انتخاب باطل اور ناجائز ہے۔ محضر نامے

میں یہ بھی کہا گیا کہ یہ شخص ہمارے آقائے نعمت ہزمیجسٹی شاہ فؤاد کا ذکر ایسے الفاظ میں کرتا ہے جن کو یہاں بیان کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ اس نے اکتوبر ہی کے مہینے میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے موضوع پر بھی ایک تقریر کی ہے اور اس میں کہا ہے کہ:

"حضرت عمر بن عبدالعزیز نے بیت المال سے کبھی ایک پیسہ تک نہیں لیا تھا۔ لیکن اس دور کے ملوک ناجائز و باطل طریقوں سے رعایا کے اموال لوٹ رہے ہیں۔"

انہی دنوں کی بات ہے کہ استاذ عقاد کو حوالۂ زنداں کیا گیا تھا کیونکہ انھوں نے بادشاہ کی ذات پر نکتہ چینی کی تھی[۱]۔ اور اسی الزام میں الظاہر پرائمری اسکول کے چار مدرّس بھی برطرف کیے گئے تھے۔ یہ بھی کہا گیا ——— اور یہ بات کہتے وقت محضرنامہ تحریر کرنے والے اپنا پہلا فقرہ بھول گئے ——— کہ یہ معلّم اہالیانِ شہر سے چندہ جمع کرتا ہے کہ اسے مدرسوں اور مسجدوں کی اسکیموں پر صرف کرے۔ مگر کسی کو یہ معلوم نہیں ہے کہ یہ تمام جمع شدہ چندہ کہاں صرف کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ مالی قانون کی رو سے سرکاری ملازمین کے لیے چندہ جمع کرنا ممنوع ہے۔ یہ شخص عین حکومت کی ناک کے نیچے اس قانون کی صریح خلاف ورزی کر رہا ہے ——— اس طرح کے بہت سے الزامات جن کی تعداد ۱۲ تک پہنچ گئی تھی۔ محضر نامے میں درج کر دیئے گئے۔ اور یہ تمام الزامات سراسر غلط اور من گھڑت تھے۔ مجھے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا مطلب کہ:

---

[۱] عباس محمود العقاد مصر کے نامور ادیب، مورّخ اور فلسفی تھے۔ شاہ فواد الاول نے انھیں گرفتار تو کر لیا مگر تھوڑے عرصہ بعد یہ کہہ کر انھیں رہا کر دیا کہ تاریخ شاہ فواد کے بارے میں یہ رائے قائم کرے گی کہ اس نے ایک ادیب اور صاحبِ قلم انسان کو حوالۂ زنداں کر دیا۔ العقاد کی عبقریت جو سیرتِ رسولؐ اور سیرت خلفائے راشدین اور دیگر نامور صحابہ اور صحابیات پر مشتمل ہیں۔ اسلامی تاریخ کا نہایت عمدہ سرمایہ ہیں۔ (مترجم)

یا اھل الکتاب لم تلبسون الحق بالباطل وتکتمون الحق و انتم تعلمون۔

"اے اہل کتاب تم حق کو باطل کے ساتھ کیوں ملا جلا دیتے ہو اور حق کو چھپا دیتے ہو حالانکہ تم ہر بات کو جانتے ہو"۔

ایسے ہی محضر نامے کی بدولت سمجھ میں آیا۔ میں نے فی الواقع دو تقریریں جن کی طرف محضر نامے میں اشارہ کیا گیا ہے کی تھیں۔ ان کا موضوع بھی وہی تھا جو محضر نامے میں بتایا گیا ہے اور جگہ اور تاریخ بھی وہی تھی جس کی محضر نامہ لکھنے والوں نے تشخیص کی ہے لیکن محضر نامے کے اندر ان تقریروں کو جس طرح مخصوص صورتِ حال پر منطبق کیا گیا ہے، اس کی میں نے کوئی کوشش نہ کی تھی۔ استنتاج کی یہ شکل فریب دہی اور فتنہ پردازی میں گہری دست گاہ کا ایک نمونہ ہے۔ اور وہی شخص اس کا راز داں ہو سکتا ہے جسے باطل کو حق کے ساتھ آمیزش کرنے کی خوب مشق حاصل ہو۔ وﷲ فی خلقہ شؤون (اللہ نے کیا طرح طرح کی مخلوق پیدا کی ہے)۔

الزام کی تحقیق

ایک روز ہنگامِ صبح میں اپنی کلاس کی طرف پہلا یا دوسرا پیریڈ پڑھانے کے لیے جا رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ مدرسہ کے پرنسپل جوان دنوں استاذ احمد عبدالہادی السابق تھے۔ اپنے کمرے کے دروازے میں کھڑے ہوئے مجھے انوکھی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ میں نے ان کے قریب ہو کر کہا:

السلام علیکم ورحمۃ اللہ، صبح بخیر، پرنسپل صاحب۔

وہ مسکرانے لگے اور کہنے لگے: وعلیکم السلام، صبح بخیر۔

ان کے جواب کا لہجہ ایسا تھا کہ مجھے اندازہ ہوا کہ اس کے پس پردہ کوئی بات ہے۔

میں نے کہا: "انشاء اللہ خیریت ہے؟"

انھوں نے کہا: "خیریت ہے خیریت"۔
پھر میں نے کہا: "دال میں کچھ کالا کالا ہے"۔
فرمانے لگے: "قصہ کریمنل کورٹ کا ہے یا استاذ حسن! کریمنل کورٹ یا حبیب، ہم سب اسی لپیٹ میں ہیں"۔
میں نے عرض کیا: "خوب یہ کریمنل کورٹ میں طلبی کیسے؟
پرنسپل صاحب کہنے لگے: "ایک چٹھی وزیر اعظم کی طرف سے وزیر تعلیم کے نام آئی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ آپ کمیونسٹ ہیں اور موجودہ نظام کے مخالف ہیں۔ شاہ کے بھی خلاف ہیں، سب دنیا کے خلاف ہیں"۔
میں نے کہا: "بس اتنی سی بات ہے۔ الحمد للہ رب العالمین۔ خدا کی قسم، پاشا صاحب، اگر ہم بے گناہ ہیں تو آپ کو اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد آویزۂ گوش بنا لینا چاہیے کہ:

ان اللہ یدافع عن الذین امنوا۔ انّ اللہ لا یحبّ کل خوان کفور۔ (الحج ۳۸)

"بے شک اللہ تعالیٰ ایمان والوں کا دفاع کرتا ہے، بیشک اللہ کسی خائن اور کافر کو پسند نہیں کرتا"۔

اور اگر ہمارا یہ جہاد اور یہ دعوتِ دین لوگوں کو فریب دینے کے لیے ہے تو یقین کیجیے کہ کریمنل کورٹ اور جہنم بھی ان لوگوں کے لیے قلیل سزا ہیں جو دنیا کی خاطر دین کے لبادے میں لوگوں کو دھوکا دیتے ہیں۔ لہٰذا آپ کچھ پروا نہ کریں، اور یہ معاملہ اللہ پر چھوڑ دیں۔

وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون۔ (الشعراء ۲۲۷)
"اور ظالم عنقریب جان لیں گے کہ وہ کس پہلو پلٹیں گے"۔

میں آپ کو قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس کا نتیجہ سوائے بھلائی کے اور کچھ نہ ہو گا۔ اجازت چاہتا ہوں میرے پیریڈ کا کچھ وقت گزر گیا ہے۔ یہ ایک ضابطے کی خلاف ورزی ہے اور میں خلاف ورزی کو پسند نہیں کرتا۔"

چنانچہ میں نے پرنسپل صاحب کو وہیں چھوڑا اور خود کلاس روم کی طرف چلا گیا۔ پرنسپل صاحب میرے جوابات پر انگشت بدنداں تھے۔ مگر میں سراپا اطمینان و خود اعتمادی تھا۔ اور میں سمجھتا تھا کہ یہ حرکت بچکانہ کھیل کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اور ایسی حرکتوں کا جو نتیجہ برآمد ہوا کرتا ہے اس کا بھی وہی نتیجہ نکلے گا۔ یعنی معاملہ نظر انداز کر دیا جائے گا اور اسے ردّی کی ٹوکری کے حوالے کر دیا جائے گا۔

پرنسپل صاحب کو یہ حکم تھا کہ وزیر اعظم کی چٹھی میں جن باتوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ اُن سب کی خوب چھان بین کریں۔ اور چھان بین کے لیے ہر طرح کے وسائل اختیار کریں۔ میری ان کاپیوں کی پڑتال کریں جن پر میں اسباق تیار کرتا ہوں، ان موضوعات کا جائزہ لیں جو میں طلبہ کو یاد کرنے کے لیے یا مطالعہ اور انشاء پردازی کے لیے پڑھاتا ہوں۔ جمعیت کے نصب العین، طریق کار اور اثرات وغیرہ کا کھوج لگائیں، اور ان امور کے بارے میں اپنی واضح رائے بیان کریں۔

چنانچہ پرنسپل صاحب کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ رہا کہ وہ اس مہم میں جس چیز کو بھی مفید سمجھتے ہوں اس سے مدد حاصل کریں۔ انھوں نے اپنی تفتیش میں مقامی عدالت کے جج، پراسیکیوٹنگ افسر، انسپکٹر پولیس اور ڈپٹی انسپکٹر پولیس کا تعاون و اشتراک بھی حاصل کر لیا، اور ان مناصب کے جو افسران دوسری جگہ تبدیل کیے جا چکے تھے۔ ان سے خط و کتابت کے ذریعہ معلومات فراہم کیں۔ ان تمام معلومات کو انھوں نے جمع کیا اور جمعیت کا دستور اور اغراض و مقاصد ان کے ساتھ منسلک کر دیئے اور جمعیت کی سرگرمیوں کے بارے میں ایک جامع رپورٹ بھی شامل کر دی۔ طلبہ کی کاپیوں کی پڑتال کی تو ان کے

اندر انشاء پردازی کا سب سے پہلا مضمون شاہ فواد رحمہ اللہ کے دورۂ سوئز پر تھا۔ یہ دورہ انھوں نے پورٹ سعید سے لے کر سوئز تک کیا تھا۔ مضمون کے اندر شاہ فواد کی تعریف کی گئی تھی اور اُن کے اچھے کارنامے گنوائے گئے تھے۔ پرنسپل صاحب نے اپنی رپورٹ میں اس مضمون کو من وعن نقل کر لیا۔ اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔ ایک طالب علم کی کاپی بھی ساتھ ہی لف کر دی تھی۔ اس مضمون کے ساتھ انھوں نے غیر معمولی دلچسپی لی۔ کیونکہ ان پر بھی یہ الزام عائد تھا کہ وہ وفد پارٹی کے حامی ہیں اور سرکاری چٹھی میں اس بات کو ہدفِ اعتراض ٹھیرایا گیا ہے اور اب انھوں نے دیکھا کہ یہ موقع ہے کہ وہ حق کی مدافعت کے ساتھ ساتھ اپنی ذات کا دفاع بھی کر لیں۔

ایک شہادت

ایک واقعۂ عجیب یہ پیش آیا کہ ان دنوں اسماعیلیہ میں پولیس کے اعلیٰ افسر کپتان حسن الشریف النبا یوسی تھے۔ وہ جب رپورٹ قلم بند کرتے تھے تو سرکاری چٹھی کے اندر جو افترا پردازی اور دروغ گوئی کی گئی تھی اسے دیکھ کر سخت چین بجبیں ہوتے۔ ایک دن ان کے پاس سویز کمپنی کے غیر مصری کلرکوں میں سے کوئی صاحب ان کو ملنے آئے۔ اور ان سے پوچھنے لگے کہ آپ کے چہرے سے پریشانی اور دل گرفتگی کے آثار کیوں عیاں ہیں۔ کپتان صاحب نے حقیقتِ حال بیان کی، جسے سُن کر وہ صاحب ششدر رہ گئے، اور کہنے لگے:

> "یہ سب فضول باتیں ہیں۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ جس روز شاہ فوادؒ اسماعیلیہ سے گزر رہے تھے تو شیخ حسن البنّا مزدوروں سے کہہ رہے تھے کہ تمھیں لازماً اسٹیشن جانا چاہیے اور وہاں شاہ فوادؒ کا خیر مقدم کرنا چاہیے تاکہ اس شہر کے اندر رہنے والے غیر ملکی لوگ یہ سمجھ لیں کہ ہم اپنے بادشاہ کا احترام کرتے ہیں اور اسے پسند کرتے ہیں۔ اس کے

نتیجے میں ان لوگوں کے دلوں میں خود ہمارا احترام بڑھے گا۔ ان صاحب نے یہ بھی کہا کہ میں اپنی یہ عینی شہادت فرانسیسی زبان میں لکھ کر دینے کے لیے تیار ہوں"۔

چنانچہ میرا خیال ہے کہ ان صاحب نے اپنی گواہی لکھ کر دے دی تھی اور اس تحریر کو فائل میں شامل کر دیا گیا تھا۔ غالباً ان صاحب کا نام موسیو توفیق کروز تھا۔ اور یہ ابھی تک اسماعیلیہ کے اندر موجود ہیں۔

ایک اور عجیب تر بات یہ ہوئی کہ اسی سلسلے میں پولیس کے ایک اور افسر کی رپورٹ میں یہ کہا گیا کہ:۔

"اکثر وہ لوگ جنہیں پولیس کے تعزیری وسائل نفع نہیں پہنچاتے اور انھیں جرم کے ارتکاب سے باز نہیں رکھ سکتے ایسے لوگوں کے لیے ایسے روحانی وسائل بہت کامیاب رہے ہیں جو الاخوان کی جماعت اختیار کرتی ہے۔ چنانچہ اخوان کی روحانی تربیت کی بدولت بہت سے خطاکار لوگ راست بازی اور استقامت کا نمونہ بن گئے ہیں۔ لہٰذا وہ ——— یعنی پولیس افسر ——— یہ تجویز کرتا ہے کہ حکومت الاخوان کی حوصلہ افزائی کرے اور اس کی شاخوں کو ملک کے اندر پھیلانے کا کام کرے۔ تاکہ ان کے ذریعہ سے امن عامہ کے قیام اور اصلاح عوام کی زیادہ سے زیادہ خدمت سرانجام دی جا سکے"۔

انسپکٹر جنرل ایجوکیشن نے اخوان کی رکنیت اختیار کر لی

تحقیقات پر مشتمل بھاری بھرکم فائل اسماعیلیہ کے ابتدائی اسکول سے تیار ہو کر وزارت تعلیم کے پاس گئی۔ میری یادداشت کے مطابق ان دنوں وزارتِ تعلیم کا قلمدان علی ماہر کے پاس تھا۔ کچھ دنوں کے بعد یکایک اسماعیلیہ کے پرائمری تعلیم کے انسپکٹر جنرل علی بک کیلانی ہمارے

اسکول میں پہنچ گئے۔ دوسرے پیریڈ میں وہ میری کلاس میں آگئے۔ ان کے ساتھ پرنسپل صاحب بھی تھے۔ اور کافی دیر تک میرا سبق غور و خوض سے سنتے رہے۔ اور پھر مسکرا کر پرنسپل صاحب سے کہنے لگے:

"بس یہی ہے استاذ حسن ؟"

پرنسپل صاحب کہنے لگے: "جی ہاں، بس یہی ہے استاذ حسن"

مجھے بھی یہ سُن کر ہنسی آگئی اور میں نے کہا: "جی ہاں، یہی شخص پُراسرار کاروبار کرتا ہے"

اس کے بعد وہ دونوں حضرات چلے گئے۔ میں نے اپنا سبق مکمل کر لیا، اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ انسپکٹر جنرل صاحب پرنسپل صاحب کے کمرے میں تشریف فرما تھے۔ میں نے انھیں جا کر سلام کیا۔ ان سے معلوم ہوا کہ وہ آج رات اسمٰعیلیہ کے اندر گزاریں گے۔ مجھے کہنے لگے:

"استاذ صاحب، تمہاری اس چھٹی نے تو ہمارے ہاتھوں کے طوطے اُڑا رکھے تھے، وزیر اعظم نے اس چٹھی کو وزیر تعلیم کی طرف بھیجا اور انھوں نے میری طرف بھیج دیا"

لیکن میں نے کہا کہ "میرا ایک ایسے شخص سے کیا تعلق جو کمیونسٹ ہے، انارکسٹ ہے۔ لاکھوں افراد کو جمع کر لیتا ہے، اور ہزاروں افراد اس کے پیرو ہیں ——— جیسا کہ محضر نامے کے اندر بیان کیا گیا ہے ——— چنانچہ میں نے اس چٹھی کو اسسٹنٹ انسپکٹر جنرل عبدالرحیم بک عثمانی کے حوالے کر دیا۔ وہ میرے پاس آئے اور مجھے کہنے لگے:

"اگر یہ ٹیچر اسی نوعیت کا ہے تو ہم اس کے ساتھ کیا معاملہ کر سکتے ہیں؟ یہ تو ایک شدید خطرے کی بات ہے۔ اور ہو سکتا ہے ہماری تحقیقات کے پس پردہ کچھ اور خفیہ پہلو ہوں"

چنانچہ ہم اس محضر نامے کے جھوٹا ہونے کے امکانات کا جائزہ لے رہے تھے اور اس کے

اندر جو تناقص پایا جاتا تھا وہ اس امکان کی جانب اشارے کر رہا تھا۔ اسی دوران ہمیں یہ سوجھی کہ سب سے بہتر اور محفوظ طریقہ یہ ہے کہ یہ کام پرنسپل صاحب کے حوالے کر دیا جائے۔ چنانچہ پرنسپل صاحب کی طرف سے جو رپورٹیں موصول ہوئی ہیں وہ نہایت جامع اور اطمینان بخش ہیں۔ لیکن مجھے اس آدمی کو دیکھنے کا شوق پیدا ہوا جس نے اس قدر عظیم ہنگامہ برپا کر دیا ہے۔ میں تو آپ سے ذاتی ملاقات کے لیے آیا ہوں۔ اسے تفتیشی دورہ یا کوئی سرکاری کارروائی نہ سمجھ لینا۔ میں صرف آپ کو ایک نظر دیکھ لینا چاہتا تھا۔

میں نے انسپکٹر جنرل صاحب کے اس رویئے کا شکریہ ادا کیا اور موقع مناسب سمجھ کر میں نے ان سے کہا:

" یا سیدی، آپ نے جو کچھ فرمایا ہے درست ہے۔ اور آپ کی اس ملاقات اور کرم نوازی کی تکمیل کے طور پر میرا آپ پر یہ حق عائد ہو جاتا ہے کہ آپ مسجد اور مدرسہ کی تعمیرات بھی دیکھ لیں، تاکہ آپ اپنی آنکھوں سے ہماری دعوت اور ہماری جماعت کے کچھ اثرات کا مشاہدہ کر سکیں۔"

انسپکٹر جنرل صاحب نے وعدہ کیا کہ وہ پچھلے پہر وہاں آئیں گے۔ چنانچہ اخوان نے اپنے آپ کو تیار کیا۔ اور عمارت کے وسط میں ایک سادہ نوعیت کی دعوتِ چائے کا انتظام کر دیا۔ اخوان کے مقررین اور زجل گو مستعد ہو گئے۔ انسپکٹر جنرل موصوف نے وعدہ وفا کیا اور وقتِ مقررہ پر تشریف لے آئے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ محض ایک تقریب ملاقات ہو گی۔ مگر وہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ چائے کی پارٹی کا اہتمام کیا جا چکا ہے۔ میں نے اس مختصر سے وقت کے اندر شہر کے اعیان اور بڑے بڑے ملازمین مدعو کر رکھے تھے۔ اور مفاد پرست لوگوں اور محضر نامے میں حصہ لینے والوں کو بھی بہ تاکید دعوت دے رکھی تھی تاکہ وہ بھی آ جائیں اور اپنی آنکھوں سے اپنی فتنہ پردازی کی ناکامی کا مشاہدہ کر لیں۔ چنانچہ محفل جم گئی اور مقررین نے یکے بعد دیگرے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ مہمان یہ سب کچھ دیکھ کر آئینہ حیرت بنا رہا۔ اور خاص طور پر اس

نے یہ دیکھا کہ فلاں مقرر بڑھئی ہے، فلاں مالی ہے، اور فلاں دھوبی وغیرہ وغیرہ وہ بول اٹھا کہ :-

" خوب ! میں نے یہ ایک عجیب ترین مدرسہ دیکھا ہے "۔

جب تقریریں ختم ہوئیں تو اس سے نہ رہا گیا اور وہ کھڑا ہو گیا اور اس نے اخوان کا بیج لے کر اپنے کوٹ پر لگا لیا ——— ان دنوں اخوان کا بیج سبز رنگ کا تمغہ ہوتا تھا جس پر " الاخوان المسلمون " لکھا ہوتا تھا۔ یہ بیج لگا کر خود اُس نے بھی اخوان کے اندر شمولیت کا اعلان کر دیا۔ اور پھر نہایت عمدہ الفاظ میں حاضرین کو ستائش و تحسین کا نذرانہ پیش کیا۔

ان کی مختصر تقریر کا یہ جملہ مجھے ابھی تک یاد ہے :

" اس مدرسہ اور اس جماعت کے سربراہ کی تعریف میں مَیں اس کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتا کہ یہ مدرسہ ایک نرالا مدرسہ ہے اور اس جماعت کا سربراہ ایک حیران کن شخص ہے۔ میں اسی گھڑی سے اخوان المسلمون کا رکن بن رہا ہوں، بشرطیکہ تم لوگ مجھے بطور رکن قبول کر لو۔ محکمۂ تعلیم کے اندر میرے صرف چند ماہ باقی رہ گئے ہیں۔ پھر میں ریٹائر ہو جاؤں گا۔ اور میں آپ سے عہد کرتا ہوں کہ میں اپنی پوری توانائی اور پورا وقت بشرطِ زندگی اس دعوت کی خدمت کے لیے وقف کر دوں گا "۔

یوں معلوم ہوتا ہے کہ انسپکٹر جنرل صاحب نے اپنی اجل کے قُرب کو محسوس کر لیا تھا۔ چنانچہ جوں ہی انھیں ریٹائرمنٹ ملی وہ اس کے تھوڑی مدّت بعد ملکِ عدم کو سدھار گئے۔ ہم سب نے انھیں اپنا ہی ایک رفیق محسوب کیا اور قافلۂ دعوت میں انھیں شمار کیا۔ جہاد بالنّیۃ کی حالت میں ان کی موت واقع ہوئی۔ اللہ تعالےٰ ان پر رحمتوں کی

وسیع بارش فرمائے۔

مذہبی تفرقہ اندازی کا الزام

ہمارے خلاف جو عرضداشتیں اعلیٰ حکام کو بھیجی گئیں ان میں ایک عرضی ایک "عیسائی" کے دستخطوں سے بھیجی گئی۔ اور اس میں یہ شکایت کی گئی کہ یہ متعصب مدرس ——— حسن البنّا" جو ایک فرقہ پرست جمعیت جس کا نام " الاخوان المسلمون " ہے کا سربراہ ہے۔ اپنی کلاس میں دونوں فرقوں یعنی مسلمانوں اور عیسائیوں کے لڑکوں کے مابین تفریق پیدا کررہا ہے۔ عیسائی طلبہ کی دیدہ و دانستہ توہین کرتا ہے۔ اور ان کو نظرانداز کیے رکھتا ہے۔ اور ان کی تعلیم کی طرف قطعی طور پر دھیان نہیں دیتا۔ جب کہ مسلمان طلبہ کو ہر لحاظ سے ترجیح دیتا ہے۔ اور سوالات اور عام ہدایات اور دیکھ بھال میں کلّی طور پر انہی کو منظورِ نظر بنائے رکھتا ہے۔ اگر محکمۂ تعلیم نے اس صورتِ حال کی تلافی نہ کی اور اس مدرس کو یہاں سے تبدیل نہ کیا تو اس کا رویّہ فتنۂ عظیم برپا کردے گا۔[1]

یہ عرضی جب تحقیقات کے لیے پرنسپل صاحب کی طرف منتقل کی گئی تو سارے شہر کے اندر اس کی خبر پھیل گئی۔ اور اسماعیلیہ کے اندر رہنے والے عیسائی ہموطنوں کے اندر ایک کھلبلی مچ گئی۔ اور انھوں نے اس افترا پردازی کی شدّت کے ساتھ مذمت کی۔ ان کا ایک بڑا وفد جس کی قیادت آرتھوڈکس چرچ کا نگران اعلیٰ کررہا تھا۔ اسکول آیا اور اس نے عیسائیوں کے نام پر ایسی حرکت پر سخت احتجاج کیا۔ چنانچہ کلیسا کی ایسوسی ایشن کے صدر فاضل ہم وطن جرجس سوریل افندی، قبطی رفاہی انجمن کے صدر فاضل ہم وطن جوزف افندی ایک بڑے سرکاری ملازم فاضل ہم وطن فہمی افندی عطیہ اور ان کے ساتھ عیسائی فرقہ کے

---

[1] ان دنوں مصر کے اندر مسلمانوں اور عیسائیوں (قبطیوں) کے باہمی اختلافات کو ہوا دینا کس قدر شدید فتنے کا کا موجب بن سکتا تھا اس کا اندازہ کرنے کے لیے ملاحظہ ہو صفحات ۲۳، ۲۴، ۲۵۔ مقدمہ مترجم۔

نمایاں اور ذمہ دار اصحاب جن میں مرد اور عورتیں شامل تھیں۔ سب نے تحریری طور پر افتراپردازی کرنے والے عیسائی کے خلاف اپنا احتجاج پرنسپل صاحب کو پیش کیا۔ اسی طرح کلیسا کی طرف سے کلیسا کی مُہر اور کلیسا کے نگران اعلیٰ فاضل فادر کے دستخطوں سے متعدد عرضداشتیں اور خطوط تحریر کیے گئے۔ ان سب تحریروں کو پرنسپل صاحب نے اپنی رپورٹ کے ساتھ منسلک کردیا اور اپنی مُہر لگانے کے بعد یہ جملہ تحریر کردیا:

"وزارتِ تعلیم سے ہماری درخواست ہے کہ وہ ایسی گمنام چٹھیوں کا بوجھ ہم پر نہ لادا کرے اور اپنے وسائل کی مدد سے ہی ان کی تحقیقات کیا کرے۔ کیونکہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ یہ تمام عرضداشتیں سازشی کارروائیاں ہیں۔ اور ان کے پیچھے کوئی جذبۂ خیر پنہاں نہیں ہے۔"

اخوان کی مسجد کا افتتاح

تمام رکاوٹوں کے باوجود مشیتِ ایزدی کے تحت ہماری مسجد پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی، اور اس سال رمضان المبارک ——— میری یادداشت کی بنا پر یہ ۱۳۴۸ھ کا رمضان تھا ——— کی آمد سے پہلے ہی مسجد اقامت صلوٰۃ کے لیے تیار ہو چکی تھی۔ چنانچہ ۱۷ رمضان المبارک کو عشاء کی نماز سے مسجد کا افتتاح ہوا۔ اس تاریخ کے انتخاب میں یہ نیک شگون کام کر رہا تھا کہ غزوۂ بدر کی رات ہے۔ اور قرآن کریم کے نزول کی رات ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے ماخوذ ہے:

واعلموا انما غنمتم من شئ فان للہ خمسه وللرسول ولذی القربیٰ والیتمیٰ والمساکین وابن السبیل ان کنتم امنتم باللہ وما انزلنا علیٰ عبدنا یوم الفرقان یوم التقی الجمعان۔ (الانفال ۴۱)

"تم جان لو کہ تمہیں جو مالِ غنیمت میں ملا ہے تو اس کا پانچواں حصہ اللہ کے لیے ہے اور رسولؐ کے لیے ہے اور رشتہ داروں اور یتیموں

اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔ اگر تم ایمان لائے ہو اللہ پر اور اس
چیز پر جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کی ہے۔ فرقان کے روز، اور دو گروہوں
کی مڈبھیڑ کے دن ۔"

اس آیت سے ثابت ہوا کہ یہ دن یوم الفرقان (فرقان یعنی قرآن کا دن) ہے اور یہی دن غزوۂ بدر میں دو گروہوں کی مڈبھیڑ کا دن ہے۔ واللہ اعلم۔ ابن اسحاق کا یہی مسلک ہے۔

افتتاح ایک عظیم الشان محفل سے ہوا۔ اس محفل میں اسماعیلیہ کے علاوہ شبراخیت کے اخوان بھی مدعو تھے۔ اخوان نے بالاتفاق فیصلہ کیا کہ مسجد میں پہلی نماز کی امامت میں کراؤں۔ اس فیصلے پر انھوں نے شدید اصرار کیا۔ نیز ان کا یہ اصرار بھی تھا کہ افتتاح بھی میرے ہی ہاتھ سے ہو تاکہ غیر مستحق لالچیوں کی امیدیں اچھی طرح خاک میں ملادی جائیں۔ لیکن استاذ احمد السکری نے جو ان دنوں محمودیہ کے اخوان کے صدر تھے حاضرین کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ وہ یکایک آگے بڑھے اور انھوں نے دروازے پر لگے ہوئے فیتے کو کاٹ دیا اور مسجد کے افتتاح کا اعلان کر دیا۔ اور گھات میں بیٹھے ہوئے طالع آزماؤں کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ اُن کے لیے یہ واقعہ ایک ضرب کاری تھا۔ وہ اس کے مستحق بھی تھے۔ میں نے بھی حاضرین کی حیرت میں اضافہ کر دیا۔ کیونکہ میں نے استاذ حامد عسکریہ کو محراب کی جانب بڑھا دیا تاکہ وہ اس مسجد میں پہلی فرض نماز کی امامت کریں۔ اس مسجد کی تعمیر اور اس منصوبہ کی تکمیل کا سہرا انہی کے سر تھا اور ان کو امام بنا کر ہم نے گویا ان کے احسانات کا اعتراف کیا۔ بہرحال افتتاح کی مہم بھی سرانجام پاگئی۔

اس مسجد کا منصوبہ شہر کے لیے خیر و برکت کا پیغام لے کر آیا اس کے بعد شہر میں اور مساجد کے قیام کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اسماعیلیہ اور عرائشیہ کے نیک نہاد باشندوں میں سے الحاج یوسف اور آل فراج کے اندر بھی شوق و جذبہ نے چٹکی لی اور انھوں نے

شہر کے دوسرے کنارے میں ایک مسجد تعمیر کردی۔ یہ علاقہ مسجد کا انتہائی ضرورت مند تھا۔ بلکہ ان کا عزم وہمت یہاں تک بڑھا کہ وہ اخوان کی مسجد کی مسابقت کرنے لگے۔ وفی ذلك فلیتنافس المتنافسون۔

چنانچہ دونوں مسجدیں ایک ہی تاریخ میں پایۂ تکمیل کو پہنچیں۔ مسجد الحاج یوسف رحمہ اللہ کے افتتاح کے لیے ہمیں بھی دعوت دی گئی۔ بلکہ الحاج یوسف کا اصرار تھا کہ ہم اپنی مسجد سے پہلے ان کی مسجد کا افتتاح کریں۔ حسنِ اتفاق سے افتتاح کے دن جمعۃ المبارک تھا۔ ہم نے نماز جمعہ مسجد الحاج یوسف میں ادا کی اور اسی روز عشاء کی نماز مسجد اخوان میں گزاری۔ یوں ایک ہی دن میں دو فتوحات حاصل ہوئیں۔

اسماعیلیہ کے ایک اور نیک سرشت انسان الحاج محمد جاد اللہ رحمہ اللہ کے اندر بھی شوق نے انگڑائی لی اور وہ بھی ایک اور محلے کے اندر اپنے نام سے ایک تیسری مسجد بنانے کے لیے کمربستہ ہوگئے۔ یہ محلہ بھی عبادت گاہ کا منتظر تھا۔ چنانچہ یہ مسجد بھی بخیر وخوبی اللہ نے مکمل کرادی۔ الحاج مصطفٰے صاحب عرائشیہ کے اندر پہلے ہی ایک مسجد بنا چکے تھے۔ مگر اب وہ اٹھے اور انھوں نے اسی مسجد کی توسیع کا آغاز کردیا۔ اور بہت بڑا رقبہ اس میں شامل کردیا اور بھی کئی لحاظ سے اس کی خوبیوں میں اضافہ کردیا۔ گویا مسجد اخوان نے اسماعیلیہ شہر کے اندر ایسے پاکیزہ منصوبوں کی ایک فہرست کو جنم دے دیا۔

وزیر اعظم صدقی پاشا کا دورۂ سینا

اسی زمانے میں مصر کے وزیر اعظم صدقی پاشا سینا کے دورہ پر نکلے۔ اس دورے کے لیے انھیں اسماعیلیہ ہی سے گزر کر جانا تھا۔ اس خبر کو سُن کر حکومت کی مشینری میں ہلچل مچ گئی۔ اور وزیر اعظم کے استقبال کے لیے تیاریاں ہونے لگیں۔ لوگوں کا انبوہ کثیر ان سے ملنے کے لیے اسٹیشن پر جمع ہوگیا۔ چنانچہ ایک مرتبہ ڈپٹی کمشنر اسٹیشن پر آیا اور اس کے بعد مجسٹریٹ آیا۔ یہ لوگ سوچنے لگے کہ استقبالیہ تقریب میں تقریر کے لیے کسے منتخب کریں۔ معلوم نہیں کس خبیث

نے میرا نام انھیں بتا دیا۔ چنانچہ وہ لوگ یہ کہنے لگے کہ فلاں صاحب جو حکومت کے ملازمین میں سے ہیں استقبالیہ میں تقریر کریں گے۔

مجھے دفتر میں بلایا گیا۔ مجسٹریٹ صابر بک طنطاوی نے اس بارے میں مجھ سے گفتگو کی۔ پولیس افسران اور دوسرے سرکاری حکّام نے بھی اس کی تائید کی۔ مجھے سخت غصّہ آیا۔ میں نے ان سے کہا کہ ابھی ملازمت سے استعفیٰ پیش کرتا ہوں۔ اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ سرکاری ملازم ایک کٹھ پتلی ہے، اسے جیسے چاہا نچایا جائے، تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میری قیمت میرے اپنے ہاتھ میں ہے نہ کہ وزارت تعلیم کے ہاتھ میں۔ میں اپنے آپ کو اس پوزیشن میں رکھنا کبھی گوارا نہ کروں گا۔ میں اس امر سے بھی خوب باخبر ہوں کہ میرے اور وزارت تعلیم کے مابین جو معاہدہ ہوا ہے وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ میں تعلیم و تربیت کے میدان میں زیادہ سے زیادہ بہتر کام کروں۔ اس معاہدے میں یہ کہیں تحریر نہیں ہے کہ وزراء اعظم کی خدمت میں مدحیہ قصائد بھی پیش کیے جائیں۔ اس نوعیت کی ایک لمبی گفتگو ان لوگوں کے ساتھ ہوئی۔ میرے شدید انکار کے سامنے ان کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہٗ کار نہ رہا کہ یہ خدمت سرانجام دینے کے لیے کسی اور نمایاں شخصیت کا انتخاب کریں۔

کینال سوئز کمپنی کی سخاوت

مسجد کی تکمیل سے چند روز پہلے یہ حالت تھی کہ جو کچھ سرمایہ جمع تھا وہ ختم ہوا چاہتا تھا۔ حالانکہ ہمارے سامنے مسجد کی اسکیم کے بعد مدرسہ اور مرکز کا منصوبہ باقی تھا۔ مدرسہ اور مرکز مسجد کا تکملہ تھے۔ بلکہ یہ دراصل پورا منصوبہ ایک ہی تھا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ سوئز کمپنی کا ڈائرکٹر بیرون ڈی بنوا وہاں سے گزرا۔ اس کی معیّت میں اس کا سکریٹری موسیو بلوم بھی تھا۔ بیرون نے مسجد کی عمارت دیکھی اور لوگوں سے اس کے بارے میں پوچھ گچھ کی اور مختصر طور پر اس کی معلومات حاصل کیں۔ میں اسکول میں تھا کہ میرے پاس کمپنی کا ایک ملازم آیا اور مجھے دعوت دی کہ میں کمپنی کے دفتر میں مسٹر بیرون سے ملوں۔ چنانچہ

میں اس کے پاس گیا۔ اس نے ترجمان کے ذریعے مجھ سے بات چیت کی، اور کہا کہ میں نے مسجد کی عمارت دیکھی ہے۔ اور میں چاہتا ہوں کہ آپ کی مدد کروں اور کچھ چندہ پیش کروں۔ اس غرض کے لیے اُسے مسجد کے منصوبے کا نقشہ اور دیگر تفصیلات درکار ہیں۔ میں نے ڈائرکٹر صاحب کا شکریہ ادا کیا اور واپس آگیا۔ اور اس کی خواہش کے مطابق اُسے نقشہ اور متعلقہ تفصیلات بھیج دیں۔

اس بات کو کئی ماہ گزر گئے۔ میں مسٹر بیرون اور اس کا وعدہ قریب قریب فراموش کر چکا تھا۔ ایک روز یکایک مسٹر بیرون کی طرف سے پھر دعوت نامہ آیا۔ میں اس کے پاس گیا۔ اس نے میرا بڑا خیر مقدم کیا اور پھر بتایا کہ کمپنی نے آپ کے منصوبے کے لیے مبلغ پانچسو مصری پونڈ کی منظوری دے دی ہے۔ میں نے اس پیش کش پر مسٹر بیرون کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اُسے سمجھایا کہ یہ رقم بہت تھوڑی ہے۔ کمپنی کی طرف سے اس حقیر رقم کی توقع نہ تھی۔ کیونکہ کمپنی کے خرچ پر ایک طرف ایک مثالی چرچ بنوایا جارہا ہے جس کے مصارف ۵ لاکھ مصری پونڈ بتائے گئے ہیں۔ دوسری طرف مسجد کے لیے صرف پانچ سو مصری پونڈ دیئے جارہے ہیں۔

مسٹر بیرون نے میرے نقطۂ نظر پر صاد کہا اور میری ہمنوائی کی۔ لیکن اس نے کہا افسوس ہے کہ کمپنی کی طرف سے یہی فیصلہ ہوا ہے۔ مجھ سے درخواست کی کہ میں اس رقم کو قبول کرلوں اور وہ مزید رقم کے لیے کچھ کوشش کر سکا تو اس میں ہرگز کوتاہی نہیں کرے گا۔ میں نے دوبارہ شکریہ ادا کیا اور کہا کہ رقم کی وصولی میرا اختیار نہیں ہے۔ یہ ہمارے ناظم مالیات شیخ محمد حسین نسلوط کے فرائض میں سے ہے۔ جس نے تنہا اپنی طرف سے اتنا عطیہ دے دیا تھا جتنا کمپنی پیش کر رہی ہے۔ میں انھیں اطلاع کردوں گا وہ آپ سے یہ رقم وصول کرلیں گے۔ چنانچہ وہ رقم انھوں نے وصول کرلی۔ اس کے بعد نہ مسٹر بیرون ہی نے مزید کوئی کوشش کی نہ ہم نے ان سے کوئی تقاضا کیا۔

غلط مذہب

یہ خبر جب طالع آزما عناصر تک پہنچی تو وہ آپے سے باہر ہو گئے۔ اور اب یہ افواہیں فضا میں پھیلنے لگیں کہ "اخوان المسلمون غیر مسلموں کے سرمائے سے مسجد بنا رہے ہیں"۔ اور ان افواہوں کو مزید ہوا دینے کے لیے ہر طرف سے باطل فتوے صادر ہونے شروع ہو گئے، کہ اس مسجد میں جو غیر مسلموں کے مال سے بنائی جا رہی ہے نماز کیسے جائز ہو سکتی ہے۔ ہم عوام الناس کو سمجھانے بجھانے لگے کہ یہ باتیں فضول اور خرافات ہیں۔ کمپنی کا سرمایہ ہمارا ہے نہ کہ غیر مسلموں کا۔ سوئز ہماری ہے، سمندر ہمارا ہے، زمین ہماری ہے، یہ غیر مسلم غاصب اور لٹیرے ہیں۔ ہماری غفلت کی وجہ سے ہم پر مسلّط ہو گئے۔

چنانچہ بحیثیت ایزدی مسجد مکمل اور "غیر مسلموں کا سرمایہ" مسجد کے کسی حصّہ پر نہ لگا۔ بلکہ یہ رقم اخوان المسلمون کے مرکز پر صرف کی گئی۔ وکان اللہ علےٰ کل شئی قدیرا۔ اس تدبیر سے طالع آزماؤں کا برپا کیا ہوا ہنگامہ اور فتنہ پھر فرو ہو گیا۔ کج نظر مولویوں کی یہی شان ہوتی ہے۔ وللہ فی خلقہ شؤون۔

اسلامی درس گاہ حراء

اللہ تعالےٰ کی مدد و نصرت کی بدولت مسجد کی عمارت کے اوپر مدرسہ کی عمارت قائم کر دی گئی۔ ان دنوں تعلیم و تعلّم کے باب میں ہمیں جو مثالی نمونے پڑھائے گئے تھے میں ان سے نیا نیا واقف ہوا تھا۔ چنانچہ بتو ہاون، استانز، یہ جدورف اور قرون کے اسکولوں کے بانی بستالوزے کی تصویر، جرشم اور کیلہو کے موجد فرو بل کی تصویر اور فن تعلیم میں ہربرٹ اور ہنٹسورے کے نظریات و اسالیب وغیرہ یہ سب تصویریں ذہن کے اندر ابھی تازہ تھیں۔ لیکن ان نظریات اور اسالیب کو ہم نے ایک نئے سانچے میں ڈھال لیا۔ یہ سانچہ ان اسلامی رجحانات سے ماخوذ تھا جو بچپن کی اسلامی تربیت کی بدولت ذہن میں منقّش ہو چکے تھے اور اب تحریکِ اسلامی نے ان نقوش کو مزید اُجاگر کر دیا۔ چنانچہ جونہی مدرسہ کی عمارت مکمل ہوئی

ہم نے اس کے لیے ایک اسلامی نام تجویز کیا : " اسلامی درسگاہ حراء"۔ طلبہ کے لیے ہم نے ایک مخصوص یونیفارم مقرر کردیا۔ ملکی کپڑے کا بنا ہوا جلباب (لمبا کرتہ) اور کوٹ ۔ اور قومی صنعت کی تیار شدہ سفید ٹوپی اور جوتا۔ اس کے اوقات تعلیم بھی دوسرے مدارس سے سراسر مختلف تھے ۔ اور بڑی حد تک اوقاتِ نماز کے تابع تھے ۔ مدرسہ علی الصبح لگ جاتا اور تعلیم کا پہلا دور نمازِ ظہر سے پیشتر ختم ہو جاتا ۔ تمام طلبہ مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتے ۔ اور کھانے کے بعد عصر سے کچھ پہلے واپس آجاتے تاکہ نماز عصر بھی جماعت کے ساتھ پڑھیں ۔

نصاب تعلیم بھی تین اقسام پر مشتمل تھا : پہلی قسم ازہر کے مدارس ابتدائیہ کے نصاب کے مطابق تھی ۔ اور طالب علم ازہر اور دینی درس گاہ کے لیے تیار کیا جاتا تھا۔ دوسری قسم میں دن کے پہلے حصے میں ازہر کے مدارس ابتدائیہ کا نصاب تھا ۔ اور دن کے آخری حصے میں صنعت کاری کی تعلیم ہوتی تھی ۔ دوسری قسم بھی جو دن کے پہلے حصے میں پڑھائی جاتی تھی ازہر کے مدارس ابتدائیہ کے ماتحت تھی ۔ اور دوپہر کے کھانے کے بعد ہی طلبہ شہر میں اخوان المسلمون کے کارخانوں اور ورکشاپوں میں برائے ٹریننگ چلے جاتے تھے ۔ ان کارخانوں کے مالک اخوانیوں نے یہ ذمہ داری لے رکھی تھی کہ وہ ان طلبہ کو صنعتی تعلیم دیں گے ۔ یہ تعلیم درس گاہ حراء کی نگرانی میں ایک مخصوص نظام کے تحت ہوتی تھی ۔

تیسری قسم گورنمنٹ کے پرائمری اسکول کے مطابق تھی ۔ اور اس میں طلبہ کو ثانوی تعلیم اور پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے تیار کیا جاتا تھا۔ طلبہ پر مدرسہ کی جو فیسیں عائد کی گئیں وہ بھی نہایت مناسب اور موزوں تھیں ۔ اور ان میں طالب علم کی ہمت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالا گیا تھا ۔ نیز طلبہ کے سرپرستوں کے حالات کا لحاظ کرتے ہوئے بلا فیس طلبہ کا تناسب بھی بڑھا دیا گیا تھا۔ مدرسہ کے لیے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور فنِ تعلیم کے ماہر اساتذہ کا ایک چیدہ گروہ فراہم کیا گیا۔

" اسلامی درس گاہ حراء " کی طرف خلقِ خدا کا بہت رجوع ہوگیا ۔ اس میں اسالیب تدریس بھی نئے اختیار کیے گئے تھے جو جدید ترین تعلیمی نظریات سے ہم آہنگ تھے ۔ بہت سے

اسباق ایسے ہوتے جو طلبہ کو اسماعیلیہ کے خوشنما پارکوں اور اسماعیلیہ کے زمزم ریز باغات کی چھاؤں میں دیئے جاتے تھے۔ حروفِ تہجی اور مبادیات حساب کو مٹی، پتھر اور کاغذی تراشو کے محسوس پیکروں میں سکھایا جاتا۔ طلبہ کو مکمل آزادی تھی کہ ان کے دل میں جو کچھ ہو، وہ تھک چکے ہوں یا کوئی بوجھ محسوس کرتے ہوں یا کسی سوال سے دوچار ہوں برملا اساتذہ سے اس کا ذکر کردیں۔ شاگرد اور استاذ اور مدرسہ اور گھر کے درمیان تعلقات، باہمی تعاون اور یکسانیت اور محبت پر استوار تھے۔ اسماعیلیہ کے بہت سے نوجوان آج بھی اس درسگاہ کی خوبیوں سے رطب اللسان ہیں۔ اور اس درس گاہ میں طلبہ اور اساتذہ کے مابین باہمی رحمت و شفقت کے جو مظاہر کارفرما رہے ہیں، آج بھی ان کی لذت دلوں میں محسوس کرتے ہیں۔

میرے اسماعیلیہ کو خیرباد کہہ دینے کے بعد یہ درس گاہ اپنی مثالی حیثیت سے ہٹ کر ایک پرائمری اسکول کی شکل اختیار کرگئی۔ وزارتِ تعلیم کی طرف سے اس کی کوئی حوصلہ افزائی نہ کی گئی۔ بلکہ اس کی مخالفت میں محکمہ تعلیم نے سب سے بڑا کردار ادا کیا۔ الحمد للہ الذی یحمد علی کل حال۔ اسی مخالفت کے نتیجے میں یہ مثالی تعلیم گاہ ایک معمولی ابتدائی اسکول بن کر رہ گئی۔

پہلی صورت میں کامیابی کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ دراصل ایسے انسانوں کی نایابی تھی جو اپنے آپ کو ملازمت کے متلاشی سمجھنے کے بجائے ایک مشن کے علم بردار سمجھیں۔ میں تعلیمی ایام کے دوران جب کبھی اپنے ٹائم ٹیبل میں کوئی پیریڈ خالی دیکھتا سیدھا درس گاہ حرا کی جانب چلا جاتا اور وہاں اساتذہ کی موجودگی میں طلبہ کو لیکچر دیتا۔ خود اساتذہ کو بھی ان کے اسباق کے دوران یا اسباق ختم ہو جانے کے بعد طویل و عریض ہدایات اور مشورے دیتا۔ اکثر اساتذہ کے ساتھ اسباق کی تیاری میں شریک ہو جاتا۔ طلبہ کے ساتھ باغات میں چلا جاتا۔ کبھی تنہا۔ کبھی بعض اساتذہ کی مصاحبت میں یا درس گاہ کے منتظمین کی

معیت میں۔ اور تقریباً مغرب تک یعنی دو گھنٹے سے بھی زیادہ طلبہ کے ساتھ وقت گزارتا۔ تفریح کا سماں ہوتا۔ اور میری طرف سے طلبہ کو کھلی اجازت ہوتی کہ وہ جو چاہیں مجھ سے پوچھیں، جدھر گھومنا چاہیں گھومیں، جو کچھ کھیلنا چاہیں اور جس طرح چاہیں باہم مزاح اور خوش گپّی کریں۔ خود میں بھی ان تمام باتوں میں ان کے ساتھ شامل ہوتا۔ یہاں تک کہ ان نوخیز انسانو کی کوئی بات، ان کے اندرونی معاملات یا گھریلو زندگی میں سے مجھ سے مخفی نہ رہتی۔ وہ بھی یہ محسوس کرتے اور میں بھی اسی احساس سے لبریز ہوتا کہ میں اُن کے لیے بمنزلہ والد ہوں یا بمنزلہ برادر بزرگ۔ یہ احساسات میں خود ان کے اندر اُجاگر کرتا تھا اور اساتذہ کو بھی یہ بتانے کی کوشش کرتا کہ انھیں بھی ایسا ہونا چاہیے۔ انھیں یہ محسوس کرنا چاہیے کہ وہ ایک پیغام کے علم بردار ہیں۔ ایک نظریئے کے داعی ہیں اور ایک نسل کے بانی اور مربّی ہیں۔ ان میں سے اکثر کے اندر بالفعل یہ ذوق پروان چڑھ رہا تھا۔ اور اکثر ایسے بھی تھے جن کے لیے یہ سب باتیں صدا بصحرا ہوتی تھیں۔ ہمارا معاشرہ ایسے لوگوں کا شدید محتاج ہے جو جان و دل سے معاشرے کی خدمت کریں نہ کہ جسد و پیکر سے، اپنے ضمیر کے تقاضے کے تحت کام کریں نہ کہ دوسروں کی نگرانی کے خوف سے۔ دل اللہ کے ہاتھ میں ہیں وہ جیسے چاہتا ہے انھیں پھیرتا رہتا ہے۔

شیخ محمّد سعید العرفی

اسلامی درس گاہ حراء کے ذکر کے سلسلہ میں مجھے یہ بھی یاد آیا کہ درس گاہ کا یہ نام ہمارے ایک عالم و فاضل اور مجاہد بھائی شیخ محمد سعید العرفی کا تجویز کردہ تھا۔ موصوف شام کے علاقے دیر الزور کے عالم تھے اور شام کے ایوانِ نمائندگان میں دیر الزور کے ممبر تھے۔ فرانس کے ظلم و استبداد کے خلاف برسرِ پیکار رہے ہیں۔ فرانسیسیوں نے ان کی تمام املاک اور ان کی لائبریری ضبط کر لی تھی۔ اور ان کو جلاوطنی کا حکم دے رکھا تھا۔ چنانچہ وہ مصر آ گئے۔ اور قاہرہ میں انھوں نے محلہ القلعہ، گڑھی سیّدہ عائشہ، ابن یونس

سٹریٹ کے اندر ایک معمولی سا کمرہ کرایہ پر لے لیا اور اس کا نام قصرِ عالی رکھ دیا۔ ان سے ہمارا بھی کسی طرح تعارف ہوگیا۔ چنانچہ ہمیں ان کے اندر دینی صداقت کے ساتھ ساتھ ایمان و یقین کی قوّت، معقولات و منقولات میں وسعتِ نظر، اور شجاعت و بسالت اور عالی ہمّتی نظر آئی۔ وہ عالم بھی تھے اور طبیب بھی، فوجی افسر بھی اور عابد شب زندہ دار بھی۔ انھوں نے اپنے وطن کے جلیل القدر مشائخ سے علم حاصل کیا۔ اور پھر ترکی فوج میں بھرتی ہو گئے۔ اور افسر کے عہدہ تک ترقی پائی۔ فوج کے میڈیکل یونٹ کے ساتھ ان کے مراسم ہو گئے اور انھوں نے علمِ طب سیکھ لیا۔ بہترین نشانہ باز تھے۔ دس راؤنڈ کے اندر دس نشانے لگاتے۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ ایک ادیب اور مورّخ تھے۔ نظم و نثر کے حافظ تھے۔ شیریں زباں تھے۔ ظریف الطبع اور نکتہ سنج تھے۔ حاضر جوابی میں مثال نہ رکھتے تھے۔ عبادت گزاری اور تقشف میں صوفیٔ پاک نفس تھے۔ فکر و نظر نہایت فلسفیانہ۔ ہم نے ان کی صحبتوں سے بہت استفادہ کیا۔ جب وہ اسماعیلیہ آئے تو کئی روز انھوں نے ہمارے ساتھ گزارے جو زندگی کے خوش ترین اور سنہری ایام تھے۔ موصوف کو معلوم ہو گیا کہ ہم ایک مدرسہ قائم کرنا چاہتے ہیں اور اس کے نام کے بارے میں غور و فکر کر رہے ہیں۔ چنانچہ وہ کہنے لگے:

"اسماعیلیہ تحریک کا مرکز ہے، اور یہ پہلی درس گاہ ہے جو تحریک کی طرف سے قائم کی جا رہی ہے۔ تحریک کی دعوت وہی ہے جو قرآن کی دعوت ہے۔ قرآن سب سے پہلے حراء کے اندر نازل ہوا ہے لہٰذا اس مدرسہ کا نام بھی "درس گاہ حراء" رکھ دو۔ شیخ کی تجویز منظور ہوئی اور یہی نام رکھا گیا۔"

شیخ عرفی رات کو زیادہ سے زیادہ چار گھنٹے سوتے تھے۔ فجر سے پیشتر ہی جاگ جاتے اور ہمارے دروازے کھٹکھٹاتے اور یہ صدا دیتے: "ہوش میں آؤ، ہوش میں آؤ، زندگی کے بعد ایک لمبی نیند مل جائے گی، ہمیں اُٹھ کھڑا ہونا چاہیے،

خدا کے حضور سربسجود ہوجانا چاہیے، اس کی حمد بجالائیں اور اس کے انعامات کا شکر ادا کریں۔"

شیخ عرفی فرماتے: "میرے بھائی اسماء والقاب سے نوازو۔"

میں عرض کرتا: "سیّدی کس کو اسماء والقاب سے نوازوں۔"

فرماتے: "اپنے بھائیوں، رفیقوں اور اداروں کو اسماء والقاب سے نوازو۔ فلاں رفیق کو کہو کہ تیرے اندر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ فلاں سے کہو کہ تو عمر رضی اللہ عنہ سے مشابہت رکھتا ہے۔ یہ باتیں ان لوگوں کے اندر غیرت وحمیّت کو انگیخت کریں گی اور انھیں مثالی کردار اور صالح اسوہ کی جانب اکسائیں گی۔

میں عرض کرتا کہ اس طرح لوگ ہمیں اپنی تند و تیز زبانوں کا نشانہ بنائیں گے۔

شیخ کہتے: "تمھیں لوگوں سے کیا واسطہ۔ تم اللہ کے بن کر رہو۔ اور جس بات میں بہتری ہو اُسے کرتے جاؤ۔ اپنے اداروں کو اس طرح کے نام دو، درس گاہ حرا برائے طلبہ۔ امہات المومنین اسکول برائے طالبات، خندق کلب وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح تاریخ کی یہ مبارک یادیں دلوں کے اندر گھر کرتی جائیں گی۔"

مجھ سے ہمیشہ یہ فرماتے: "سنو، اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ تم اپنی تحریک میں ایسے لوگوں کو بھی شامل کرتے جاؤ جو طاعت وعبادت میں کوتاہی کرتے ہیں، یا معمولی گناہوں کی جانب مائل رہتے ہیں بشرطیکہ تم ان کے اندر خوفِ خدا محسوس کرو، نظم جماعت کا احترام اور اطاعت شعاری پاؤ۔ ایسے لوگ بہت جلد تائب ہوجائیں گے۔ دعوت ایک شفاخانہ ہوتی ہے جس میں علاج کے لیے ڈاکٹر اور شفایابی کی نیت سے مریض آتا ہے۔ ان لوگوں پر اپنا دروازہ ہرگز نہ بند کیجیے۔ بلکہ ان کو جس وسیلے سے بھی اپنی جانب کھینچ سکتے ہیں کھینچیے۔ یہی تحریک کا اوّلین مشن ہے۔

البتہ دو قسم کے لوگ ایسے ہیں جن سے سخت اجتناب کی ضرورت ہے۔ انھیں تحریک کے اندر گھسنے کا ہرگز موقع نہ دیں۔ ایک وہ ملحد جس کا کوئی عقیدہ اور نظریہ نہیں ہے۔ خواہ وہ اپنی

راست بازی کا کتنا ہی مظاہرہ کرے۔ اس کے اصلاح یاب ہونے کی کوئی امید نہیں ہے۔ وہ اصل عقیدہ کی روسے ہی کوسوں دور ہے۔ ایسے آدمی سے آپ کس بات کی امید رکھ سکتے ہیں ؟ اور دوسرا وہ زاہد وپارسا شخص جو نظم کا احترام نہیں کرتا اور اطاعت کے مفہوم سے آگاہ نہیں ہے۔ ایسا شخص انفرادی طور پر تو مفید ہوسکتا ہے اور انفرادی طور پر اس کا کام نتیجہ خیز بھی ثابت ہوسکتا ہے۔ لیکن جماعت کے اندر آئے گا تو جماعت کے دلوں میں خرابی پیدا کردے گا۔ اپنے تقوے کے ذریعہ جماعت کو اپنا فریفتہ بنائے گا مگر نظم جماعت کی خلاف ورزی کر کے جماعت میں تفرقہ وانتشار کو جنم دے گا۔ اگر آپ جماعت میں شامل کیے بغیر ایسے آدمی سے استفادہ کرسکیں تو ضرور کریں۔ اپنی صفوں کے اندر اسے لائیں گے تو نظم وضبط بگاڑ اور اضطراب کی نذر ہوجائے گا۔ لوگ جب کسی کو نظم سے باہر نکلا ہوا دیکھیں گے تو یہ نہیں کہیں گے فلاں شخص جماعت سے نکل گیا بلکہ یہ کہیں گے کہ یہ جماعت کج رو ہے۔ لہٰذا آپ ایسے آدمی سے کلیتہً اجتناب کریں۔

یہ بھی فرمایا کرتے کہ عالم دین خیالی دھاگوں سے بندھا ہوتا ہے۔ صرف ایمان ہی مومنین کے سامنے حقائق کا انکشاف کرتا ہے۔ اگر ایمان مضبوط ہوگا تو اہلِ ایمان کمزور و ناتواں ہوکر بھی کامیاب ہوجائیں گے، اور جن لوگوں کا ایمان مضبوط نہ ہوگا وہ پوری استعداد وطاقت کے باوجود شکست کھاجائیں گے۔ گویا زندگی کی جنگاہ میں تحریک کے کارکنوں کے لیے ایمان ہی مضبوط ترین اسلحہ ہے۔

فرماتے : میں تجربہ کرچکا ہوں کہ ہر چیز پر دنیاوی اقبال بھی آتا ہے اور ادبار بھی۔ جب اقبال آتا ہے تو ہر چیز قدموں پر نچھاور ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ ایک بدکار ڈاکو بھی راہ چلتے میرے سامنے آئے گا تو سر تسلیم خم کرے گا، اور جب ادبار کی گھٹا چھا جاتی ہے تو ہر چیز منہ موڑ لیتی ہے۔ حتیٰ کہ میری سدھی ہوئی سواری بھی سرکشی اور عصیان پر اُتر آئے گی۔ گو سرکشی اور عصیان اس کی عادت نہ تھی۔ میں دو مرتبہ مصر آیا ہوں۔ پہلی مرتبہ جب میں آیا تو

میں وہ محمد سعید العرفی تھا جو دیرالزور کی نمایاں شخصیت اور وہاں کا نامور عالم تھا، تمہارے شہر کے اعیان وعظماء نے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر میرا اس قدر پرتپاک استقبال کیا کہ میں اپنے دل میں شرمندہ ہوتا رہا۔ اور دوسری دفعہ جب میں آیا تو میں تھا تو محمد سعید العرفی ہی۔

لیکن اب محمد سعید العرفی کو فرانسیسی استعمار کی طرف سے جلا وطنی کا حکم مل چکا تھا اور وہ مال و دولت اور جاہ و منزلت سے تہی دست ہو چکا تھا۔ اس وقت میں نے اسٹیشن پر ایک شخص بھی ایسا نہ پایا جو میرے لیے انتظار میں کھڑا ہو یا جو بڑھ کر میری خیریت دریافت کرے۔ اس وقت بھی میں شرم کے مارے پانی پانی ہو گیا۔ حالانکہ دوسری مرتبہ میں مواسات و غمخواری کا سخت حاجت مند تھا۔ اور پہلی حالت کی نسبت تپاک و خیر مقدم کا زیادہ حق دار تھا۔ لیکن اللہ تعالےٰ نے اخوان المسلمون کے ساتھ میری شناسائی کی بدولت میرے لیے بہترین ثواب، عظیم ترین نعم البدل اور افضل ترین دلجوئی و مواسات کا انتظام فرما دیا۔

شیخ محمد سعید العرفی بڑے غیور، بے نیاز، دریا دل، عفیف النفس انسان تھے۔ جتنا عرصہ مصر میں قیام پذیر رہے وہ اپنے ہاتھ کی کمائی پر گزر اوقات کرتے رہے۔ کتابوں کی تصحیح کر کے کچھ نہ کچھ آمدنی پیدا کر لیتے تھے۔ کسی شخص سے انھوں نے کبھی مدد یا عطیہ نہیں لیا۔ اپنی ذات پر خرچ کرنے کے بعد ان کے پاس جو کچھ بچ رہتا تھا وہ اخوان المسلمون اور زائرین کی نذر کر دیا کرتے تھے۔ عرصۂ دراز کے بعد وہ شام واپس تشریف لے گئے۔ اور پھر دیرالزور کے حلقے سے پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہو گئے اور اس حیثیت سے وہ تیسری مرتبہ شامی پارلیمنٹ کے ارکان پر مشتمل ایک وفد کے ہمراہ مصر تشریف لائے اور مسئلۂ فلسطین پر ایک پارلیمانی کانفرنس میں انھوں نے شرکت کی۔ مجھے یاد ہے کہ انھوں نے اپنا سامان ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل میں ڈالا اور کچھ دیر کے بعد اخوان کے مرکز میں آگئے۔

سرکاری کام کے دوران تو وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مشغول رہتے، اور جو وقت باقی بچتا وہ ہمارے ساتھ گزارتے، میرا خیال ہے کہ موصوف اب قضاء کے منصب پر فائز ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں ہر حال میں کامیاب فرمائے۔ اور ان کی ذات کو مسلمانوں کے لیے نافع بنائے اور ہمیں خیر و عافیت کی حالت میں ان سے دوبارہ ملائے۔

اسماعیلیہ سے باہر ابوصویر میں دعوت کا آغاز

اسماعیلیہ کے پڑوس میں انگریزی چھاؤنی سے آگے ابوصویر کا اسٹیشن واقع ہے۔ یہ جگہ اسماعیلیہ سے ۱۵ کیلومیٹر کے لگ بھگ دُور ہے۔ یہاں ان مزدوروں کی بہت بڑی تعداد رہائش رکھتی ہے جو ابوصویر کے کیمپوں اور ائرٹریننگ اسکول میں کام کرتے ہیں ان کے ساتھ تاجروں اور کاشت کاروں کی ایک تعداد بھی بستی ہے۔ میں نے ابوصویر کا دورہ کیا۔ اور مجھے خیال ہوا کہ یہاں جماعت کی ایک شاخ کھولنی ہے۔ اس غرض سے میں نے لوگوں کے چہروں کو تاڑنا شروع کیا۔ قہوہ خانوں میں، سڑکوں میں اور دکانوں میں میں لوگوں کو بھانپتا رہا۔ بالآخر شیخ محمد العجرودی رحمہ اللہ کی دوکان پر پہنچ گیا۔ یہ صاحب بڑے پُروقار، باہیبت اور کشادہ ظرف انسان تھے۔ ان میں راست روی بھی تھی اور زبان و بیان کی مہارت بھی۔ میں نے انھیں دکانداری کرتے اور گاہکوں سے گفتگو کرتے ہوئے دیکھا۔ چنانچہ مجھے ان کے اندر خیر کے آثار نظر آئے۔ میں نے انھیں سلام کیا، اور ان کے پاس بیٹھ گیا۔ کچھ اور لوگ بھی ان کے ساتھ دکان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے اپنا تعارف کرایا اور وہ مقصد بھی بیان کر دیا جس کے لیے میں ابوصویر آیا تھا۔ میں نے بتا دیا کہ مجھے آپ کے اندر خیر و صلاح کے آثار نظر آئے ہیں اور آپ ہماری دعوت کا بوجھ اُٹھا سکتے ہیں۔ میں نے اپنی گفتگو کے اندر ان صاحب کی اور ان کے چند ساتھیوں کی توجہ جماعت کے بنیادی نکات کی طرف مبذول کرائی۔ یعنی یہ کہ اسلام کے مقاصد کس قدر عظیم و برتر ہیں۔ اسلام کے احکام و قوانین کس قدر پاکیزہ ہیں۔ مگر ہمارے معاشرے کے اندر کس حد تک

بگاڑ، شر اور بدی پھیل چکی ہے۔

یہ اس بات کا نتیجہ ہے کہ ہم اسلام کے احکام کو پس پشت ڈال چکے ہیں اور اب یہ ہمارا فرض ہے کہ ایک ایسی تحریک برپا ہو جو ان حالات کی اصلاح کرے ورنہ ہم سب گناہ گار ہوں گے۔ اس لیے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور نصیحت وہدایت فرض ہے اور انفرادی طریقے سے اس فرض کی ادائیگی کافی نہ ہوگی۔ بلکہ ایسی رائے عامہ پیدا کی جائے جو اس دعوت کی پشت پناہی کرے۔ نیک نفس لوگوں کی ایک جماعت ہر بستی میں منظم کی جائے۔ جو اس دعوت پر ایمان رکھتی ہو اور اس کے گرد جمع ہو جائے۔ اس جماعت کو ہم "اخوان المسلمون" کا نام دے سکتے ہیں۔

دکان دار اور اس کے ساتھی خوب کان لگا کر میری باتیں سنتے رہے۔ شروع میں وہ صرف یہی سمجھ سکے کہ شاید میں کسی خیراتی انجمن کی دعوت دے رہا ہوں یا میں صرف یہ تقریر ہی کرنا چاہتا تھا جو ان کے سامنے کر دی گئی۔ دکان دار نے بطور مہربانی مجھے دوپہر کے کھانے کی دعوت پیش کی۔ اور قہوہ بھی میرے لیے منگوایا۔ میں نے کھانے کی دعوت سے معذرت کر دی اور پھر اُٹھ کر چلنے لگا۔ مگر اس نے بشدت اصرار کیا کہ میں مسجد کے اندر تقریر کروں یا سمندر کے کنارے ایک چھوٹی سی مسجد کے اندر جہاں لوگ جمع ہو جاتے ہیں مجلس وعظ منعقد کروں۔ میں نے یہ تجویز منظور کی اور لوگ قہوہ خانے میں جمع ہو گئے۔ اور میری تقریر کو بڑے غور سے سنتے رہے۔ اور جو کچھ انھوں نے دیکھا اور سنا اس پر انھیں شدید حیرت تھی۔ وہ انگشت بدنداں تھے کہ ایک وجیہ نوجوان مدرس یوں قہوہ خانوں کے اندر لوگوں کو دینی درس دیتا ہے۔ حالانکہ وہ کسی مسجد کا امام نہیں ہے۔ نہ وہ کوئی پیر اور شیخ طریقت ہے۔ میری گزارشات ان کے لیے بڑی اثر آفرین ہوئیں اور انھوں نے تاکید کی کہ میں دوبارہ یہاں آؤں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

پے در پے دوروں کے بعد معاملہ یہاں تک ترقی کر گیا کہ ایک روز ہم احمد افندی

دسوتی کے مکان پر جمع ہوئے اور ابوصویر میں الاخوان المسلمون کی شاخ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ چھوٹی سی بستی چھوٹی ہونے کے باوجود باہمی رقابتوں اور کینہ توزیوں سے خالی نہ تھی۔ میں یہاں اقامت پذیر نہ تھا اور احمد افندی دسوتی جنھیں شاخ کا صدر چن لیا گیا تھا۔ کوئی صاحبِ علم نہ تھے بلکہ تاجر تھے اور تجارت میں مصروف رہتے تھے۔ وہ مقامی رقابتوں جھگڑوں اور قیل وقال کا سامنا نہ کر سکتے تھے۔ معاملات کو حل کیے بغیر یونہی چھوڑ دیتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ جماعت تتر بتر ہو جاتی یا ہونے کے قریب ہو جاتی۔ اور پھر جب میں دورے پر آتا تو دوبارہ اجتماعیت بحال ہو جاتی۔

آخر کار کچھ اخوان نے جو فہم دعوت سے آشنا ہوتے جا رہے تھے اور دعوت ان کے دلوں میں سرایت کر رہی تھی اور اسماعیلیہ بھی ان کا آنا جانا ہوتا تھا۔ مجھے بتایا کہ تحریک کا بوجھ اور دعوت کی ذمہ داری اٹھانے کے لیے سب سے بہتر کوئی ہو سکتا ہے تو وہ استاذ عبداللہ بدوی ہے جو ابوصویر کے مدرسہ اولیہ کے ہیڈ ماسٹر ہیں۔ اولاً اس لیے کہ صاحبِ علم وفضل ہیں اور ہمیشہ لوگوں کو وعظ و درس دیتے رہتے ہیں۔ ابوصویر کی چھوٹی مسجد میں، بلکہ ہر مکان پر ان کے درس وتدریس کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اور ثانیاً اس لیے کہ وہ یہاں نمایاں مرتبہ و مقام رکھتے ہیں۔ ہر شخص ان کی تعظیم وتکریم کرتا ہے۔ اور ان سے تعلق خاطر رکھتا ہے۔ ثالثاً ان کے پاس وقت بھی ہے۔ مدرسہ کی چھٹی کے بعد ان کے پاس جو فراغت ہوتی ہے وہ فراغت تاجروں اور کاریگروں کو میسر نہیں ہوتی۔

اخوان کی یہ رائے مجھے بہت پسند آئی۔ میں ابوصویر گیا اور شیخ عبداللہ بدوی سے ملا۔ اور میں نے انھیں وہی کچھ پایا جو لوگ ان کے بارے میں کہتے تھے۔ بلکہ اس سے بھی برتر۔ الحمدللہ رب العالمین۔ مجھے یہ دیکھ کر بھی خوشی ہوئی کہ وہ بڑے باخبر آدمی ہیں۔ ان کے درسوں کا سلسلہ بھی جاری ہے، بڑی مضبوط شخصیت کے حامل ہیں۔ فکر نہایت صحت مندانہ اور متوازن ہے۔ میں نے اپنی ضرورت ان کے سامنے بیان کی۔ انھوں نے اس ذمہ داری کو قبول کرنے میں بہت

تامّل کیا۔ مگر میرے اصرار کے بعد وہ اس شرط پر رضا مند ہو گئے کہ انھیں یہ آزادی ہونی چاہیے کہ وہ شاخ کی تشکیل اُن اساتذہ سے کریں جو ان کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ اور وہ تمام اساتذہ ان سے محبّت کرتے ہیں۔ اور ان سے بڑے اخلاص و احترام سے پیش آتے ہیں۔ اور اس شاخ میں وہ ایسے دوسرے مقامی باشندے بھی داخل کریں گے جن کے اندر انھیں فہم و فراست نظر آئے گی۔ چنانچہ میں نے ان کا مطالبہ قبول کر لیا۔ انھوں نے اس کام کو بڑی محنت سے شروع کر دیا اور اس کے لیے وہ خوب کمربستہ ہو گئے۔ اللہ تعالےٰ نے بھی انھیں کامیابی بخشی۔ اور ان کی قیادت میں اس بستی کے اندر ہماری نہایت مضبوط شاخ وجود میں آگئی۔

ابوصویر میں اخوان کی مسجد

اس وقت تک ابوصویر میں ایک ہی مسجد تھی۔ مسجد الحرون، یہ نمازیوں کے لیے تنگ تھی۔ نہر اسماعیلیہ کے کنارے بھی ایک چھوٹی سی مسجد تھی۔ وہ بھی جمعہ کے اجتماع کے لیے کافی نہ تھی۔ ایک تیسری نامکمل مسجد تھی جسے شیخ ابراہیم ابوحرش نامی ایک صاحب نے بنوایا تھا۔ یہ صاحب بستی سے دور رہتے تھے اور مسجد کے ساتھ ان کا کوئی لگاؤ نہ تھا۔ اس لیے مسجد ایسی حالت میں نہ تھی کہ وہاں شعائر و عبادات قائم کیے جا سکیں۔ شیخ عبداللہ بدوی نے اس مسجد پر قبضہ کی ٹھانی، اور اسے الاخوان المسلمون کا مرکز بنانے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ انھوں نے شیخ ابراہیم سے بات چیت کی اور ان کی رضامندی حاصل کر لی۔ مسجد کی مرمت کا کام شروع کر دیا گیا اور آج وہ ایک عظیم الشّان مسجد بن چکی ہے۔

اخوان کا ایک کلب بھی اس کے ساتھ ملحق ہے۔ ان کے اجتماعات اسی مسجد میں ہوتے ہیں۔ مسجد کے سامنے ایک کشادہ میدان ہے جہاں اخوانی اسکاؤٹس کو تربیت دی جاتی ہے۔ اور گرمیوں کی چھٹیوں میں وہاں تقریروں اور درسوں کا غلغلہ رہتا ہے۔ چنانچہ یہ مسجد ایک نہایت نافع ادارہ بن چکی ہے جہاں سے رشد و ہدایت کی شعاعیں پھوٹتی ہیں۔ اس بقعۂ مبارکہ میں ہم نے تحریک کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ شیخ عبدالازہری کو ہم نے یہاں

کچھ عرصہ کے لیے بھیجا۔ شیخ عبدالازہری ان طلبہ میں سے تھے جنہوں نے ازہر کی زندگی کو نہایت عمدہ طریقے سے گزارا تھا۔ انھوں نے وہاں قرآن مجید بطریق احسن حفظ کرلیا تھا۔ یہ اسماعیلیہ آ گئے اور الاخوان المسلمون میں شامل ہو گئے۔ اور اخوان کے مرکز میں کلرک کے طور پر ملازم ہو گئے۔ قرآن کے قاری تھے اور نماز اور خطابت کی ذمہ داری خوش اسلوبی سے سرانجام دے سکتے تھے۔

ہم نے تجویز کیا کہ ابوصویر کے مرکز میں امامت وخطابت اور وعظ اور دفتری نظم، یہ تمام کام ان کے سپرد کر دیئے جائیں۔ معاوضہ انھیں اسماعیلیہ سے بھیجا جائے گا۔ کیونکہ اسماعیلیہ ہی تحریک کا گہوارہ اور مطلع ہے۔ اور ابوصویر کی شاخ ابھی نوخیز ہے۔ اور لوگ ہر اس شخص سے بدک جائیں گے جو ان سے آتے ہی بڑی مقدار میں مالی امداد طلب کرے گا۔ دعوت و تحریک کے بارے میں یہی سنتِ الٰہی ہے کہ مالی مطالبات سے پرہیز کیا جائے۔ اصحابِ دعوت لوگوں سے کوئی معاوضہ یا اجر نہ مانگیں۔ اور اگر وہ مانگیں گے تو لوگ بخل دکھائیں گے اور پھر دعوت کے لیے ان کے سینے تنگ ہو جائیں گے۔ البتہ جب ان کے دلوں میں ایمان اچھی طرح راسخ ہو جائے تو پھر وہ رضاکارانہ طور پر خوشی خوشی نہ صرف اپنا مال خرچ کرتے ہیں بلکہ اپنی جانیں تک نچھاور کرنے لگتے ہیں۔

ابوصویر میں شیخ عبداللہ بدوی کی قیادت میں دعوت کے آغاز کے لیے شیخ عبدالازہری کا وجود دعوت کی جڑیں گہری کرنے میں بہت ممد ثابت ہوا۔ اور یہ بات ہمارے لیے بھی یک گونہ اطمینان کا باعث بنی۔

پورٹ سعید میں دعوت کا آغاز

اسماعیلیہ میں احمد افندی مصری ایک نوجوان تھا۔ اس کی عمر ۱۷ یا ۱۸ برس تھی۔ پورٹ سعید کا رہنے والا تھا۔ اپنے کچھ کاموں کے سلسلے میں عارضی طور پر اسماعیلیہ میں مقیم تھا۔ اسماعیلیہ میں اس نے طویل عرصہ گزارا۔ اس دوران وہ الاخوان کے مرکز میں آمد و رفت رکھتا رہا، اور

وہاں جو تقریریں کی جاتیں یا ہدایات جاری کی جاتیں انھیں وہ سنتا رہتا۔ تھوڑی ہی مدت کے بعد اس نے باقاعدہ بیعت کرلی اور جماعت میں شمولیت اختیار کرلی۔ اور اخوان کے اس گروہ میں شامل ہوگیا جو دعوت کے لیے مخلص ترین تھا اور دعوت کے فہم و ادراک میں پیش پیش تھا۔ اسماعیلیہ میں اس کا مشن ختم ہوگیا اور وہ اپنے اصل وطن پورٹ سعید واپس چلا گیا۔ اپنے ساتھ دعوت کی روشنی بھی لے گیا۔ بے شک دعوت کی مثال اس پاکیزہ و صالح بیج کی ہے جو جہاں بویا جائے گا بارآور ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ومثل كلمة طيبة كشجرة طيبة اصلها ثابت وفرعها

فى السّماء تؤتى اكلها كل حين باذن ربها۔ (ابراہیم ۲۱)

پورٹ سعید میں اخ احمد افندی مصری کے نیک نہاد احباب اور وہاں کے پاکیزہ نفس نوجوانوں کا ایک گروہ ان کے گرد جمع ہوگیا۔ اور وہ لوگ دعوت سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوگئے۔ اخ احمد کی پُرشکوہ شخصیت، گہرا ایمان، کریمانہ اخلاق اور راہ دعوت میں بیش بہا قربانیاں اس بات کا اوّلین محرک تھا کہ اُن کے دوست جو دعوت کو سمجھ چکے تھے اور دعوت پر ایمان لا چکے تھے ان کی قیادت پر متفق ہوگئے، اور انھیں اپنا محور تسلیم کرلیا۔

اخوان کی شاخ پورٹ سعید میں قائم ہوگئی۔ شاخ کا اجتماع پورٹ سعید کے اندر جگہ جگہ پھیلے ہوئے زاویوں اور تکیوں میں سے کسی زاویہ اور تکیہ میں ہوجاتا۔ مغرب کی نماز یا عشاء کی نماز کے بعد لوگ جمع ہوتے۔ وہ اس نئی دعوت کے حالات اور تقاضوں پر مذاکرات کرتے۔ اخ حسن افندی نے مجھ سے مطالبہ کیا کہ میں پورٹ سعید میں ان نئے حضرات سے آکر ملوں۔ میں اس دعوت نامے پر بہت مسرور ہوا۔ اور اپنی اوّلین فرصت میں میں نے ان لوگوں سے جاکر ملاقات کی۔ ایک معمولی درجے کے زاویئے کے اندر بیٹھ کر ہم نے پورٹ سعید کے نوجوانوں کی ابتدائی جماعت سے اس امر پر بیعت کی کہ وہ دعوت کے راستے میں جہاد جاری رکھیں گے یہاں تک کہ دو نتیجوں میں سے ایک نتیجہ برآمد ہوجائے۔ اللہ تعالیٰ اس دعوت کو غلبہ

عطا فرما دے یا ہم اسی راہ میں ملیا میٹ ہو جائیں۔

بعد میں اخوان کو خیال ہوا کہ وہ اپنے لیے ایک مخصوص جگہ کا بندوبست کریں۔ اس خیال کو انھوں نے عملی جامہ پہنا دیا۔ اور شارع المنشیا میں ایک معمولی سی جگہ کرائے پر لے لی جہاں اپنی برانچ قائم کرلی۔ یہی جگہ پورٹ سعید میں دارالاخوان کے نام سے معروف ہوئی۔ جو عطیات جماعت کے لوگوں سے وصول ہوتے تھے وہ ایک مستقل اور جداگانہ دفتر کی ضروریات پوری نہ کرسکتے تھے۔ اور اخوان کا یہ طے شدہ ضابطہ تھا کہ وہ لوگوں سے مالی اعانت طلب نہیں کرتے تھے۔ بلکہ یہ انتظار کرتے تھے کہ لوگ ان کی دعوت کو دامن دل میں جگہ دیں اور اس کی راہ میں از خود ان کے اندر مالی قربانی کا احساس پیدا ہو۔ اخوان جویائے قلوب تھے جویائے جیوب نہ تھے۔ چنانچہ اسماعیلیہ نے جو تحریک کا گہوارہ تھا یہاں کے مصارف میں ایک حصہ کا ذمہ لے لیا۔ اور پورٹ سعید کے فاضل اخوان اپنے عطیات سے جو ضرورت پوری نہ کرسکتے تھے وہ ضرورت اسماعیلیہ پوری کردیتا تھا۔

پورٹ سعید میں جب اخوان کے حالات میں استقرار و ثبات پیدا ہوگیا تو انھوں نے فیصلہ کیا کہ اب وہ اپنی دعوت کو کھلم کھلا لوگوں تک پہنچائیں گے، اور پورٹ سعید کے عوامی حلقوں کے سامنے اُسے پیش کریں گے۔ میری یادداشت کے مطابق انھوں نے ماہ محرم ۱۳۴۹ھ کے موقع سے فائدہ اُٹھایا اور ایک اجتماعِ عام کا اعلان کردیا۔ یہ اجتماع انھوں نے اپنے نئے مرکز کے سامنے شامیانوں کے اندر منعقد کیا۔ اجتماع میں اسماعیلیہ اور پورٹ سعید کے اخوانی رہنماؤں نے تقریریں کیں۔ موضوع تھا ہجرتِ نبوی ؐ۔ پورٹ سعید کے اندر علم اور اہلِ علم کے ساتھ محبت کی فضا پائی جاتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت وسوانح کے بیان اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت و عشق کے لیے جو محفل بھی منعقد کی جائے لوگ اس میں شوق و ذوق سے حصہ لیتے ہیں۔ لوگ اخوان کی دعوت سے سراسر ناواقف تھے اور خود اہلِ دعوت سے بھی

پوری طرح متعارف نہ تھے۔ لیکن بایں ہمہ اس محفل میں جوق در جوق آئے۔ اخوان کا یہ پہلا اجتماع تھا۔ یہ اجتماع نہایت پُرلطف اور خوش گوار بن گیا اور حاضرین کی تعداد بھی بہت ہو گئی۔ اجتماع کے روز اچانک میری طبیعت خراب ہو گئی، اور میں گلے کی شدید سوزش میں مبتلا ہو گیا۔ اسماعیلیہ سے پورٹ سعید تک میں نے ضعف کی وجہ سے لیٹ کر سفر کیا۔ ڈاکٹر محمود دبک صادق رحمہ اللہ نے ——— جو اسکول کے ڈائرکٹر تھے ——— میری حالت دیکھ کر کہا:
اگر آپ نے آج دن کو سفر کیا، اور رات کو تقریر کی تو آپ اپنی جان پر ظلم ڈھائیں گے۔ تقریر تو آپ کسی صورت میں بھی نہیں کر سکیں گے۔ اس کے باوجود میں نے سفر کا عزم صمیم کر لیا۔ ٹرین سے اُتر کر میں سیدھا دارالاخوان پہنچا۔ خستگی کی وجہ سے مغرب کی نماز میں نے بیٹھ کر ادا کی۔ نماز کے بعد مجھ پر ایک عجیب نفسیاتی کیفیت طاری ہو گئی۔ میں نے سوچا کہ پورٹ سعید کے اخوان اپنی اس محفل پر کس قدر شاداں و فرحاں نظر آرہے ہیں اور کیا کیا امیدیں اس محفل پر انھوں نے لگا رکھی ہیں۔ اور کس طرح اپنا پیٹ کاٹ کر انھوں نے اس کے مصارف جمع کیے ہیں اور لوگوں کو شرکت کی دعوت دینے کے لیے انھوں نے کس طرح جانفشانی دکھائی ہے۔ اس سب کے بعد کیا اس کا انجام یہ ہے کہ اصل مقرر تقریر کرنے سے معذرت کر رہا ہے ہے!۔

میں نے جب ان پہلوؤں کا تصوّر کیا تو میں وفورِ جذبات سے رو پڑا۔ اور ایک گہرے تاثر میں ڈوب کر عجیب محویت و استغراق کے عالم میں نماز عشاء تک اللہ تعالیٰ سے صحت و طاقت کے لیے گریہ زاری کرتا رہا۔ چنانچہ اسی دوران میں نے اپنے اندر یکایک کچھ تازگی محسوس کی۔ اور عشاء کی نماز کھڑے ہو کر پڑھ لی۔ اجتماع کا وقت ہو گیا۔ قرآن کریم کی تلاوت سے کارروائی کا آغاز ہو گیا۔ میں تقریر کے لیے کھڑا ہو گیا۔ جب میں نے آغاز کیا تو یہ حالت تھی کہ اپنی بات خود مجھے بھی سنائی نہ دے رہی تھی۔ مگر یکایک ایک حیرت انگیز طاقت میرے اندر سرایت کر گئی۔ گویا مجھے مکمل شفا مل چکی تھی۔ اور میری آواز عجیب و غریب حد تک صاف اور واضح اور گرجدار ہو چکی تھی۔ شامیانے کے اندر بیٹھنے والے بھی سُن رہے تھے اور باہر والے بھی۔

ان دنوں لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کا رواج شروع نہ ہوا تھا۔ آواز اتنی سریلی ہو چکی تھی کہ خود مجھے اپنی ذات پر اب رشک آرہا تھا۔ اس طرح یہ محفل بہتر طور پر اختتام پذیر ہوگئی۔ میری یہ تقریر تقریباً دو گھنٹے سے بھی زیادہ دیر تک جاری رہی۔ یہ اللہ کا فضل واحسان اور کرم و لطف ہے کہ گو اس مرض کا دورہ مجھے ہر سال لاحق ہوا کرتا تھا مگر اس مبارک رات کے بعد مجھے زندگی میں پھر کبھی یہ مرض نہیں ہوا، الّا یہ کہ جب سخت جاڑا ہو اور غیر معمولی محنت ومشقّت کا سامنا ہو۔ یہ صحت مند تبدیلی میرے اعتقاد میں پورٹ سعید کے اخوان کے اخلاص و برکت کا نتیجہ ہے کہ انھیں دعوت کے ساتھ سچّا عشق ہے۔ اور اسے لوگوں تک پہنچانے کے لیے وہ مرتبۂ فنا تک پہنچ چکے ہیں۔

پورٹ سعید متواتر دعوت کے میدان میں پیش قدمی پر پیش قدمی اور کامیابی پر کامیابی حاصل کر رہا ہے۔ اب اخوان کی وہاں چار مضبوط شاخیں کھل چکی ہیں اور ایک کھیلوں کا میدان ان کے پاس ہے۔ اور اس سرحدی شہر کے چیدہ نوجوانوں میں سے صادق الایمان مجاہدین اور فعّال وسرگرم اصحاب کی بہت بڑی تعداد حلقہ بگوشِ دعوت ہو چکی ہے۔

البحر الصغیر میں دعوت کی اشاعت

پورٹ سعید کے ایک تحریکی اجتماع میں بحر صغیر کے علاقہ الجمالیہ کے باشندوں کا ایک وفد شریک ہوا۔ وفد میں اخ محمود افندی عبد اللطیف، الجمالیہ کے ایک نوجوان بھی تھے۔ اخ عمر غنام وقہلیہ کی سنگر کمپنی کے ایجنٹ بھی تھے۔ ان کی یہ شرکت کسی پروگرام کے تحت نہ تھی۔ اجتماع کی کشش پر وہ آگئے۔ اور اجتماع کی عام تقریر انھوں نے سُنی۔ اجتماع کے بعد وہ رُک گئے۔ اور تحریک کے مقاصد اور بنیادی نکات پر بحث و مباحثہ کرنے لگے۔ اور پھر وہ اس عزم کے ساتھ واپس لوٹے کہ وہ اپنے علاقے بحر صغیر میں بھی اس کارِ عظیم کو سرانجام دینے کی ذمہ داری اُٹھائیں گے۔ چنانچہ زیادہ مدّت نہ

گزری کہ ان کی طرف سے ہمیں پے در پے خطوط ملنے شروع ہو گئے۔ اور آخر کار بحر صغیر کے علاقہ المنزلہ میں اخوان کی ایک شاخ کھل گئی۔ اس کے صدر استاذ جلیل شیخ مصطفےٰ الطیر منتخب ہوئے۔

شیخ موصوف ازہر کے فارغ ہیں۔ اور آج کل قاہرہ کے اسلامک انسٹی ٹیوٹ میں معلّم ہیں۔ اس کے بعد الجمالیہ میں آل عبداللطیف کے مکان پر ایک اور شاخ قائم ہوگئی۔ ایک تیسری شاخ جو جدیدۃ المنزلہ کے نام سے مشہور ہے آل طویلہ کے مکان پر کھول دی گئی۔ الغرض وطن عزیز کے اس محبوب حصّے میں بھی قافلۂ دعوت پورے جوش و خروش سے رواں دواں ہوگیا۔

اسماعیلیہ میں میں نے اپنے آخری ایام میں پورٹ سعید کے راستے سے بحر صغیر میں اخوان کی شاخوں کا دورہ کیا تھا۔ یہ دورہ بڑی خیر و برکت کا باعث ہوا۔ اس سے دلوں کے اندر کامیابی کی عظیم الشان امید اُبھر آئی۔ ایک لطیفہ یہ ہوا کہ میں مطریہ گیا۔ وہاں المنزلہ کے ممتاز لوگوں کی ایک جماعت میرے استقبال کے لیے موجود تھی اور جب لوگ مجھ سے ملتے تو ان کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ پھیل جاتی۔ جب ہم المنزلہ پہنچ گئے اور دارالاخوان میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ دارالاخوان استقبال کے لیے آنے والے علماء و فضلاء اور اعیان و معززین سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ اہل علم و اصحاب جاہ کے علاوہ عام باشندوں کا جمِ غفیر بھی موجود تھا۔ وہاں بھی مجھے دیکھ کر لوگ ایک معنی خیز مسکراہٹ کا مظاہرہ کرتے۔ میں نے شیخ مصطفےٰ الطیر سے تنہائی میں پوچھا کہ یہ لوگ کیوں مسکراتے ہیں؟۔

شیخ نے کہا: اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ ان لوگوں کے تصوّر کے بالکل برعکس نکلے ہیں۔ وہ اس امر کے منتظر تھے کہ حسن البنّا نام کے ایک بارعب، عظیم الجثّہ، سن رسیدہ اور پرشکوہ چہرے والے مولانا سے ملیں گے۔ مگر وہ کیا دیکھتے ہیں کہ یہ تو ایک چھوکرا ہے جس کی عمر بمشکل ۲۵ سال ہے۔ پھر شیخ مصطفےٰ الطیر نے یہ بتانے کے بعد کہا کہ اب ہمیں چاہیے کہ لوگوں

کا اطمینان واعتماد بحال کریں۔ اور ان کو قائل کرنے کے لیے آج رات جتنی زیادہ سے زیادہ کوشش سرانجام دی جا سکتی ہے، دیں۔

میں نے کہا: برادرم، توفیق اور کامیابی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ صرف اللہ کی ذات ہی سے نصرت وتائید مل سکتی ہے۔ اگر وہ کسی بھلائی کا فیصلہ فرما لیتا ہے تو اسے کر گزرتا ہے۔ انسان جسم کے دو چھوٹے سے حصّوں کا نام ہے: ایک زبان اور دوسرا دل۔ اور مومن کا دل رحمٰن کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہے۔ وہ جیسے چاہتا ہے اسے پھیرتا رہتا ہے"۔ میرے ساتھ اس سفر میں برادر جلیل حامد عسکریہ رحمہ اللہ تھے۔ میں نے کہا: " ان کا وجود بابرکت ہے۔ اس کمی کو وہ پورا کر دیں گے، اور خدا نے چاہا تو صورتِ حال کو درست کر لیں گے۔

شام کو میں نے جلسہ میں خطاب کیا۔ جلسہ گاہ جو شامیانوں کے اندر تھی اس قدر کھچا کھچ بھری ہوئی تھی کہ حد نظر تک انسان ہی انسان دکھائی دے رہے تھے۔ تقریر کے اختتام پر بہت سے لوگ میرے پاس آئے اور انھوں نے واشگاف طور پر مجھ سے اپنے جذبات بیان کیے اور کہنے لگے کہ تقریر سے پہلے تک تو یہی خیال تھا کہ وہ ظاہر کے لحاظ سے ایک وجیہ شیخ کو دیکھیں گے، مگر اب انھوں نے ایک حقیقی شیخ دیکھا ہے۔ یہ تاثر اللہ کا ایک فضل ہے۔

بعد میں اس علاقے کے اندر ہمارے بارہا دورے ہوتے رہے۔ جگہ جگہ جماعت کی شاخیں کھُل گئیں جن کی نگرانی کے لیے اللہ تعالیٰ نے نیک انسانوں کا جم غفیر مہیا فرما دیا۔ مطر بیں، میت خبفر بیں، میت البصراط، میت سلسیل بیں، برمبال القدیمہ بیں، میت عاصم بیں، کفر جدید میں ان تمام جگہوں پر ہماری شاخیں وجود میں آگئیں۔ اس علاقے میں دو آبادیاں تو پوری کی پوری اخوان پر مشتمل ہیں۔ ایک المنزلہ اور دوسرا میت عاصم۔ جن نمایاں حضرات اور خاندانوں سے ہمارا تعارف ہوا ان میں ڈاکٹر حلمی الجیار اور آلِ سویلم (برمبال)

اور آل قدلح (میت سلسیل) اور آل الهواری (کفر جدید) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان سب حضرات نے ہماری دعوت کو پسند کیا۔ اس کی حوصلہ افزائی کی اور آج تک اس کی پشت پناہی کرتے چلے آرہے ہیں۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ۱۹۳۲ء میں عیسائی مبلغین کی سرگرمیوں کے توڑ میں جو مہم جاری کی گئی تھی اس کی پہلی چنگاری درحقیقت المنزلہ ہی میں بھڑکی تھی۔ اس کے بعد پورٹ سعید میں وہ مزید شعلہ بار ہوگئی، اور پھر وہاں سے ملک کے متعدد حصّوں میں پھیل گئی۔ اس مہم کا نیتجہ یہ ہوا کہ خود مسلمانوں کی طرف سے بھی پھر کئی یتیم خانے اور شفاخانے اور دوسرے خدمت خلق کے ادارے وجود میں آگئے۔ یہ ادارے اب تک قائم ہیں۔

سویز میں دعوت کی تاریخ

میں سوئز کے مختصر دورے پر گیا۔ پیشِ نظر یہ تھا کہ استاذ سیّد محمد الحافظ التیجانی سے ملاقات کروں اور وہاں کے دیگر احباب اور مدرسین کو بھی دیکھوں۔ ان دنوں شرعی عدالت کے قاضی استاذ شیخ محمد ابو السعود بھی وہاں ہی ہوتے تھے۔ اور انھوں نے وہاں نہایت عمدہ ایک عملی اور علمی تحریک برپا کر رکھی تھی۔ ان کی محفل میں اہلِ علم جمع ہوتے تھے جو باہم تبادلۂ خیال کرتے اور ذکر و فکر میں منہمک ہوتے اور لوگوں کو وعظ و نصیحت کا فرض بھی ادا کرتے رہتے۔ میں ان کی محفل میں حاضر ہوا۔ یہ محفل مسجد الغریب میں منعقد کی گئی تھی۔ میں نے بھی بعض ائمہ اور علماء سے اپنی دعوت کے بارے میں گفتگو کی۔ وکیل شرعی محمد الہادی عطیہ اور ان کے گہرے دوست محمد حسن السیدؒ سے بھی راہ چلتے ملاقات ہوگئی۔ اور ان سے بھی دعوت کے بارے میں ایک مختصر سی گفتگو رہی۔ مجھے اندازہ ہوگیا کہ دعوت کے لیے ان حضرات کے اندر اس وقت بہت اچھی آمادگی پائی جاتی ہے۔ دوسری بار پھر مجھے سوئز کے دورہ کی دعوت دی گئی۔

چنانچہ میں گیا اور مذکورہ دونوں حضرات اور ان کے ساتھ استاذ محمد طاہر منیر اخ

شیخ عبدالحفیظ اور اخ شیخ عفیفی الشافعی عطوہ سے ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات کا نتیجہ یہ ہوا کہ اربعین کے اندر اخوان کی ایک شاخ قائم ہوگئی۔ جس کے صدر شیخ عفیفی الشافعی مقرر ہوئے۔ اس کے بعد دعوت کو برابر فروغ ملتا رہا۔ یہاں تک کہ اس علاقے کے اندر ایک سے زائد شاخیں کھل گئیں۔ اور اخوان کا ایک عظیم الشان مرکز اور ایک عظیم الشان عمارت قائم ہوگئی۔ بحر احمر کے تمام قصبوں مثلاً غردقہ، راس غارت، قصیر، سفاجہ وغیرہ میں شاخیں قائم ہوگئیں۔ اور یہ سب سوئز کے مرکز کے تابع ہیں۔ ان علاقوں میں پاکباز و نیک نفس انسانوں کا ایک چیدہ گروہ دعوت کے گرد جمع ہوچکا ہے۔

مجھے سوئز کی "شبِ بوریا" کبھی فراموش نہ ہوسکے گی۔ مرحوم حسن افندی، اللہ ان پر رحمت کی بارش کرے اور ان کے لیے جنت کو وسیع تر فرمائے، کے مکان کے سامنے ہم بوریا پر بیٹھے تھے۔ اور ایک نہایت پُرسکون علمی بحث رات کی خاموش فضا میں چھڑی ہوئی تھی۔ اور مختلف علوم و فنون کے بارے میں نہایت دقیق اور پیچیدہ سوالات زیر گفتگو آرہے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ اخ شیخ عبدالحفیظ سورۂ ص کی ایک آیتِ کریمہ میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے اس قول کے بارے میں سخت اشکال میں مبتلا تھے۔

" قال ربّ اغفر لی وھب لی ملکا لا ینبغی لاحد من بعدی انك انت الوھاب "

" سلیمانؑ نے کہا: اے پروردگار مجھے معاف فرما اور مجھے ایسا ملک عطا کر جو میرے بعد کسی اور کو مناسب نہ ہو۔ بے شک تو ہی عطا فرمانے والا ہے "

شیخ عبدالحفیظ کہنے لگے: اس آیت میں مغفرت کا سوال کیا گیا ہے جس میں قصور کا احساس جلوہ فرما ہے اور سلطنت کا سوال بھی کیا گیا ہے جس میں یہ احساس کارفرما ہے کہ گویا انھیں خدا کی رضا اور خوشنودی حاصل ہے۔ یہ دونوں احساسات کیسے اکٹھے وارد ہوسکتے ہیں

اور ایک ہی شخص سے ایک ہی حالت میں کیسے صادر ہو سکتے ہیں ؟"

اس اشکال کا میری طرف سے یہ جواب دیا گیا : حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا تھا کہ اس رات میں اپنی تمام بیویوں پر گردش کروں گا ۔ ان میں سے ہر ایک کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوگا جو خدا کا عبادت گزار ہوگا اور سلطنت کے دائرے کو وسیع کرنے اور اسلامی اقتدار میں اضافہ کرنے کے لیے مددگار ہوگا ۔ حضرت سلیمان علیہ السلام اس گھڑی گویا صرف اسباب پر اکتفاء کر رہے تھے ۔ چنانچہ اس رات صرف ایک عورت کو حمل ٹھیرا ۔ اور اس کے ہاں بھی جو لڑکا پیدا ہوا وہ ناکارہ تھا ۔ دایہ نے پیدائش کے بعد اسے ناقص الجسم سمجھ کر حضرت سلیمانؑ کی کرسی پر لاکر ڈال دیا ۔ چنانچہ حضرت سلیمان کو فوراً یاد آیا کہ انھوں نے سلطنت کی توسیع و استحکام کے لیے اولاد سے مدد حاصل کرنا چاہی تھی ۔ حالانکہ سلطنت خداوند تعالےٰ کا ایک عطیہ تھی ۔ وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے عطا کرتا ہے ۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے سابقہ احساس سے اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کی ۔ اور پھر اللہ تعالےٰ سے تمام واسطوں کے بغیر سلطنت کی درخواست کی اور یہ فرمایا کہ صرف تو ہی عطا کرنے والا ہے ۔ ایسی سلطنت کا سوال کرنا دراصل اس احساس سے برأت کی توثیق تھی جو ان کے لیے آزمائش کا موجب بن گیا تھا ۔ خاکسار کا یہ جواب تمام حاضرین کو پسند آیا ۔

یہ علمی و فکری بحث دیر تک جاری رہی اور اس کا اختتام ایک عجیب روحانی کیف پر ہوا ۔ نسیم سحری کے دل آویز جھونکے شروع ہو گئے ۔ اور ہر شخص اپنے پروردگار سے سرگوشیوں میں مصروف ہو گیا ۔ کوئی زار زار رو رہا تھا ۔ کوئی توبہ و انابت کے لیے سراپا قلق تھا ۔ اور کوئی دعا و استغفار میں محو تھا ۔ اسی حالت میں سپیدۂ سحر نمودار ہو گیا ۔ ہم سب نے تجدید توبہ کی ۔ عہد و میثاق کو مزید مستحکم کیا اور رشتۂ وفا سے وابستگی کو پختہ تر کیا ، اور پھر نماز صبح ادا کی ۔ اور یہ اللہ کا فضل تھا کہ اس رات جن دوستوں نے پیمان بیعت باندھا تھا وہ اس پر قائم رہے ۔

فمنهم من قضى نحبه ومنهم من ينتظر وما بدلوا تبديلا ۔ (الاحزاب ۲۳)

"ان میں سے کچھ اپنی نذر پوری کر چکے ہیں اور کچھ وقت آنے کے منتظر ہیں۔ اور انھوں نے اپنے عزم میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔"

"شجر حنا کی ٹہنی" بھی مجھے فراموش نہ ہوگی۔ ایک مرتبہ میں سوئز کے دورے پر گیا اور سوئز کے اخوان میں سے ایک رفیق کے گھر اُترا۔ کمرے کے اندر میز پر فیروز آبادی کی سفر السعادۃ رکھی ہوئی تھی۔ میں نے اسے اٹھا کر کھولا ہی تھا کہ اس حدیث پر نظر پڑی کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ثمر حنا کو پسند فرمایا کرتے تھے۔ آنجنابؐ کی اقتدار میں میرے دل میں بھی ثمر حنا کی ٹہنی کا شوقِ شدید اُمڈ آیا۔ لیکن یہاں اس کا حصول کیوں کر ممکن تھا۔ میں اپنے شہر اور گھر سے دور تھا۔ کچھ دیر کے بعد ہم اخوان کے مرکز چلے گئے۔ اور وہاں پہنچ کر میں نے حاضرین سے خطاب شروع کر دیا۔ میری پشت کھڑکی کی جانب تھی۔ کھڑکی کے اندر اور اس کے ارد گرد کچھ لڑکے کھڑے جھانک رہے تھے۔ ناگاہ ایک لڑکے نے شیخ ہادی عطیہ کو آواز دی۔ جب شیخ ہادی عطیہ اس کے پاس گئے تو اس لڑکے نے شجر حنا کی ایک موٹی سی ٹہنی شیخ کو تھما دی، اور میری طرف اشارہ کرتے ہوئے (جسے میں نے خود بھی دیکھ لیا) لڑکا شیخ کو کہنے لگا کہ یہ ٹہنی تقریر کرنے والے شیخ کو دے دی جائے۔ شیخ ہادی نے آکر وہ لکڑی مجھے پیش کر دی اور کہا کہ یہ اربعین (جگہ کا نام) کے بچوں کا آپ کے لیے تحفہ ہے۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "یہ اربعین کا تحفہ نہیں ہے بلکہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور یاد کا ایک عنبریں جھونکا ہے۔ اس مبارک اتفاق پر میں سارا دن موجِ سُرور میں ڈوبا رہا۔"

قاہرہ میں دعوت کی تاریخ

شارع الفلکی میں، کمرشل اسکول کے اندر جمعیت دینیہ کی تاسیس عمل میں آئی۔ اس جمعیت کا کل سرمایہ اسکول کے دو طالب علم: عبد الرحمان الساعاتی اور محمود سعدی الحکیم، اور ان دونوں کے چند ہم جماعت ہیں۔ یہ لوگ نماز کے پابند ہیں۔ اسلام کی برکات کے معترف

اور اسلامی تعلیمات کے محاسن سے آگاہ ہیں ۔ اسکول کی چھوٹی سی مسجد ان لوگوں کے اجتماعات کا مرکز اور ان کی سرگرمیوں کا مظہر ہے ۔ انھیں بارہا اپنے ساتھی طلبہ کی طرف سے استہزا اور تمسخر کا نشانہ بننا پڑا ہے ۔ وہ حیرت و استعجاب کے ساتھ ان کی جانب انگشت نمائی کرتے ہیں ۔ بعض طلبہ جو ایسے مظاہر کو خاطر میں نہیں لاتے اور اسکول کے ملازمین ان کی مخالفت کرتے ہیں ۔ لیکن یہ لوگ بڑی شرافت کے ساتھ صبر و تحمّل کا دامن پکڑے ہوئے ہیں ۔

مذکورہ بالا دونوں صالح نوجوان اسکول سے فارغ ہوجاتے ہیں ۔ اور خدا کا کرنا یہ ہوتا ہے کہ یہ دونوں ریلوے انجینئرنگ برانچ میں اکٹھے ملازم ہوجاتے ہیں ۔ ان کے دل میں اسلام کے ساتھ گہرا عشق اور اسلام کی عاید کردہ ذمّہ داری کا احساس اور کام کی تڑپ پائی جاتی ہے ۔ دین حنیف کے راستے میں ہر گونہ جہاد کے لیے وہ آمادہ ہیں ۔ ان دنوں اسلام کے لیے کام کرنے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہوتا تھا کہ اسلامی جمعیتیں تشکیل دی جائیں ۔ لہٰذا ان کے اندر بھی یہ جذبہ اُبھرا کہ وہ ایک ایسی جمعیت قائم کریں جو اسلام کی دعوت پیش کرے اور اسلام کی سربلندی کے لیے جدوجہد کرے ۔ چنانچہ اسی جذبے کے نتیجے میں جمعیت الحضارۃ الاسلامیۃ (جمعیت تہذیب اسلامی) وجود میں آگئی ۔ اور اور اُس نے آغاز سفر کردیا ۔ الروم محلّے کے اندر ایک کمرے کو جو نچلی منزل میں تھا ۔ اور جس کے آگے کشادہ صحن تھا ۔ اس نے اپنی سرگرمیوں کا مرکز اور اپنی جدوجہد کا اڈہ بنا لیا ۔ کئی اور اصحاب علم و دانش بھی اس جمعیت میں شامل ہوگئے ۔ یہ حضرات وہاں آکر تقریریں کرتے ، اور عوام النّاس کو پابندی سے وعظ و درس دیتے اور بڑے مؤثر اور کارگر پیرائے میں لوگوں کو اسلام کی طرف بُلاتے ۔

ان میں سرفہرست شیخ محمد احمد شریت (رحمۃ اللہ علیہ) استاذ حامد شریت (جواب محکمۂ تعلیم میں مدرس ہیں) استاذ محمود السبرادی (جواب قاہرہ میں اخوان کے شعبۂ اخبارات کے

سربراہ ہیں)۔ شیخ محمد فرغلی[1] (جواب اسماعیلیہ میں اخوان کے سربراہ ہیں)، شیخ جمیل عقّاد (شام کے صوبہ حلب کے رہنے والے) ہیں۔ ان دونوں یہ سب حضرات چیدہ طلبہ اور ذہین و فطین نوجوان شمار ہوتے تھے۔

اسی دوران جمعیت تہذیب اسلامی نے اسماعیلیہ کے اندر الاخوان المسلمون کی جدّوجہد کا جائزہ لیا۔ اور اس بابرکت شہر کے اطراف میں اخوان کی جگہ جگہ شاخیں پھیلی ہوئی دیکھیں۔ چنانچہ جمعیت کے کارپرداز حضرات اس یقین سے سرشار ہوگئے کہ افتراق سے اتحاد بہتر ہے۔ اور دعوتی کوششوں میں تعاون و یکسوئی زیادہ اولیٰ اور نتیجہ خیز ہے۔ ان حضرات نے اسماعیلیہ کے اخوانی مرکز سے رابطہ قائم کیا۔ اور اتحاد کے موضوع پر مذاکرات شروع کر دیئے جن کے نتیجے میں بالآخر جمعیت تہذیب اسلامی کو اخوان المسلمون میں ضم کر دیا گیا۔ اور قاہرہ میں جمعیت تہذیب کے مرکز کو اخوان المسلمون کی شاخ میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس کے بعد اخوان نے قاہرہ میں شارع سوق السلاح میں سلیم پاشا حجازی کی عمارت میں ایک نیا مرکز کرائے پر لے لیا۔ خود ہی اخوان نے اس کی مرمّت اور تزئین شروع کر دی۔ اور کوشش کی کہ اس نئے مرکز کو ایسی شکل و صورت میں تبدیل کر دیا جائے جو مصر کے دارالحکومت قاہرہ کے اندر دعوت و تحریک کے شایانِ شان ہو۔

قاہرہ میں اخوان کی مالی حالت اس امر کی اجازت نہ دیتی تھی کہ مرکز کو جدید تقاضوں کے مطابق ظاہری شکل و صورت دینے کے لیے گرانقدر مصارف کیے جائیں۔ چنانچہ اسماعیلیہ نے، جو اصل گہوارۂ دعوت تھا، قاہرہ کی مالی کفالت کا بوجھ اس وقت تک اٹھانے کا فیصلہ کر لیا جب تک وہاں شرکاء کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ نہیں ہو جاتا اور اہلِ ایمان

---

[1] ۱۹۵۲ء میں جن اخوانی رہنماؤں کو جمال عبدالناصر نے موت کی سزا دی تھی ان میں سے ایک علاّمہ شیخ محمد فرغلی بھی تھے۔

مالی بوجھ میں حصّہ دار نہیں بن جاتے۔

میرے اسماعیلیہ سے قاہرہ منتقل ہو جانے کے ساتھ ہی اخوان المسلمون کا مرکز بھی اکتوبر ۱۹۳۲ء کے اوائل میں منتقل ہو گیا۔

قاہرہ کے اخوان کا یہ واقعہ ہمیشہ بڑے فخر و استحسان کے ساتھ بیان کیا جائیگا کہ قاہرہ میں ابھی تحریک کا پودا نوخیز تھا، اخوان مالی مدد کے شدید ضرورت مند تھے۔ اسماعیلیہ ہی انھیں ماہانہ مالی امداد بہم پہنچا رہا تھا۔ ان حالات میں اخوان کو ایک خطیر مالی پیش کش کی گئی اور ان سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ موجودہ حکومت کے حق میں پروپیگنڈہ کریں اور حکومت نے دستور کی تدوین اور انتخابات کے اجرا کا جو پروگرام بنا رکھا ہے اس کی تشہیر کریں۔ یہ صدقی پاشا کی پہلی وزارت کا دَور تھا۔ اخ عبدالرحمٰن الساعاتی[۱]، نے جو ان دنوں ایک معمولی درجے کے سرکاری ملازم تھے اس پیش کش کے جواب میں کہا:

> "ہمارے ہاتھ کاٹے جا سکتے ہیں مگر یہ ایسے کسی سرمائے کی طرف ہرگز نہیں بڑھ سکتے کہ جس میں ہمارا کوئی حق نہ ہو اور جس کا مقصد اسلامی دعوت کو ذاتی مفادات اور خواہشاتِ نفس کے تابع کرنا ہو۔ اگر موجودہ سیاسی نظام پر ہم مطمئن ہوتے تو خود ہمارا اپنا یہ فرض ہے کہ اس کی خاطر ہم اپنی جان و مال سے جہاد کریں نہ کہ اپنی خدمات کا معاوضہ وصول کریں"۔

الغرض وہ تمام کوششیں ناکام ہو گئیں جو اخوان کو سرکاری مفادات کی ترویج و اشاعت کے لیے خریدنے کے سلسلے میں سرانجام دی گئیں۔ حالانکہ ان دنوں اخوان

---

[۱] عبدالرحمان الساعاتی امام حسن البنّا شہید کے چھوٹے بھائی تھے، اور ان سے عمر میں دو سال چھوٹے تھے۔

چند نوجوان طلبہ اور سرکاری ملازمین سے زیادہ کچھ نہ تھے۔ یوں اللہ تعالےٰ نے پہلے ہی روز دعوتِ اسلامی کو ایسی تمام آلائشوں سے محفوظ اور پاک رکھا جو جس تحریک میں داخل ہو جاتی ہیں اسے برباد کر کے رکھ دیتی ہیں۔ اور جس دل میں گھر کر لیتی ہیں اُسے خدا سے دور کر دیتی ہیں۔ قاہرہ کی اسلامی دعوت اور اس کے علم برداروں پر اللہ کا یہ بڑا فضل و احسان تھا کہ وہ اس فتنہ سے نلوہ بچ گئے۔ والحمد للہ ربّ العالمین۔

مدرسہ امّہات المؤمنین

" درس گاہ حراء " (جو لڑکوں کے لیے مخصوص تھی) جب پورے استقرار واستحکام کے ساتھ چل پڑی تو اخوان نے سوچا کہ اب لڑکیوں کے لیے بھی ایک مدرسہ قائم کرنا چاہیے۔ اس مدرسے کا نام انھوں نے " مدرسہ امہات المؤمنین " تجویز کیا۔ اور اس کے لیے ایک عظیم الشّان عمارت بھی کرائے پر حاصل کر لی۔ ایک اسلامی اور عصری نظامِ تعلیم اس کے لیے مدوّن کر لیا گیا جو ایک طرف اسلامی آداب اور لڑکیوں ماؤں، اور بیویوں کے لیے اسلام کی پاکیزہ تعلیمات پر مشتمل تھا، اور دوسری طرف نظری اور سائنسی علوم کے بارے میں زمانے کے تقاضوں کو پورا کرتا تھا۔

میری رائے یہ تھی کہ مدرسہ کی فضا کو پاکیزہ اور پُر امن رکھنے کے لیے بہتر یہ ہے کہ خود اسماعیلیہ ہی کی لڑکیوں میں سے تعلیم و تدریس کی مہارت رکھنے والی استانیوں کو منتخب کر لیا جائے۔ چنانچہ اسی رائے پر عمل کیا گیا۔ مدرسہ کی پرنسپل شپ کے لیے استاذ احمد عبد الحمید کو تجویز کیا گیا جو بڑے پارسا، متدیّن اور پرہیزگار انسان تھے اور تحریک کے ساتھ بھی گہری وابستگی رکھتے تھے۔

الاخوات المسلمات

" مدرسہ امّہات المؤمنین " جن مقاصد کے لیے قائم کیا گیا تھا وہ کما حقہ، پورے ہو رہے تھے کہ اُسے وزارتِ تعلیم نے اپنے انتظام میں لے لیا۔ مدرسہ کی

تاسیس کے کچھ عرصہ بعد شعبہ الاخوات المسلمات کا قیام عمل میں آ گیا۔ یہ شعبہ اخوان کی اپنی عورتوں اور لڑکیوں اور رشتہ دار خواتین پر مشتمل تھا۔ اور اس میں تدریس و تعلیم کا فریضہ مدرسہ کی استانیاں انجام دیتی تھیں۔ اس شعبے کو میں نے "فرقۃ الاخوات المسلمات" (مسلمان بہنوں کا گروپ) کا نام دیا۔ اور ان کے لیے مخصوص ضوابط وضع کر دیئے گئے جن میں ان کے لیے لائحہ عمل کو طے کر دیا گیا اور ان وسائل و ذرائع کی نشاندہی بھی کر دی گئی جو مسلمان خواتین کے اندر، خواہ ان کا تعلق اخوان سے ہو یا غیر اخوان سے، اسلام کی دعوت کو پھیلانے کے لیے اختیار کیے جا سکتے تھے۔

اسکاؤٹس گروپ

نیز اخوان نے یہ بھی سوچا کہ جسمانی تربیت کی مشق بھی شروع کرنی چاہیے۔ اس خیال کی بنیاد اسلامی جہاد کا تصور تھا۔ اخوان جہاد کے لیے نیت کو پختہ کرنے اور جہاد کے بارے میں اسلام کے حکم کو عملی جامہ پہنانے کے ذوق سے سرشار تھے۔ اور پھر وہ اس بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس وعید سے بچنا چاہتے تھے کہ:

"من مات ولم یغز ولم ینو الغزو مات میتۃ جاھلیۃ"

"جو شخص اس حالت میں مرا کہ اس نے نہ تو جہاد کیا اور نہ جہاد کرنے کی نیت ہی کی وہ جاہلیت کی موت مرا"

چنانچہ اخوان المسلمون نے اسکاؤٹنگ کے اصولوں پر ایک گروپ تشکیل دیا جس کا نام تھا فرقۃ الرحلات (ٹورسٹ اسکاؤٹس گروپ) یہ نظام اسماعیلیہ کے بعد اخوان کی دوسری تمام شاخوں اور مراکز تک پھیل گیا۔ اور آج کل اخوان کے اندر جو اسکاؤٹس گروپ ہیں ان کی بنیاد یہ فرقۃ الرحلات تھے [1]

(حاشیہ اگلے صفحہ پر)

جباسات البلاح دعوت کی گود میں

جباسات کے کچھ مزدور اور محنت پیشہ افراد کو اسماعیلیہ کے اخوان سے ملنے کا موقع ملا۔ چنانچہ ان مزدوروں نے جباسات کے مزدور حلقوں تک اخوان کی دعوت اور نظریہ کو پہنچایا۔ مجھے جباسات کے دورے کی دعوت ملی۔ چنانچہ میں نے وہاں جاکر ان مزدور اخوان سے دعوت وتحریک کی وفاداری کی بیعت لی۔ اس دور دراز مقام پر یہ بیعت ہی ایک فکری انقلاب کا پیش خیمہ بنی۔

زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ مزدوروں نے سوئز کمپنی سے مطالبہ کردیا کہ چونکہ مسلمان مزدوروں کی تعداد تین سو سے زیادہ ہے لہٰذا کمپنی ان کے لیے ایک مسجد تعمیر کرے۔ کمپنی نے مزدوروں کے مطالبہ کو تسلیم کرلیا، اور ایک مسجد تعمیر کردی گئی۔ کمپنی نے اسماعیلیہ کی جماعت سے ایک ایسا عالم دین بھیجنے کی فرمائش کی جو امامت اور درس کے فرائض سرانجام دے۔ چنانچہ برادر فاضل جناب شیخ محمد فرغلی کو اس مہم کے لیے منتخب کیا گیا۔ موصوف اس وقت درس گاہ حراء میں مدرس تھے۔

شیخ فرغلی جباسات البلاح پہنچ گئے اور مسجد کی ذمہ داریاں انھوں نے سنبھال لیں۔ مسجد کے جوار ہی میں ان کی رہائش کا انتظام کردیا گیا۔ شیخ کی مضبوط اور اثر انگیز رُوح ان نیک نہاد مزدوروں کی روح سے خوب ہم آمیز وہم آہنگ ہوگئی۔ چند ہفتے ہی گزرے کہ مزدوروں کے ذہنی، نفسیاتی اور معاشرتی معیار میں حیرت انگیز بلندی پیدا ہوگئی۔ انھوں نے اپنی اصل قدر و قیمت پہچان لی۔ زندگی کے بلند ترین مقصد سے آگاہی انھیں نصیب ہوگئی۔ اور انسانیت کے محاسن کا انھیں صحیح اندازہ ہوگیا۔ ان کے دلوں سے

(صفحہ ۳۰۹ کا حاشیہ)

ل۵ اخوان نے نوجوانوں کو جہاد کی جو تربیت دی تھی اس کا یہ نتیجہ تھا کہ جب ۱۹۴۷ء میں اسرائیل وجود میں آیا تو ۱۰ ہزار اخوان مجاہدین جہاد کے لیے نکل کھڑے ہوئے اور انھوں نے یہودیوں کے چھکّے چھڑا دیے۔ (مترجم)

خوف و ذلت کا احساس اور ضعف و ناتوانی کی کیفیت کافور ہوگئی۔ انھیں اس بات پر فخر و ناز ہونے لگا اور اب وہ دولتِ ایمان سے بہرہ مند ہیں اور انھوں نے زندگی کے اندر اپنے اصل فرض یعنی دنیا میں حکومتِ الٰہی کے قیام کو پہچان لیا ہے۔

چنانچہ ایک طرف وہ اپنے مفوضہ کام میں بھی خوب محنت اور کاوش کرتے اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی تعمیل کرتے کہ ان اللہ یحب اذا عمل احدکم عملا ان یتقنہ (اللہ کو یہ بات پسند ہے کہ تم میں سے جو شخص کوئی کام کرے تو اسے نہایت پختگی سے انجام دے) اور دوسری طرف جس چیز پر ان کا کوئی حق نہ ہوتا تھا۔ اس سے اپنے آپ کو بالاتر رکھتے۔ گھٹیا قسم کے لالچ انھیں تسخیر نہ کر سکتے اور نہ حقیر خواہشات انھیں اپنے دام میں لے سکتیں۔ ایک ملازم اپنے افسر کے سامنے یوں کھڑا ہوتا کہ اس کا سر بلند ہے، مگر دامنِ ادب ہاتھ سے نہیں چھوٹا، حمیت سے لبریز ہے مگر وقار و سنجیدگی کی حدوں کو نہیں توڑا۔ جب اس سے گفتگو کرتا ہے تو دلیل و حجت ہم عناں ہوتے ہیں۔

سابقہ صورتِ حال کے برعکس کوئی نازیبا لفظ یا کرخت بات نہ خود زبان سے نکالتا ہے اور نہ افسر سے سُننا گوارا کرتا ہے۔ تحقیر و تذلیل کا کوئی انداز نہ اسے اپنے لیے پسند ہے نہ اپنے افسر کے لیے۔ ان مزدوروں کو رشتۂ اخوت نے ایک جگہ جمع کر دیا۔ اور محبت، محنت اور امانت داری ان کے اتحاد کی بنیاد بن گئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ کمپنی کے افسران کو یہ نرالی سیاست پسند نہ آئی۔ اور وہ تاڑ گئے کہ یہی لیل و نہار رہے تو اختیارات کی زمام ایک روز اس مولوی ـــــــ شیخ فرغلی ـــــــ کے ہاتھ آجائے گی۔ اور اس کے بعد کوئی طاقت اسے اور ان مزدوروں کو لگام نہ دے سکے گی۔

شیخ فرغلی اور غیر ملکی کمپنی کا تصادم

چنانچہ کمپنی کے افسران نے اس وہم کا شکار ہوکر یہ سوچنا شروع کر دیا کہ اس جرأت آزما شیخ کو کسی طرح ملازمت سے برطرف کر دیا جائے۔ ایک متعلقہ افسر کو شیخ کے پاس

بھیجا گیا۔ اس افسر نے شیخ سے کہا:

"ڈائرکٹر صاحب نے مجھے اطلاع دی ہے کہ کمپنی کو آپ کی خدمات کی ضرورت نہیں رہی۔ اور اب کمپنی کی یہ تجویز ہے کہ آپ کی جگہ کسی اور ملازم کو مسجد کا کام سونپ دیا جائے۔ لیجیے ڈائرکٹر صاحب کے حکم کے بموجب آج تک کا آپ کا حساب حاضر ہے۔"

شیخ فرغلی نے نہایت تحمّل وسکون سے اسے جواب دیا کہ:

"موسیو فرانسو مجھے یہ گمان نہ تھا کہ میں جباسات البلاح کی کمپنی کا ملازم ہوں۔ اگر مجھے یہ علم ہوتا تو میں سرے سے کمپنی کی ملازمت قبول نہ کرتا۔ میں تو یہ جانتا ہوں کہ میں اسماعیلیہ کے اخوان المسلمون کی طرف سے یہاں نمائندگی کر رہا ہوں۔ میں اپنا معاوضہ بھی اُن سے وصول کرتا ہوں جو آپ کی وساطت سے مجھے بھیجتے رہتے ہیں۔ میرا معاہدہ آپ کے ساتھ نہیں، اخوان کے ساتھ ہے۔ میں آپ سے نہ کوئی تنخواہ لوں گا اور نہ حساب۔ اور مسجد کے اندر میں جو فرض سرانجام دے رہا ہوں میں اسے ہرگز ترک نہ کروں گا۔ خواہ اس کے لیے طاقت ہی استعمال کی جائے۔ اِلّا یہ کہ جماعت الاخوان کے سربراہ جنہوں نے مجھے یہاں بھیجا ہے مجھے ترکِ عمل کا حکم دیں۔ وہ سامنے اسماعیلیہ ہے، وہاں وہ موجود ہیں، جائیے ان سے مل کر جو کچھ طے کرنا ہے کر لیجیے۔"

شیخ فرغلی کا یہ جواب سُن کر افسر نے شیخ سے اجازت لی اور واپس لوٹ آیا۔ شیخ کا یہ رویہ دیکھ کر کمپنی کی انتظامیہ کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ چند روز تک تو کمپنی نے صبر سے کام لیا کہ شاید شیخ اس سے اپنی تنخواہ کا تقاضا کرے۔ لیکن شیخ اسماعیلیہ میرے پاس آیا۔ میں نے بھی انھیں یہی تلقین کی کہ آپ اپنے موقف پر ڈٹے رہیں۔ اور اپنی

جگہ کسی حالت میں بھی نہ چھوڑیں ۔ آپ کی دلیل نہایت معقول اور مضبوط ہے۔ اور آپ کے پاس ان کی کوئی چیز نہیں ہے ۔ اب کمپنی نے مرکزی انتظامیہ کا سہارا لیا ۔ اور اس کے ڈائرکٹر موسیو مینو نے سوئز کے گورنر سے رابطہ قائم کیا ۔ اور گورنر نے اسماعیلیہ کے پولیس انسپکٹر کو حکم دیا کہ وہ فوراً پولیس کا ایک دستہ لے کر جباسات البلاح جائے اور صورت حال کو درست کرے ۔ چنانچہ پولیس انسپکٹر سپاہیوں کو لے کر فوراً موقع پر پہنچ گیا اور ڈائرکٹر کے دفتر میں آکر بیٹھ گیا ۔ اور ایک فرستادہ شیخ کو طلب کرنے کے لیے بھیجا ۔ شیخ مسجد میں پناہ لے چکا تھا ۔ شیخ نے فرستادہ کو جواب دیا کہ :

" مجھے انسپکٹر پولیس یا ڈائرکٹر سے کوئی واسطہ نہیں ہے ۔ میرا کام مسجد سے وابستہ ہے ۔ اگر ان دونوں میں سے کسی کو ضرورت ہو تو وہ یہاں میرے پاس آسکتا ہے "۔

چنانچہ انسپکٹر پولیس خود ہی شیخ کے پاس آیا ۔ اور شیخ کو مجبور کرنے لگا کہ وہ ڈائرکٹر کا مطالبہ تسلیم کرلیں ۔ اور اپنا کام چھوڑ دیں اور اسماعیلیہ واپس چلے جائیں ۔ شیخ نے اپنا سابقہ جواب دہرایا اور کہا کہ :

> " آپ مجھے اسماعیلیہ سے برخاستگی کی دو حرفی تحریر لاکر دیدیں، میں فوراً چلا جاؤں گا ۔ لیکن اگر آپ طاقت استعمال کرنا چاہتے ہیں، تو آپ جو چاہیں کرلیں، میں یہاں سے ہرگز باہر نہ نکلوں گا ۔ صرف میری لاش ہی باہر نکلے گی "۔

یہ خبر مزدوروں تک پہنچ گئی ۔ انھوں نے آناً فاناً اپنا کام چھوڑ دیا اور ایک ہجوم کی شکل میں نعرے لگاتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے ۔ انسپکٹر پولیس اس جھگڑے کے انجام سے خوفزدہ ہو کر صورتِ حال کو علیٰ حالہٖ چھوڑ کر اسماعیلیہ واپس چلا گیا ۔ اور آکر مجھ سے ملا تاکہ اس مشکل کو حل کرنے کے لیے مفاہمت کی صورت نکالی جائے ۔ میں نے اس سے معذرت کی کہ " میں اس معاملے پر غور و فکر کیے بغیر فوری کوئی رائے نہیں دے سکتا ۔ میں پہلے جماعت

کی مجلسِ عاملہ کا اجلاس بلاؤں گا۔ مجلسِ عاملہ اس مسئلے کا جائزہ لے گی۔ اور پھر میں آپ کو کوئی جواب دوں گا۔"

مجھے افسوس سے یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ اسی دوران میں قاہرہ گیا اور سوئز کمپنی کی ایڈمنسٹریٹیو کونسل کے واحد مصری ممبر سے اس مسئلے پر گفتگو کی، مگر میں نے اُسے دیکھا کہ وہ مزدوروں کے مفاد سے یکسر اعراض برت رہا ہے۔ کمپنی اور اس کے ڈائرکٹر کے خیالات کی سراپا جانب داری کر رہا ہے اور قومی غیرت جس کا نام ہے اس سے وہ کلیتہً عاری ہے۔

اس کے بعد میں نے خود کمپنی کے ڈائرکٹر سے ملاقات کی اور میں نے پوچھا کہ وہ آخر کیوں شیخ فرغلی کے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑ گیا ہے۔ اس کے پاس اس کے سوا اور کوئی جواب نہ تھا کہ انھیں ایسا شخص چاہیے جو ان کے مطالبے کے آگے سرِ تسلیم خم کرتا رہے۔ ڈائرکٹر کے یہ الفاظ مجھے ابھی تک اچھی طرح یاد ہیں کہ:

> "میں بہت سے مسلمان لیڈروں کا دوست ہوں۔ میں نے الجزائر میں بھی بیس سال گزارے ہیں۔ لیکن میں نے ان مسلمانوں کے اندر شیخ جیسا کوئی آدمی نہیں دیکھا جو ہمارے اوپر یوں احکام نافذ کرتا ہو گویا وہ کوئی فوجی جرنیل ہے۔"

میں نے اس کے ساتھ بڑی بحث و تمحیص کی اور اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ اس کا خیال بالکل غلط ہے۔ دراصل یہ کمپنیاں ہی مزدوروں کے ساتھ ظلم و ستم روا رکھتی ہیں۔ مزدوروں کے حقوق پامال کرتی ہیں۔ انھیں انسان تک نہیں سمجھتیں۔ ان کے ساتھ انتہائی تنگ ظرفی اور بخل کے ساتھ پیش آتی ہیں اور انھیں پوری اجرت نہیں دیتی ہیں۔ ایک طرف یہ حال ہے اور دوسری طرف ان کمپنیوں کے منافع میں بے پناہ اضافہ ہو رہا ہے۔ اس خرابی کا علاج نہایت ضروری ہے اور یہ علاج یوں ہو سکتا ہے کہ کمپنیوں کے نظام کو درست کیا جائے اور وہ معمولی منافع پر قناعت کو شعار بنائیں۔

بالآخر میں اور ڈائرکٹر اس بات پر متفق ہو گئے کہ شیخ فرغلی دو ماہ تک بدستور اپنے منصب پر رہیں گے۔ اور جب یہ مدّت ختم ہو گی تو ڈائرکٹر اور ان کی کمپنی انھیں پورے اعزاز کے ساتھ رخصت کرے گی۔ اور کمپنی باقاعدہ اخوان المسلمون کو یہ درخواست کرے گی کہ وہ ان کی جگہ کسی اور مولوی صاحب کو نامزد کردیں۔ اور نئے مولوی صاحب کو دوگنا معاوضہ دیا جائے گا۔ اور ان کے لیے رہائش اور دوسری ضروریات کا خاطر خواہ انتظام کیا جائیگا۔ چنانچہ دو ماہ کا عرصہ گزرنے کے بعد شیخ فرغلی واپس آگئے اور ان کی جگہ شیخ شافعی احمد نے لے لی۔ اس صحرائی علاقے کے اندر اسلامی دعوت کا کارواں خوش اسلوبی سے برابر آگے کی طرف قدم بڑھا رہا ہے۔ باسم اللہ مجریھا ومرسٰھا۔

گھٹیا ہتھکنڈوں کے چند نمونے

رمضان المبارک میں میرا یہ معمول تھا کہ میں مسجد العباسی میں نماز فجر کے بعد اسلامی مسائل کا درس دیا کرتا تھا۔ یہ مسائل زیادہ تر روزہ، زکوٰۃ اور رمضان کی فضیلت کے بارے میں ہوتے تھے۔ رمضان المبارک کے ختم ہونے کا جب وقت قریب آیا تو میں نے نماز عید کے احکام و مسائل شروع کر دیئے۔ ان مسائل میں یہ بحث بھی آئی کہ سنّت یہ ہے کہ نماز عید شہر کے باہر کھلے میدان میں ادا کی جائے۔ تمام لوگ مرد ہوں یا عورتیں باہر نکلیں اور اسلامی شوکت اور مسلمانوں کے اجتماع و اتحاد کا مظاہرہ کریں۔ تمام ائمۂ اسلام اس بات پر متّفق ہیں کہ باہر کھلی جگہ میں نماز عید پڑھنا افضل ہے۔ صرف امام شافعی اس سے اختلاف کرتے ہیں۔ ان کا یہ فتویٰ ہے کہ نماز عید مسجد میں زیادہ افضل ہے بشرطیکہ شہر کے اندر اتنی بڑی مسجد موجود ہو جس میں شہر کے تمام لوگ سما جائیں۔

میں جب ان مسائل کو بیان کر رہا تھا اور بدلائل ان کی تشریح کر رہا تھا تو اسی دوران حاضرین میں سے ایک صاحب نے یہ تجویز پیش کی کہ ہمیں چاہیے کہ اس سنّت کو زندہ کریں۔ اور باہر صحرا میں عید الفطر کی نماز ادا کریں۔ اور ویسے بھی اس زمانے میں

اسماعیلیہ کے اندر کوئی بڑی مسجد نہ تھی بلکہ سب چھوٹی چھوٹی مسجدیں تھیں ، جن میں تمام اہالیان شہر تو کجا چند سو بھی نہ سما سکتے تھے۔ شہر کے ارد گرد اتنا وسیع صحرا ہے کہ انگریزی فوج کی بہت بڑی کھیپ بھی اس میں سما گئی ہے۔

تمام حاضرین نے بڑی گرمجوشی سے اس تجویز کی حمایت کی اور مجھے بھی چار و ناچاران کا ہمنوا ہونا پڑا۔ لیکن چونکہ میں بخوبی جانتا تھا کہ اس شہر کے اندر مذہبی مسائل کے معاملے میں آرار بہت جلد منقسم ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ مذہب کے معاملے میں یہاں کے لوگ بڑے حسّاس اور جذباتی واقع ہوئے ہیں۔ نیز یہ شہر ابھی ابھی مذہبی جھگڑوں کے طوفان سے گزرا ہے۔ بنابریں میں نے یہ شرط عائد کی کہ جب تک ہم علمار سے مشورہ نہ کر لیں اور اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے طریق کار پران کے ساتھ متفق نہ ہو جائیں کوئی قدم نہ اُٹھائیں گے۔ اگر علمار نے اظہار مواقفت کیا تو بہتر، ورنہ لوگوں کا کسی خلافِ اولیٰ بات پر متفق ہو جانا اس سے بہتر ہے کہ وہ کسی اولیٰ فعل پر عمل کرنے کی صورت میں افتراق وانتشار کی نذر ہو جائیں۔

میں نے اس سلسلے میں ابھی قدم اٹھایا ہی تھا کہ یکایک میرے خلاف تحریک کے بدخواہوں کی طرف سے تند و تیز مہم شروع ہوگئی، اور مجھ پر بڑے بڑے سنگین الزامات کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ مثلاً : یہ خیال کہ باہر خلار میں نماز عید گزاری جائے دین کے اندر بدعت کا آغاز ہے۔ مسجد کو اجاڑنے کے مترادف ہے۔ اسلام سے جنگ ہے' ایک باطل فتویٰ ہے۔ اور وہ کون ہوتا ہے جو یہ کہے کہ سڑک مسجد سے افضل ہے۔ ماسمعنا بھٰذا فی اٰبائنا الاوّلین (یہ باتیں تو ہم نے اپنے باپ دادا کے زمانے میں کبھی نہیں سنی تھیں)۔ یہ خبر بڑی برق رفتاری سے شہر کے اندر پھیل گئی۔ قہوہ خانوں ، مسجدوں، پبلک اجتماعات ، نجی محفلوں، الغرض ہر جگہ لوگوں کی زبانوں پر اس کا چرچا ہونے لگا۔ یہ ایک ایسی خوفناک مہم تھی کہ توبہ ہی بھلی۔ اور اتفاق یہ ہوا کہ یہ ماہ رمضان کا آخری عشرہ تھا اور میں

العباسی مسجد کے اندر معتکف تھا۔ لوگ ہر نماز کے بعد میرے اوپر ٹوٹ پڑتے اور مجھ سے دریافت کرتے کہ یہ کیا نئی بدعت ہے، اور میں اس بے بنیاد وہم کے سامنے انگشت بدنداں تھا۔ میں سیدھے سادے معصومانہ طریقے سے دین کے احکام بیان کر دیتا۔ اور اس بارے میں فقہ کی کتابوں میں جو کچھ مذکور ہے اسے لوگوں کے سامنے رکھ دیتا۔ جدل و تکرار سے پرہیز کرتا، اتحاد و اتفاق کی نصیحت کرتا اور خصومات سے گریز کی تلقین کرتا لیکن یہ معاملہ اس حد تک بڑھ گیا کہ میرے ہاتھ سے اور خود علماء کے ہاتھ سے بھی نکل گیا۔ اور عوام النّاس مشتعل تھے کہ وہ حق اور سنّت کی پیروی چاہتے ہیں۔ اور انھوں نے اعلان کر دیا کہ نمازِ عید شہر کے باہر ہوگی۔ بلکہ بالفعل انھوں نے نماز کے لیے جگہ بھی ہموار کر لی۔ ادھر میں مجبور تھا کہ قاہرہ جاؤں اور عید اہلِ خانہ کے ساتھ مناؤں۔ چنانچہ میں عید کی رات قاہرہ آگیا۔ اسماعیلیہ میں لوگوں نے تمام معاملات خود ہی انجام دے لیے۔ مسجد العرایشیہ کے امام شیخ محمد مدین نے انھیں نماز عید پڑھائی۔

اس اسلامی مظاہرے پر لوگ بے انتہا مطمئن و مسرور ہوئے۔ ان کے قلوب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت پاک کی برکت خوب سرایت کر گئی۔ میں جب عید کی رخصت گزار کر واپس آیا تو میں نے ہر فرد کے چہرے پر اس مسرت و انبساط کے آثار دیکھے۔ یوں مفاد پرستوں کا اٹھایا ہوا طوفانِ بدتمیزی تھم گیا۔ سنّت مبارکہ جاری و ساری ہوگئی۔ اور آج تک اسماعیلیہ میں عیدین کی نماز پوری اسلامی شان و شوکت کے جلو میں شہر کے باہر ادا ہوتی ہے۔

قاضی شرع کے گھر میں بحث و مناظرہ کی ایک داستان

رمضان المبارک کی ایک رات کو میں اسماعیلیہ کے قاضی شرع کے مکان پر گیا۔ اس موقع پر وہاں انسپکٹر پولیس، سول جج، پرائمری اسکول کے ہیڈ ماسٹر، محکمۂ تعلیم کے ایک انسپکٹر اور ادبا، و فضلاء اور وکلاء، اور اعیان شہر کی ایک جماعت جمع ہوگئی اور ایک

پُرلطف نشست برپا ہوگئی ۔ قاضی صاحب نے چائے منگوائی اور چاندی کی پیالیوں میں حاضرین کو پیش کی ۔ جب میری باری آئی تو میں نے شیشے کی پیالی طلب کی ۔ محترم قاضی صاحب نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور فرمایا کہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ چائے نہیں پینا چاہتے کیونکہ پیالی چاندی کی ہے ۔ میں نے عرض کیا :

" بے شک درست ہے، مزید برآں یہ کہ ہم اس وقت قاضی شرع کے گھر میں ہیں "۔

قاضی صاحب فرمانے لگے :

" یہ ایک اختلافی مسئلہ ہے اور اس میں طویل بحث منقول ہے۔ اور ہم دوسرے تمام احکام پر کہاں عمل کر پائے ہیں کہ اب اس مسئلہ پر بھی شدّت برتنے لگیں "۔

میں نے جواب میں کہا : محترم یہ مسئلہ اختلافی ہوگا ۔ مگر چاندی کے برتنوں میں کھانے اور پینے کے بارے میں جو حکم ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے ۔ اس بارے میں جو حدیث وارد ہے وہ متفق علیہ ہے اور اس میں ان برتنوں کے استعمال کے لیے شدید نہی کی گئی ہے ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے :

لاتشربوا فی اٰنیۃ الذھب والفضۃ ولا تاکلوا فی صحافھما

" سونے اور چاندی کے برتن میں ہرگز نہ پیو اور نہ ان کی رکابیوں میں کھاؤ "

نیز فرمایا :

الّذی یشرب فی اٰنیۃ الذھب والفضۃ فانما یجرجر فی بطنہ نار جہنّم ۔

" جو شخص سونے اور چاندی کے برتن میں پیتا ہے وہ اپنے پیٹ میں دوزخ کی آگ بھرتا ہے "۔

اب واضح نص کی موجودگی میں قیاس و اجتہاد کی گنجائش نہیں ہے۔ اور حکم نبویؐ کی تعمیل لازم ہے۔ کاش کیا اچھا ہوتا کہ آپ یہ فرماتے کہ تمام حاضرین شیشے کی پیالیوں میں قہوہ پیئیں۔ حاضرین میں سے کچھ لوگوں نے بحث میں دخل دیا۔ اور یہ کہنا چاہا کہ چونکہ یہ مختلف فیہ مسئلہ ہے لہٰذا ان برتنوں میں قہوہ نوشی کا انکار ضروری نہیں ہے۔ سول جج صاحب بھی میدان میں کود پڑے اور قاضی صاحب سے فرمانے لگے:

"محترم قاضی صاحب اس معاملے میں جب نص موجود ہے تو پھر نص واجب الاحترام ہے۔ ہم اس امر کے پابند نہیں ہیں کہ یہ تلاش کریں کہ اس ممانعت میں کیا حکمت پنہاں ہے اور جب تک حکمت ہم پر عیاں نہ ہو ہم نص پر عمل ترک کیے رکھیں۔ پہلے ہم پر تعمیل حکم لازمی ہے۔ اس کے بعد اگر اس حکم کے اندر پوشیدہ حکمت ہمیں معلوم ہو جائے تو فبہا اور اگر نہ معلوم ہو سکے تو یہ ہماری بصیرت کی کوتاہی اور نارسائی ہوگی۔ منصوص حکم کی تعمیل ہر حال میں لازم ہے۔"

سول جج صاحب کی اس تقریر کے بعد میں نے موقع غنیمت سمجھا اور ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان کی انگلی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اُن سے بھی عرض کیا کہ آپ نے اس بحث کا تو فیصلہ کر دیا ہے۔ لہٰذا اب آپ یہ انگشتری بھی اُتار دیں۔ یہ سونے کی بنی ہوئی ہے اور واضح نص کی رو سے اسے پہننا حرام ہے۔ سول جج صاحب مسکرا دیئے اور کہنے لگے:

"استاذ صاحب میرے فیصلے نپولین کوڈ کے مطابق ہوتے ہیں اور قاضی صاحب کتاب و سنّت کی رُو سے فیصلے کرتے ہیں۔ لہٰذا ہم میں سے ہر ایک اپنی اپنی شریعت کا پابند ہے۔ لہٰذا مجھ سے تو آپ درگزر کریں۔ البتہ قاضی صاحب کو پکڑیں۔ میں نے کہا:

"شریعتِ الٰہی کا حکم تمام مسلمانوں کے لیے وارد ہوا ہے۔ اور آپ بھی مسلمانوں کے ایک فرد ہیں۔ لہٰذا اس لحاظ سے یہ حکم آپ پر بھی لاگو ہوگا۔" سول جج صاحب نے انگشتری اُتار دی۔ یہ نشست فی الواقع نہایت پُرلطف اور خوشگوار رہی۔ اور عوام النّاس کے اندر

بھی اس گفتگو کی بازگشت سنی گئی۔ جو ایسے معمولی موقف کو بھی امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور للّٰہی نصیحت کا عظیم کارنامہ شمار کیا کرتے ہیں۔

واقعہ اسراء پر میری تقریر اور علماء کی شورش

ایک مرتبہ شب معراج کو میں نے اسراء اور معراج کے موضوع پر تقریر کی میں نے اپنی تقریر میں یہ کہا کہ اسراء اور معراج کا سفر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک عظیم اعزاز ہے۔ اگر ہم یہ تصور کرلیں کہ روح کو جسم پر زبردست قدرت حاصل ہوتی ہے تو اس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک اس بابرکت رات کو اس درجہ قدرت و قوت اور وسعت و عظمت کو پہنچ گئی کہ اس نے آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کے جسد مبارک پر پورا غلبہ حاصل کر لیا اور جسد کے تمام مادی قوانین کو معطل کر دیا اور اُسے کھانے پینے اور خواہشات اور اتصال اور مسافت کے اثرات سے بے نیاز کر دیا ...... یہ خیال کوئی امر محال نہیں ہے۔ بلکہ یہ معراج و اسراء کے معجزے کو ان لوگوں کے لیے قریب الفہم کر دیتا ہے۔ جو اس معجزے پر انگشت بدنداں ہوتے ہیں۔ میں نے یہ بھی کہا کہ امیر الشعراء شوقی رحمہ اللہ نے اسی نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

يتساءلون وانت اكرم مرسل
بالروح ام بالهيكل الاسراء
بهما سريت مطهرين كلاهما
رُوح و رُوحانية وضياء

لوگ پوچھتے ہیں کہ آپ جو تمام رسولوں سے بزرگ تر ہیں کا سفر اسراء روح کے ذریعہ ہوا ہے یا جسد کے ذریعہ۔

بے شک دونوں کے ذریعہ آپ نے یہ سفر فرمایا۔ دونوں حد درجہ پاک و طاہر ہو چکے تھے۔ دونوں سراسر روح بھی تھے۔ روحانیت

بھی اور رضیار بھی ۔"

محفل ختم ہوگئی ۔ اور تمام حاضرین میری اس تقریر پر بہت خوش و خرّم تھے ۔ لیکن اربابِ ہوس کو ایک موقع ہاتھ آگیا اور انھوں نے یہ پھیلانا شروع کر دیا کہ الاخوان المسلمون اسرار اور معراج کے منکر ہیں ۔ اور وہ کہتے ہیں کہ یہ واقعہ کوئی معجزہ نہیں ہے اور معراج صرف روحانی تھا جسمانی نہ تھا ۔ اخوان المسلمون کا یہ عقیدہ اجماع امّت کے خلاف ہے ۔ کسی امام سے اس طرح کا عقیدہ منقول نہیں ہے، وغیرہ وغیرہ ۔

اخوان نے اس اعتراض کا جواب دینا چاہا ۔ لیکن میں نے انھیں سختی سے روک دیا ۔ اور انھیں کہا کہ : ایسے حالات میں مثبت طریق کار منفی طریق کار سے ہزار درجہ مفید و مؤثر رہتا ہے ۔ آپ لوگ عوام الناس کو صحیح خیال کی جانب موڑ دیں تاکہ وہ غلط خیال سے از خود دستبردار ہو جائیں ۔ اخوان پوچھنے لگے : " تو پھر ہم کیا کریں ؟ " میں نے یہ تجویز پیش کی کہ آپ لوگ ایک اور تقریر کا اعلان کر دیں جس کا موضوع ہوگا " عظمت رسول صلی اللہ علیہ وسلم "۔ چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا ۔ لوگ پروگرام کے مطابق جمع ہو گئے ۔ میں نے ان کے سامنے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و برتری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ۔ مثلاً تخلیقی لحاظ سے آپ کی عظمت ، اخلاقی لحاظ سے آپؐ کی فوقیت ، روحانی لحاظ سے آپؐ کی بزرگی اور عبادات کے لحاظ سے آپ کی برتری اور اولیّت ۔ نیز آپؐ کی رسالت کی عظمت بیان کی کہ یہ ہمہ گیر بھی ہے ، دائمی بھی ہے ۔ آخری بھی ہے اور کامل و اکمل بھی ۔ اللہ تعالےٰ کے نزدیک دنیا اور آخرت میں آپؐ کا جو مرتبہ و مقام ہے اُس کی بلندی اور عظمت بیان کی ۔ چنانچہ لوگ جب یہ تقریر سُن کر اُٹھے تو ان کی زبانوں پر اس تقریر کے سوا اور کسی بات کا چرچا نہ تھا ۔ اللہ تعالےٰ نے امر حق کو باطل پر دے مارا ۔ اور باطل کا بھیجا نکال دیا ۔ اور باطل دیکھتے ہی دیکھتے نیست و نابود ہو گیا ۔[1]

---

[1] یہ نکتہ قرآن کریم کی اس آیت سے ماخوذ ہے کہ ، بل تقذف بالحق علی الباطل فیدمغہ فاذا ہو زاہق ۔

البحر الصغیر میں دعوت

شیخ احمد المدنی ۱۹۳۰ء سے میت مرجا سلیسل (ایک مقام کا نام) میں اخوان کے نائب چلے آرہے ہیں۔ انھوں نے مجھے اپنے ایک خط میں خفگی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ میں نے میت مرجا میں دعوتِ اخوان کی اشاعت اور اخوان کی ثابت قدمی اور استقامت پر کچھ نہیں لکھا[1]۔ میت مرجا کے اخوان گروہ اول کے لوگوں میں سے ہیں اور اب تک اپنے عہدِ اوّلین پر استوار ہیں۔ شیخ احمد المدنی کو حق پہنچتا ہے کہ وہ میری اس چوک پر خفگی کا اظہار کریں۔ ان کی خفگی پسندیدہ اور اچھے نتائج پیدا کرنے والی ہے۔ انھوں نے اور ان کے فاضل رفقاء نے اپنے قصبے (میتِ مرجا) میں دعوت کی راہ میں جو جانفشانی اور کاوش کی ہے وہ نبرد آزما مجاہدین کی یاد دلاتی ہے۔ یہ حضرات راہِ حق پر آج تک ایک مخلص سپاہی اور صادق الایمان کارکن کی طرح ڈٹے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر عطا فرمائے۔

میں نے اب تک جو کچھ دعوت کے سلسلے میں لکھا ہے وہ نہایت اختصار و ایجاز پر مبنی ہے۔ میرا مدعا یہ ہے کہ میں اشارۃً یہ بتا دوں کہ گزشتہ دور میں دعوت کی رفتار کار کیا رہی ہے اور نئے مرحلوں میں قافلۂ دعوت کس رفتار سے جاری و ساری ہے۔ اخوان کو ان باتوں کے جاننے کا مدت سے شوق تھا۔ گو میرے نزدیک صرف اتنا ضروری ہے کہ یہ جانا جائے کہ وہ اصول اور بنیادیں کیا ہیں جن سے دعوت کا شجر مبارک نمودار ہوا ہے۔ تاہم میں شیخ احمد المدنی اور ان کے فاضل رفقاء کی حق رسی کی خاطر اور ان حضرات

---

[1] یہ ڈائری حسن البناؒ مرحوم جماعت کے رسائل میں بالاقساط لکھتے رہے ہیں۔ میت مرجا کے اخوان کو بھی اسی لیے شکایت پیدا ہوئی کہ ان رسائل میں جو قسطیں چھپ چکی ہیں ان میں میت مرجا کی جماعت کا ذکر نہیں ہے۔

کی اوّلیت و سابقیت کے اعتراف کے طور پر یہ گزارشات سپرد قلم کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اور ان کو بھی حق پر ثابت قدم رکھے۔ اور ہم سب کو سواء السبیل پر چلائے۔ میں ان فاضل رفقاء سے بھی معذرت چاہتا ہوں جن کی اس مبارک دعوت کے ساتھ وابستگی کی تفصیلات بیان کرنے کے لیے ان اوراق میں گنجائش نہیں رہی۔ ان کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ اللہ کے علم میں ہیں۔ اور وہ انھیں اجر سے نوازے گا۔ واللہ خیر و ابقےٰ۔ (اللہ ہی اچھا ہے اور باقی رہنے والا ہے)۔

"حسن البنّا کی پوجا کی جاتی ہے" ـــــ ایک الزام ـــــ

ایک روز دو مخلص ترین اخوان بڑے دُکھ میں ڈوبے ہوئے ناگہاں میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ شہر میں ہمارے خلاف ایک سخت افواہ پھیلی ہوئی ہے۔ اس طرح کی افواہوں کو برداشت کرنے کا یارا اب ہم میں نہیں رہا۔ آپ ہمیں اذن دیں کہ ہم ان لوگوں سے پورا پورا انتقام لیں جو ہمارے اوپر غلط الزامات لگا رہے ہیں۔ میں یہ سُن کر مسکرا دیا اور اُن سے عرض کیا کہ یہ صورت خیر کا ایک پہلو رکھتی ہے۔ اللہ تبارک و تعالےٰ کا ارشاد ہے:

لتبلونّ فی اموالکم و انفسکم ولتسمعن من الذین اوتو الکتاب من قبلکم ومن الذین اشرکوا اذیً کثیرا وان تصبروا وتتقوا فان ذلک من عزم الامور۔

"مسلمانو! تمہیں جان اور مال دونوں کی آزمائشیں آکر رہیں گی اور تم اہلِ کتاب اور مشرکین سے بہت سی تکلیف دہ باتیں سُنو گے۔ اگر ان سب حالات میں تم صبر اور تقویٰ کی روش پر قائم رہو تو یہ بڑے حوصلہ کا کام ہے۔"

لہٰذا ہمیں صبر اور تقویٰ کا دامن ہرگز نہ چھوڑنا چاہیے۔ یہ دعوت کی حقانیت کی دلیل

ہے کہ لوگ اس کے خلاف جھوٹی افترا پردازی کریں اور طرح طرح کی من گھڑت باتیں پھیلائیں ۔ آپ دونوں صاحب اس سے بے خبر نہیں ہیں کہ اسلام کی اوّلین تحریک کے بارے میں مخالفین کی طرف سے کیا کیا سخن سازیاں کی گئیں اور خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک پر کیسے کیسے کیچڑ اچھالی گئی ہے۔

الغرض اس موضوع پر میں ان کے سامنے مفصّل روشنی ڈالتا رہا۔ مگر وہ دونوں حضرات بڑی سنجیدگی اور کوفت کے ساتھ یہ کہنے لگے کہ یہ نئی الزام تراشی جو ہم سُن کر آئے ہیں اس پر تو ہم ہرگز خاموش نہیں رہ سکتے ۔ یہ ایک نہایت ہی خوفناک الزام ہے اور اسے وہ لوگ پھیلا رہے ہیں جو خاصے جانے پہچانے ہیں اور لوگوں کے اندر ان کا بڑا اثر و نفوذ ہے۔

میں نے پوچھا یہ الزام کیا ہے ؟ وہ بتانے لگے کہ یہ لوگ ـــــ الزام تراشی کرنے والے ـــــ یہ کہہ رہے ہیں کہ " آپ اپنے درسوں اور وعظوں میں ہم کارکنوں کو یہ تلقین کرتے ہیں کہ ہم اللہ کو چھوڑ کر آپ کی عبادت کریں ۔ چنانچہ اخوان المسلمون آپ کے ارشادات کے بموجب یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ شیخ حسن البنا نہ بشر ہے ، نہ نبی یا ولی ہے اور نہ پیر ہے بلکہ وہ ایک خدا ہے جو لائق عبادت ہے "

ہم لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہونے سے پہلے یہ کھوج لگا آئے ہیں کہ اس افواہ کا سرچشمہ کہاں ہے ۔ ہمیں یہ معلوم ہوا ہے کہ جو شخص یہ افواہ یا بہتان پھیلا رہا ہے وہ ایک عالمِ دین ہے اور ایک مذہبی منصب پر فائز ہے ۔ اور جو کچھ وہ کہہ رہا ہے لوگ اُسے سچ جان رہے ہیں ۔ ہم نے صرف کھوج کرید پر اکتفا نہیں کیا ۔ بلکہ ہم ان مولوی صاحب کے پاس گئے ہیں اور ان سے پوچھا ہے کہ آپ کو کس نے بتایا کہ اخوان المسلمون حسن البنا کو اپنا معبود قرار دیتے ہیں ۔ انھوں نے کہا : " میں نے تمہارے استاذ (حسن البنّا) سے اپنے کانوں سے یہ بات سُنی ہے "۔ ہم ان کا جواب سُن کر انگشت بدنداں رہ گئے ۔ اور ان سے بار بار یہی سوال کیا ۔ مگر وہ جواب میں یہی کہتے رہے کہ میں نے خود اپنے کانوں

سے آپ کو ایسا کہتے سُنا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم تو ہرگز ایسی بات کی تصدیق نہیں کر سکتے لیکن ہم آپ کے پاس حقیقتِ حال دریافت کرنے کے لیے آئے ہیں۔ سچی بات ہے کہ ان لوگوں کی جرائت پر ہمیں سخت حیرت ہو رہی ہے۔ بایں ہمہ ہم چاہتے ہیں کہ اس افواہ کی بنیاد اور اس الزام کی اصلیت ہمیں معلوم ہو۔

ان کی یہ بات مجھ پر بجلی بن کر گری۔ میں ششدر رہ گیا کہ لوگ ایک دوسرے کے خلاف اس حد تک عجیب و غریب چالیں چل سکتے ہیں۔ اب میں سوچنے لگا کہ کس مجلس کے اندر میں اور یہ مولوی صاحب اکٹھے ہوئے ہیں۔ یا کون سی ایسی بات ہوئی ہے جو اس افتراء پردازی کی کچھ نہ کچھ بنیاد فراہم کر سکتی ہے۔ لیکن مجھے کوئی ایسی مجلس یا بات یاد نہ آئی۔ چنانچہ میں فی الفور اُٹھ کھڑا ہوا۔ ان دونوں رفیقوں کو میں نے ساتھ لے لیا۔ اور اپنے فاضل مدرّس اخوان میں سے دو اور حضرات کو بھی میں نے بلوا لیا جن کے بارے میں مجھے علم تھا کہ ان کا مولوی صاحب کے ساتھ گہرا تعلق اور اچھی دوستی اور ملاقات ہے۔ میں نے ان دونوں حضرات کو ساری کہانی سُنائی اور عرض کیا کہ :

" ہمیں اسی وقت مولوی صاحب کے پاس جانا چاہیے اور ہمیں خود جا کر ان سے پوچھنا چاہیے کہ جو افواہ وہ پھیلا رہے ہیں اس کا ماخذ اور ثبوت کیا ہے۔ کیونکہ میں آپ سے صاف صاف کہتا ہوں کہ اپنے ان دونوں بھائیوں کی بات کا اعتبار کر لینے کے بعد جو انھوں نے مولوی صاحب سے نقل کی ہے میرے لیے کوئی چارۂ کار نہیں رہا کہ تحقیق احوال کی جائے۔ یا تو مولوی صاحب فریب خوردہ ہیں اور یا یہ دونوں حضرات ان کی بات اچھی طرح نہیں سمجھ سکے۔ اور یہ الزام بھی ایسا ہے کہ اس میں تساہل برتنا اسے نظر انداز کر دینا مناسب نہیں ہے۔ آیئے ہم مولوی صاحب کی طرف چلیں۔ چنانچہ ہم پانچوں افراد ان کی طرف روانہ ہوئے۔ ان کے گھر پر دستک دی۔ اور کمرۂ انتظار میں جا کر بیٹھ گئے ___ مولوی صاحب اندر سے نکلے اور ہمیں السلام علیکم کہا۔ جب انھوں نے ہماری جمعیت کو

دیکھا تو ان کا چہرہ زرد ہو گیا۔ ان کی آواز اور ان کی حرکات و سکنات میں لڑکھڑاہٹ پیدا ہو گئی۔ گویا انھوں نے محسوس کر لیا کہ کوئی افتاد ان پر آ پڑی ہے۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ سیدھا ان سے کہا :

" استاذ صاحب، ان دونوں بھائیوں نے ابھی ابھی مجھ تک یہ بات پہنچائی ہے کہ آپ نے یوں یوں کہا ہے اور آپ نے ان سے نہایت یقین و اعتماد کے ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ یہ بات آپ نے اپنے کانوں سے میری زبان سے سُنی ہے۔ کیا ان دونوں صاحبوں نے آپ کی طرف سے جو کچھ نقل کیا ہے وہ صحیح ہے اور آپ نے یہ بات درست کہی ہے؟"۔ مولوی صاحب نے کہا: "ہاں درست ہے"۔ میں نے کہا: " لہٰذا ان دونوں حضرات کی پوزیشن تو صاف ہو گئی۔ انھوں نے ادائے امانت میں کوئی تقصیر نہیں کی۔ میں ان دونوں کی جانب متوجہ ہوا اور ان سے کہا: " اللہ تعالےٰ اس امانت داری پر آپ دونوں حضرات کو جزائے خیر عطا فرمائے "۔

اب میں نے دوبارہ روئے سخن مولوی صاحب کی طرف کر لیا۔ اور عرض کیا:

"اُستاذ صاحب آپ نے کب مجھ سے ایسی بات سُنی تھی کہ میں معبود ہوں اور میرے پیروکاروں کو میری پرستش کرنی چاہیے ہے"۔ مولوی صاحب نے جواب دیا: " میرا خیال ہے کہ تقریباً ایک ماہ ہوا ہم مسجد کے چبوترے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اتنے میں ایک مدرس جن کا نام محمد اللیثی افندی تھا آئے اور ہمارے ساتھ بیٹھ گئے۔ پھر اخوان آنے لگے اور وہ آپ کو بڑے عشق اور احترام کے ساتھ سلام کرنے لگے۔ یہ دیکھ کر محمد اللیثی افندی آپ سے کہنے لگا: " استاذ محترم اخوان کو آپ سے پرستش کی حد تک محبت ہو چکی ہے "۔ آپ نے اسے جواب دیا: " اگر یہ محبت خالصتہً لوجہ اللہ ہے تو ایسی محبت کا کیا کہنا۔ ہم اللہ سے درخواست کرتے ہیں کہ ہمارے اندر زیادہ سے زیادہ ایسی محبت پیدا کرے۔ آپ نے امام شافعیؒ کے اس شعر کو بھی بطور مثال پیش کیا تھا :

ان کان رفضا حب آل محمّد   اگر آل محمدؐ سے محبت رفض ہے تو
فلیشہد الثقلان انی رافض   جن و انس گواہ رہیں کہ میں رافضی ہوں

میں نے مولوی صاحب سے کہا: "ہاں یہ واقعہ مجھے یاد ہے"۔ وہ کہنے لگے: "تو پھر کیا اس کا صاف مطلب یہ نہ ہوا کہ یہ لوگ آپ کی پوجا کرتے ہیں"۔ یہ لفظ ان کی زبان سے نکلے ہی تھے کہ ایک اخوانی جو میرے ساتھ آیا تھا اور ان کا دوست اور ہم پیشہ مدرس تھا، فوراً اٹھا اور ان پر برس پڑا اور انھیں سب و شتم کرنے لگا۔ بلکہ ان کے گھر کے اندر ہی ان کی پٹائی کے لیے لپکا۔ اور ان سے مخاطب ہو کر کہنے لگا:

" استاذ یہی کچھ تو نے پڑھا ہے ؟۔ یہ ہے تیرا مبلغ علم، یہ ہے تیری سخن فہمی کا حال۔ یہ ہے مجلسی گفتگوؤں میں تیری امانت داری۔ یہ ہیں لوگوں کی باتوں کو دوسروں تک نقل کرنے میں تیری صداقت شعاری کے حدود اربعہ۔ ہم لوگ دونوں میں حائل ہو گئے اور بیچ بچاؤ کر دیا۔ میں مولوی صاحب کی طرف متوجہ ہوا اور ان سے کہا: " استاذ صاحب، آپ نے یہ گفتگو تو نقل کر دی اور آپ کو حق پہنچتا ہے کہ آپ اس کے اندر جو چاہیں مفہوم پیدا کر لیں۔ لیکن آپ نے اپنے پاس سے یہ اضافہ کر دیا ہے کہ میں خود اخوان کو یہ حکم دیتا ہوں کہ وہ غیر اللہ کی عبادت کریں۔ (حاشا للہ، خدا کا دین اس قسم کی خرافات سے بہت بالا و برتر ہے) اور یہ کہ اخوان کا یہی عقیدہ ہے اور اسے آپ نے میری زبان سے سُنا ہے۔ آپ نے میری گفتگو کا یہ حصّہ حذف کر دیا ہے کہ میں نے محمد اللیثی افندی کو ایسے الفاظ استعمال کرنے پر سختی کے ساتھ زجر و توبیخ کی تھی۔ اور ان سے کہا تھا کہ یہ اندازِ کلام غیر اسلامی ہے۔ یورپی لٹریچر اور مغرب کی آوارگیٔ فکر کی بدولت ہمارے اندر ایسے غیر محتاط اسالیب داخل ہو چکے ہیں۔ اور ہمارے زبان و قلم پر اندھی تقلید کے نتیجے میں جاری و ساری ہو گئے ہیں۔ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اس قسم کی عبارات و الفاظ سے اجتناب کرے۔ استاذ صاحب آپ نے کہانی

تو یاد رکھی مگر میرے تبصرے اور تنقید کو فراموش کر دیا۔ بہر حال آپ کی ہم پر یہی عنایت کافی ہے اب حقیقتِ حال روز روشن کی طرح واضح ہو چکی ہے۔"

لیکن اخوان جو سب کے سب مولوی صاحب کے دوست اور ساتھی تھے، اتنی سرزنش پر اکتفا نہ کر رہے تھے۔ انھوں نے مولوی صاحب کے لیے لازم قرار دیا کہ وہ اخوان کے کسی اجتماع عام میں اس معاملے کی صاف صاف وضاحت کریں۔ ورنہ وہ خوب جانتے ہیں کہ کیسے ان کو چھٹی کا دودھ یاد کرائیں گے۔ چنانچہ مولوی صاحب نے ان کی تجویز کو مان لیا اور وہ اپنے دوستوں کے حکم کے آگے جھک گئے۔ اور اخوان کے پہلے اجتماعِ ہفتہ وار میں انھوں نے کھڑے ہو کر تمام قصہ بیان کیا اور اعلان کیا کہ ان کا مدّعا صرف کہانی کو جوں کا توں نقل کرنے کا تھا۔ وہ اخوان کے شکر گزار ہیں۔ ان کی دعوت عوام النّاس کے دلوں میں علی العموم اور نوجوانوں کے اندر علی الخصوص بہت اچھے اثرات پیدا کر رہی ہے ——— آمدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت۔

یمن کی ایک ذمہ دار شخصیّت سے رابطہ

۱۳۴۸ھ میں قاہرہ کی انجمن شبان المسلمین نے ہجرت نبوی ؐ کی یاد میں ایک جامع محفل منعقد کی۔ اس محفل میں اہلِ علم و نظر حضرات کی کثیر تعداد نے تقریریں کی۔ محفل میں میں نے بھی ایک مختصر تقریر کی۔ میری تقریر کا عنوان تھا "ہجرت نبوی ؐ اور دعوت اسلامی"۔ انجمن شبان المسلمین کی طرف سے منتخب تقریروں پر مشتمل جو کتابچہ شائع کیا گیا تھا اس میں یہ تقریر بھی شامل کی گئی۔

اجتماع میں جو حضرات شریک ہوئے تھے ان میں یمن کے سیّد محمد زبّارہ الحسن بھی تھے۔ یہ اس وقت صنعاء میں قصر السعید کے گورنر تھے۔ تقریر کے بعد مجھ سے آکر ملے، اور ہم دیر تک مصر اور یمن کے حالات پر بحث کرتے رہے کہ کس طرح ان ملکوں میں الحاد اور اباحیت کی وبا پھوٹ رہی ہے اور کس طرح اس امر کی ضرورت ہے کہ پوری ہمت و جرأت کے

ساتھ اس سیلابِ بلا کو روکا جانا چاہیے۔ اس گفتگو کے بعد ہمارے درمیان دوستی کے رشتے نہایت مضبوط و مستحکم ہو گئے۔ اور موصوف نے مجھے پیش کش کی کہ یمن میں مدرس کی حیثیت سے کام کروں۔ چنانچہ اس مسئلے پر ان کے درمیان اور امام یمن[1] اور سیف الاسلام محمد رحمہ اللہ کے درمیان مراسلت بھی ہوتی رہی۔

مؤخر الذکر بڑے اصلاح پسند تھے۔ اور اصلاح کی بڑی رغبت اور خواہش رکھتے تھے اور ان کی آرزو تھی کہ یمن اصلاح کے راستے پر جلد از جلد گامزن ہو جائے۔ میرے اور سیف الاسلام محمد رحمہ اللہ کے مابین بھی مسئلہ مذکور پر براہِ راست خط و کتابت ہوئی۔ اور ہم غائبانہ طور پر ایک دوسرے سے متعارف ہوئے۔ لیکن پیش آمدہ سرکاری رکاوٹوں کی وجہ سے یمن جانے کا ارادہ شرمندۂ تکمیل نہ ہو سکا۔ اس لیے کہ اس دور میں مصر پر انگریزوں کی طرف سے جو سیاست مسلط کی جا چکی تھی اس کا تقاضا تھا کہ مصر کو کسی حال میں عرب ممالک کے ساتھ اپنا رشتہ استوار نہیں کرنا چاہیے۔

سید محمد الذبارہ اسماعیلیہ تشریف لائے اور ہمارے ہاں تین روز قیام رکھا۔ اور انھوں نے اخوان کے ادارے اور منصوبے مشاہدہ کیے۔ حرا کی اسلامی درس گاہ دیکھی، مدرسہ امہات المؤمنین کا معائنہ کیا، اسکاؤٹس (فرقۃ الرحلات) کی کارکردگی ملاحظہ کی۔ درسوں اور تقریروں میں اخوان کا مطالعہ کیا ———— اخوان کے دل للہی محبت، اخوت اور اسلامی غیرت کے جن جذبات سے لبریز تھے اُن کا

---

[1] ان دنوں یمن کا امام حمید الدین یحییٰ تھا یحییٰ اُس کا نام تھا اور حمید الدین المتوکل علی اللہ خطاب تھا۔ ۱۳۳۶ھ تا ۱۳۶۷ھ اس نے یمن پر حکومت کی۔ وہ استبداد و سخت گیری میں مشہور تھا۔ اُس کا لڑکا سیف الاسلام محمد بڑا متدین، معتدل مزاج اور اسلام کا درد رکھنے والا تھا۔ امام یحییٰ کی وفات کے بعد سیف الاسلام محمد کے بجائے سیف الاسلام احمد یمن کا امام مقرر ہوا۔

اندازہ کیا۔ ان سب چیزوں کو دیکھ کر وہ بہت مسرور ہوئے۔ ہمارا یہ رابطہ اب تک ان کے ساتھ قائم ہے۔ وما کان للہ دام واتصل (اللہ کے لیے جو کام ہو اُسے دوام اور تسلسل نصیب ہوتا ہے)۔

مال وجاہ کا فتنہ

یہ دونوں چیزیں ہمیشہ جھگڑے کی بنیاد بنتی رہی ہیں۔ اس دنیا کے اندر ہمیشہ یہی نزاع کی جڑ اور ہوس کی گانٹھ ثابت ہوئی ہیں۔ اسماعیلیہ کے اندر اخوان باہمی محبت روحانی ہم آہنگی اور صفائے دل، جسے کوئی چیز مکدر نہیں کرتی تھی، کا پاکیزہ اور شفاف نمونہ رہے ہیں۔ خدا کی راہ میں انفاق، جوشِ عمل، قربانی، راہِ دعوت میں صعوبتوں کو برداشت کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش ان کا عام وطیرہ تھا۔ دعوت کی راہ میں جو موانع حائل ہوتے اُنھیں ہیچ سمجھتے۔ وہ اس آیت قرآنی کا صحیح مصداق ہیں کہ:

> یحبون من ھاجر الیھم ولا یجدون فی صدورھم حاجۃ مما اوتوا ویؤثرون علی انفسھم ولو کان بھم خصاصۃ
>
> "یہ ان لوگوں سے محبت کرتے جو ہجرت کر کے ان کے پاس آئے ہیں اور جو کچھ بھی ان کو دے دیا جائے اُس کی کوئی حاجت تک یہ اپنے دلوں میں محسوس نہیں کرتے اور اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ اپنی جگہ خود محتاج ہوں۔"

جب یہ اسکول کھولے گئے، اور مختلف منصوبے جاری کیے گئے تو ان میں ایسے افراد ملازم رکھے گئے جو بے شک اعلیٰ سندوں کے حامل اور رسمی تعلیمی قابلیتوں سے متصف تھے۔ مگر روحانی نکھار اور دعوت اور اہلِ دعوت کی سی تربیت کا انھیں

بہرہ وافر نہ ملا تھا۔ اخوان کے معاشرے میں جو مقاصد و وسائل اور نظریات کے لحاظ سے ایک نہایت متحد اور ہم آہنگ معاشرہ تھا ایک بے جوڑ عنصر کا اضافہ ہو گیا۔ اس پر مستزاد یہ کہ یہ ملازمین جو اپنی روح و فکر میں اخوانی ماحول کے لیے نامانوس تھے تحریک کے عہدوں کے لالچ میں مبتلا ہو گئے اور بزعمِ خویش تحریک کے مال و متاع پر نظریں جمانے لگے۔ یہ تحریک کسی روز بھی مال دار نہ ہوئی تھی۔ اس کے مطالبات اور تقاضے ہمیشہ اس کے محدود وسائل کے رہینِ منت رہتے۔ اس کا بیت المال ہمیشہ مفلس کا چراغ بنا رہتا۔ بایں ہمہ اللہ کی مشیّت سے تحریک کے تمام منصوبے اور ادارے اخوان کی جیبوں کی طفیل، جو تحریک کا اصل خزانۂ عامرہ ہوتی تھیں اور تحریک ان جیبوں پر جیسے اور جب چاہے تصرف کرتی رہتی تھی، کامیابی سے ہمکنار رہتے تھے۔ چنانچہ ان ملازمین ـــــ بیرونی اور غیر مانوس عنصر ـــــ کو یہ سوجھی کہ وہ اخوان کے اندر چغل خوری اور بدگوئی کو رواج دیں اور ان کے اندر ریشہ دوانیاں اور سازشیں کریں تاکہ وہ ان ہتھکنڈوں کی بدولت بزعمِ خویش تحریک کے تعلیمی اور رفاہی اداروں کے اندر ہی نہیں خود تحریک کے ڈھانچے میں بڑے بڑے مناصب پر براجمان ہو جائیں اور بدیں وسیلہ وہ جماعت کے تمام ذرائع آمدنی پر قابض ہو جائیں۔ جس شخص نے اس سازش کا بڑا حصہ اپنے سر لیا، اس کی طرف دعوت دینے کی سرپرستی اختیار کی۔ اور اُسے بروئے کار لانے کے لیے پروگرام وضع کیا، وہ ایک عالم فقیہ، ادیب طرّار خطیب شیریں زبان اور متکلّم فصیح اللسان تھا۔ درس گاہ حراء میں انھیں مدرس مقرر کیا گیا تھا۔ ان کی صلاحیتوں کی قدردانی کی گئی اور اجتماعات کمیٹی کی صدارت اور مسجد اخوان میں بعض درسوں کی صدارت انھیں سونپی گئی۔ ہر شخص انھیں احترام و عزت کی نگاہ سے دیکھتا۔ ان کے دل میں یہ شوق امڈ آیا کہ وہ اسماعیلیہ کی جماعت کے صدر بن جائیں اور خصوصاً اس لیے کہ انھیں معلوم تھا کہ میں سرکاری ملازم ہوں اور

ایک نہ ایک روز اس شہر سے جس میں مَیں تقریباً چار سال گذار چکا ہوں۔ یہاں سے کسی دوسرے شہر تبدیل کر دیا جاؤں گا مگر وہ صاحب یہ بھول گئے کہ وہ خود بھی ملازم ہیں اور مجھ سے بڑھ کر وہ خود بھی ہر لمحہ تبدیلی اور سبکدوشی دونوں باتوں کی زد میں رہتے ہیں۔ اور پھر انھوں نے اپنی خواہش کو جامۂ عمل پہنانے کے لیے قدرتی راستہ بھی اختیار نہ کیا۔ قدرتی راستہ یہ تھا کہ وہ اخلاصِ عمل کا ثبوت دیتے اور فنا فی الدعوۃ ہونے کا مظاہرہ کرتے۔ بلکہ انھوں نے اینچ پیچ کا راستہ اختیار کیا: دسیسہ کاری، تفرقہ اندازی اور چغل خوری کا مکروہ راستہ!! انھوں نے اخوان کی مجلسِ عاملہ کے بعض ارکان سے محبت کی پینگیں بڑھالیں جن کے بارے میں انھیں خیال تھا کہ اخوان کے اندر انھیں بڑا اثر ورسوخ حاصل ہے۔ چنانچہ وہ مسلسل ان ارکان کے ساتھ رشتۂ مودّت کو پختہ کرتے رہے۔ ان کی کثرت سے ملاقاتیں کرنے لگے اور خود انھیں بھی ملاقات کی دعوت دیتے رہے۔ ہم سب ان سرگرمیوں کو ایک پاکیزہ اور بے لوث فعل سمجھے۔ اور خود اخوان کی دعوت بھی بے داغ تھی۔ بلکہ اخوان کی دعوت اس کے سوا اور کیا ہوسکتی تھی کہ منسلک اخوان کے مابین روحانی واخلاقی روابط پختہ سے پختہ تر کیے جائیں۔

اخوانِ اسماعیلیہ کے لیے سربراہ کا تقرر

اخوان کو یہ خدشہ تھا کہ بیشتر اس کے کہ مَیں اُن میں سے کسی ایک کو جانشین بناؤں جو بارِ دعوت کو اٹھائے اسماعیلیہ سے کسی دوسری جگہ تبدیل نہ کر دیا جاؤں۔ انھوں نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ مجھے اس موضوع پر غور وفکر کی دعوت دی تا کہ وہ ایسی ناگہانی تبدیلی سے کسی ناگہانی افتاد سے دوچار نہ ہو جائیں۔ مجھے بھی یہ بات بڑی وقیع نظر آئی۔ اور ایک عرصہ تک میرے دل ودماغ پر چھائی رہی۔ اور آخر کار

میں نے اس ذمہ داری کے لیے اخوان میں سے ایک صاحب شیخ علی الجدادی کو تجویز کر دیا۔ وہ اخلاقی اور دینی لحاظ سے اخوان میں سے بہتر شخص تھے۔ علم و دانش میں بھی انھیں مناسب حصہ ملا تھا، قرآن شریف کی تلاوت بڑے حسین انداز میں کرتے تھے، بحث و مباحثہ میں خوش اسلوبی سے حصہ لیتے تھے۔ درس و مطالعہ پر مداومت رکھتے تھے۔ اور اس سب پر مستزاد یہ کہ وہ ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے دعوت کو قبول کرنے میں سبقت کی تھی اور بنا بریں وہ اخوان کے دلوں سے قریب تر اور ان کی نگاہ میں محبوب تر انسان تھے۔ میں نے اخوان کا اجتماع عام بلایا اور میں نے ان کے سامنے بعض احباب کا یہ خیال رکھا کہ اخوان کا کوئی سربراہ مقرر کیا جانا چاہیے۔ (جو مرشد عام کا نائب کہلائے) اور وہ میری اچانک تبدیلی یا کسی اور حادثے سے پہلے پہلے ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھا لے۔ تمام حاضرین نے اس خیال کا خیر مقدم کیا اور پھر میں نے تجویز کردہ شخص شیخ علی الجدادی کا نام اُن کے سامنے پیش کیا۔ انھوں نے اس انتخاب پر ہمہ گیر مسرت اور شادمانی کا اظہار کیا اور بالاتفاق اس کی تائید کی۔ بلکہ بعض نے تو جوش میں آکر یہ تجویز بھی کیا کہ شیخ علی الجدادی اپنا کاروبار چھوڑ دیں اور انھیں اخوان کی مسجد کا امام مقرر کر دیا جائے اور تحریک کے بیت المال سے ان کا ماہانہ معاوضہ مقرر کر دیا جائے تاکہ موصوف خوش اسلوبی کے ساتھ دعوتی کام کو سرانجام دے سکیں۔ موصوف اس وقت نجّاری کا کام کرتے تھے اور ان کی اپنی ذاتی دکان تھی۔ تمام حاضرین نے اس تجویز پر بھی موافقت کا اظہار کیا۔ خود میں نے بھی اس کی تحسین کی۔ کیوں کہ میرا یہ نظریہ ہے کہ تحریکی کام کے لیے ہمہ وقتی کارکنوں کی فراہمی بڑی افادیت کی حامل ہے۔ شیخ علی الجدادی کے لیے برائے نام ماہانہ معاوضہ مقرر کر دیا گیا جس پر مردِ حق راضی ہو گیا۔ اس لیے کہ وہ ہمارے قافلے میں قربانی کے اصول پر شریک ہوئے تھے نہ کہ مادی مفاد کی خاطر۔ اسماعیلیہ کے تمام اخوان کا الحمد للہ یہی وطیرہ ہے۔ ہماری ان مسرتوں کے چشمۂ صافی

کو صرف ایک احساس گدلا کر جاتا تھا۔ وہ یہ کہ یہ صورتِ حال ہماری جدائی کا پیغام ہے۔ اور اس بات کی علامت ہے کہ یہ جدائی قریب تر ہوا چاہتی ہے۔

تحریک کے خلاف پہلی داخلی سازش

شیخ مذکور نے ـــــ جو اخوان کی سربراہی کے امیدوار تھے ـــــ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ اس نئے نظم کی بدولت اخوان کی سربراہی کے لیے جو اُمنگ ان کے دل میں اُبل رہی تھی اُس سے محروم کر دیے گئے ہیں۔ اب نائب المرشد[1] بالفعل منتخب کیے جا چکے ہیں تو کیا انھیں اب مہر بلب رہنا چاہیئے جب کہ وہ اس منصب کے لیے اپنی ذات کو اس "بڑھئی" سے زیادہ قابل، زیادہ عالم، زیادہ قادر اور زیادہ اہل سمجھتے ہیں؟ علم و صلاحیت کے اعتبار سے کہاں حضرت شیخ اور کہاں "میاں نجار"۔ حضرت شیخ کے پاس ایک طرف ازہر کی العالیہ (ایم۔ اے) کی ڈگری ہے اور دوسری طرف وہ بڑے پائے کے شعر کہتے ہیں، خطابت اور اظہارِ خیال میں اونچی دستگاہ رکھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ کیسے دعوت کو فروغ دیا جا سکتا ہے اور لوگوں سے راہ و رسم کی جا سکتی ہے۔ لہٰذا (اس منصب کو ہاتھ میں لینے کے لیے) انھیں لازماً کوشش کرنی چاہیئے۔ کوئی ٹھوس کوشش اور باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ۔ وہ دانش منداور گھاگ تو ہیں ہی۔ چنانچہ مولوی صاحب نے اپنے ان دوستوں کا سہارا لیا جن کے ساتھ وہ اپنے روابط پہلے سے مستحکم کر چکے تھے۔ بلکہ ان میں سے ایک صاحب کو انھوں نے اپنی خاص الخاص دوستی کے لیے مخصوص کر رکھا تھا چنانچہ ان صاحب کو انھوں نے

---

[1] اخوان کے سربراہ کا رسمی لقب مرشد عام ہے۔ یعنی مرکزی رہنما اور نگران۔ یہ لقب حسن البنا شہیدؒ کے لیے بھی اختیار کیا گیا اور ان کے بعد موجودہ سربراہ حسن الہضیبی کے لیے بھی یہی لقب استعمال ہوا ہے اور اب یہ ان کی رسمی اصطلاح بن چکا ہے۔

شیشے میں اتارنا شروع کر دیا۔ اور شب و روز ان کے دل میں وسوسہ اندازی میں لگ گئے اور انھیں قائل کرتے رہے کہ وہ اپنے بھائی نجّار سے زیادہ باصلاحیت ہیں اور منصب نیابت کے لیے وہ زیادہ موزوں ہیں۔ استاذ صاحب (یعنی راقم) نے میری حق تلفی کی ہے، اور میری قربانیوں کی قدر نہیں کی ہے۔ میں بڑی بڑی آزمائشیں جھیل چکا ہوں، تحریک کے لیے مال بھی بہت خرچ کرتا رہا ہوں، میری جدوجہد کی فہرست بھی طویل ہے، میں استاد کے ساتھ انتہائی مخلص رہا ہوں۔ میں نے اپنا سرمایہ اپنی زندگی، اپنے اہل وعیال اور اپنا مستقبل ہر چیز استاذ اور تحریک پر نچھاور کیے رکھی ہے لیکن شیخ علی الحدادی نے ان سب کاموں میں سے کیا کام سرانجام دیا ہے؟ کچھ بھی تو نہیں کیا۔ نہ اس نے کوئی انفاق کیا، نہ مجاہدہ کیا، نہ اُس نے میرے جیسے اخلاص کا ثبوت فراہم کیا۔ بایں ہمہ استاذ اپنے وفادار اور تحریک کے مخلص ترین رفیق کو پسِ پشت ڈال کر کیوں ایسے شخص کو تجویز کرتے ہیں جو اُس سے کم مخلص اور دوں حیثیت ہو۔ یہ تو ظلم مبین ہے۔ علاوہ برآں جنرل کونسل کی میٹنگ بھی غیر قانونی طور پر منعقد ہوئی ہے یہ میٹنگ اچانک بلائی گئی ہے اور اس کی دعوت اکثر ایسے ارکان کو نہیں پہنچی جو اگر شریک ہو جاتے تو احتمال تھا کہ ان کی رائے کچھ اور ہوتی۔ اس طریقِ کار سے ان لوگوں کا رائے دہی اور اظہارِ خیال کا حق پامال ہوا ہے۔

یہ شیخ ـــــ شیخ علی الحدادی ـــــ مسجد کی امامت پر ماہانہ معاوضہ جو تین پونڈ مقرر کیا گیا ہے کیسے وصول کر سکتا ہے جب کہ جماعت مقروض ہے، اور ابھی اس کے ذمّہ مسجد اور مدرسہ اور دیگر عمارات کے مصارف بھی باقی ہیں۔ اور وہ تین سو پچاس پونڈ سے بھی زیادہ بنتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں فضیلت مآب مولوی صاحب اس امر کے لیے تیار ہیں کہ امامت کے فرائض رضا کارانہ طور پر سرانجام دیں اور صرف مدرسہ کی آمدنی پر کفایت کریں یا اگر انھیں معاوضہ لینے کی ضرورت

بھی پیش آئے تو وہ بہت معمولی ہوگا اور ماہانہ پچاس قرش سے متجاوز نہ ہوگا۔

اس طرح کی چکنی چپڑی باتیں جو قرآنی محاورے کے مطابق "باہر سے رحمت اور اندر سے عذاب" تھیں، مولوی صاحب کرتے رہے اور ان کا مقصد و مدعا اس کے سوا کوئی نہ تھا کہ سابقہ فیصلے کے اندر ایک دراڑ پیدا کر دی جائے جو اس فیصلے کو کالعدم قرار دینے کا ایک ذریعہ بن جائے۔ شیخ کی اصل تگ و دو تو یہ تھی کہ نیابت و امامت کی مسند پہ وہ متمکن ہو جائیں اور ہمارا یہ نیک دل بھائی ــ شیخ کے دوست خاص ــ شیخ کے اغراض و مقاصد کے لیے ایک مرکب بنا ہوا تھا۔ وہ شیخ کے وساوس پہ کان دھرتا رہا۔ یہاں تک کہ اس کا اندرون وساوسِ شیخ سے خوب بھر گیا۔ اور بے شک ابلیس کو ایسے دوست اور معاون مل جاتے ہیں جو ابلیس سے بڑھ کر کارگر باتیں کرتے ہیں، اس سے زیادہ کاری ضرب لگاتے ہیں۔ اس سے زیادہ چابکدست ثابت ہوتے ہیں اور انسانی قلوب کے ساتھ اس سے زیادہ قرب پیدا کر لیتے ہیں۔ ونعوذ باللہ من کل وسواس خناس من الجنۃ والناس۔ اُس نے شیخ کی بات اپنے بعض دوسرے اخوانی رفقاء اور دوستوں کے کان میں پھونکی۔ اسے سن کر کچھ لوگوں نے تو ہمارے اس بھائی کو سمجھایا بجھایا۔ اور بعض دیگر اس کی باتوں سے متاثر ہو گئے اور اس کے "درد" میں شریک ہو گئے۔ اخوان کے اندر یہ بات پھیل گئی۔ مجھے بھی یہ بڑی محسوس ہوئی۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ ہوا کس سمت سے چلی ہے۔ میں نے ان بھائی صاحب کو بلوایا اور ان کو سمجھایا بجھایا۔ مگر اُس کے ذہن و فکر کے آخری گوشوں تک یہ خیال رچ بس چکا تھا اور شیخ کے افضل و اولیٰ ہونے کا نظریہ ان پہ ہر لحاظ سے چھایا ہوا تھا۔ اور اسے شیطان نے ان کی نظروں میں اس حد تک خوشنما بنا دیا تھا کہ وہ سمجھتے تھے کہ اس میں تحریک کا مفاد ہے اور وہ یہ سخت رویہ اپنی ذات کے لیے نہیں

بلکہ مصلحت عمومی کی خاطر اختیار کیے ہوئے ہیں ـــــ درحقیقت یہی وہ روزن ہے جس سے شیطان ہمیشہ اہل ایمان کے دلوں میں راہ پالیتا ہے اور ان کے ایمان کی صداقت اور قلوب کی پاکیزگی کو خراب کر دیتا ہے۔ تین اور اخوانی دوست بھی اس کے حامی اور ہمنوا ہو گئے۔ ان کی حمایت کا پہلا محرک تو ان کی باہمی دوستی تھی اور دوسرا خود شیخ کی وسوسہ اندازی بھی اس میں شامل ہو گئی، اور تیسری وجہ یہ ہوئی کہ یہ لوگ شیخ علی الجدادی سے طبعی طور پر متنفر تھے اور وہ جس منصب پر پہنچ گئے تھے اُس پہ حسد کرتے تھے۔ مگر ان تمام محرکات کا ظاہری عنوان تھا: "تحریک کا مفاد اور فروغِ دعوت کی تڑپ!!"

سازش کو ختم کرنے کے لیے میری مخلصانہ تگ ودو

میں نے طے کر لیا کہ اس فتنے کو بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکوں۔ اور ان حضرات کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہنے دوں۔ اس لیے کہ میں ان کی رفاقت کا بڑا حریص تھا، ان کے بارے میں حسنِ ظن رکھتا تھا، تحریک کے اندر ان کی سابقیت اور تحریک کے لیے ان کی خدمات اور قربانیوں کا قدردان تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ ایسے کارکنوں کا حصول جو مے خانۂ دعوت سے خوب فیض یاب ہو چکے ہوں اور دعوت کی گود میں پل کر جوان ہو چکے ہوں نہایت کٹھن اور دشوار ہے اور ایک نئی کاوش اور کوشش کا متقاضی ہے۔ اس کے لیے بڑی تربیت درکار ہوتی ہے جو وقت بھی چاہتی ہے اور محنت بھی۔ اور پھر کچھ اخوت کی پاسداری اور اخوان کے ساتھ محبت و شفقت کا تقاضا بھی ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جو تعریف فرمائی اُس میں ان حقائق ومعانی کو کیا خوب واضح اور عیاں فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: عزیز علیہ ما عنتم حریص علیکم بالمومنین رؤف رحیم (تم لوگوں کے پاس ایک رسول آیا ہے جو خود

تم ہی میں سے ہے، تمھارا نقصان میں پڑنا اس پر شاق گزرتا ہے، تمھاری فلاح کا وہ حریص ہے ایمان لانے والوں کے لیے وہ شفیق و رحیم ہے)۔ دعوت کے علم برداروں کا فرض ہے کہ وہ ان اخلاقِ نبویؐ کے جویا ہوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اُن کے لیے اُسوۂ حسنہ ہو۔ اور اہلِ ایمان کو جو تکلیف و مشقت پہنچے وہ ان پر گراں گذرے، وہ اپنے اندر باہمی اخوت اور صاف دلی کو قائم رکھنے کا زیادہ سے زیادہ لالچ کریں اور باہم شفیق و رحیم بن کر رہیں۔

چنانچہ ان تمام پہلوؤں کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں نے یہ پسند نہیں کیا کہ مذکورہ اخوان کا سخت گیرانہ مواخذہ کروں یا انھیں سزا دینے میں عجلت دکھاؤں یا انھیں برطرف کر کے ان میں اور اخوان میں بُعد پیدا کر دوں۔ بلکہ میں نے وہ طریقہ اختیار کیا جو بہتر بھی تھا اور خوب تر بھی۔ میں نے انھیں اپنے ہاں جمع کیا اور ان سے پوچھا کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ "ہماری خواہش یہ ہے کہ آپ اپنے نائب کا منصب ان صاحب (شیخ علی الجداوی) کو نہ سونپیں۔" میں نے کہا: "خوب، آپ حضرات کی تو یہ خواہش ہے لیکن آپ کے بھائی بندوں کی خواہش دوسری ہے۔ انھوں نے تو مذکورہ اخ کو منتخب کر لیا ہے اور نیابت کی ذمہ داری ان کے حوالے کر دی ہے اگر میں آپ کی خواہش پوری کرتا ہوں تو اس سے آپ کے بھائیوں کی خواہش کی نفی ہوتی ہے۔" وہ کہنے لگے: ہرگز نہیں، وہ سب اجتماع میں حاضر نہیں تھے۔ اگر تمام حاضر ہو جاتے تو ان کی کچھ اور رائے ہوتی۔ اجتماع آناً فاناً بلایا گیا ہے۔ اور مقصودِ اجتماع بھی غیر واضح تھا۔ میں نے عرض کیا: "اگر ہم تمام اخوان کو از سرِ نو اجتماع کی دعوت دیں، اور غرضِ دعوت بھی واضح کر دیں اور ہر فرد کو یہ موقع دیں کہ وہ پوری آزادی سے اپنی رائے کا اظہار کرے تو کیا پھر آپ لوگ جماعت کی رائے تسلیم کر لیں گے؟" ان سب نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے کہا: "خوب! پھر یہ کوئی

گھاٹے کی بات نہیں۔ آیئے ہم اسی اصول پر اللہ تعالیٰ سے عہد کریں۔ چنانچہ ہم نے اللہ تعالےٰ سے اس اصول کی پابندی کا عہد کیا۔ اور اجتماع کا وقت بھی طے کر لیا۔ اخوان کو دعوت نامے جاری کر دیئے گئے جن میں اجتماع کا منشا کھول دیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ بظاہر اخوان کے لیے بالکل نیا تھا اور جماعتی نظم کے لیے جو وحدتِ کاملہ اور مکمل ہم آہنگی کے سوا کسی چیز سے آشنا نہ تھا، یہ صورت غیر مانوس اور انوکھی تھی۔ ان میں سے ایک کی رائے سب کی رائے ہوتی تھی، اور وہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے اس قول مبارک کا عملی مظہر تھے کہ تری المومنین فی توادھم وتراحمھم وتعاطفھم کمثل الجسد الواحد (اہل ایمان کو باہمی مؤدت، باہمی رحم دلی اور باہمی شفقت میں جسم واحد کی مانند دیکھو گے) اور المسلمون عدول بعضھم علی بعض یسعی بذمتھم ادناھم وھم ید علی من سواھم (مسلمان ایک دوسرے کے حق میں عادل ہوتے ہیں اور ان کا ایک معمولی فرد بھی ان کی حفاظت کے لیے کوشاں رہتا ہے اور وہ غیروں کے مقابلے میں یکمشت ہوتے ہیں)۔ مگر میں نے یہ صورت بھلائی کو ترجیح دیتے ہوئے اور انسداد فتنہ کی خاطر قبول کر لی۔ یہ لوگ زبان سے جو کچھ ظاہر کر رہے تھے میں اس سے بڑھ کر ان کے دلوں کو بھی پڑھ رہا تھا۔ چنانچہ میں نے شیخ علی الجدادی کو اشارہ کیا کہ اگر انتخاب کا نتیجہ آپ کے حق میں نکل آئے تو آپ ماہانہ معاوضہ سے دست برداری کا اعلان کر دیں اور یہ کہہ دیں کہ آپ مسجد کی خدمت بھی رضا کارانہ طور پر کریں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اخوان کا اجلاس منعقد ہوا۔ اور جب نائب کے انتخاب کا نتیجہ ظاہر ہوا تو کیا دیکھتے ہیں کہ ماسوائے ان چند حضرات کے باقی تمام اخوان نے شیخ علی الجدادی کے انتخاب میں حیرت انگیز اتفاق کا ثبوت دیا اور پھر شیخ علی الجدادی نے ان لوگوں کے سامنے گہرے تاثر میں ڈوب کر مذکورہ بالا تجویز کا یکایک اعلان بھی کر دیا۔ جس سے ان کے دلوں پر بڑا اثر ہوا اور وہ شیخ علی کے اس مؤقف اور شیخ علی کے بارے

میں اخوان کے مؤقف کو دیکھ کر آئینۂ حیرت بن گئے ـــــ ملاحظہ فرمائیے: چار اصحاب کو یہ اصرار ہے کہ وہ پانچ صد افراد سے بھی زیادہ لوگوں پر اپنی ذات کو مسلط کر دیں۔ اگر ان کی رائے نافذ نہ کی جائے تو پانچ صد افراد غلط اور خطا کار۔ اس لیے کہ چار اصحاب کو یہ ضد ہے کہ وہ ـــــ اپنی نظر میں ـــــ برحق اور صائب ہیں۔ جماعتوں کے اندر یہ صورتِ حال بڑی نرالی اور وحشت انگیز ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے یہ انتہائی حکیمانہ وصیت کر دی ہے کہ جو افراد جماعت کی رائے سے بغاوت کریں ان کی پورے حزم کے ساتھ گرفت کی جائے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

من اتاکم وامرکم جمیع یرید ان یشق عصاکم فاضربوہ بالسیف کائنًا من کان۔

"جو شخص تمھارے پاس آکر تمھارے اندر تفرقہ پیدا کرنا چاہتا ہے حالانکہ تم مجتمع ہو تو خواہ وہ کیسا ہی شخص ہو اُس کی گردن تلوار سے اُڑا دو۔"

مگر ہم مسلمان بہت بڑی حد تک اُن ڈھیلے ڈھالے نظاموں سے متاثر ہو چکے ہیں جو ڈیموکریسی اور آزادیٔ فرد کی اصطلاحات کے پردے میں پیش کیے جا رہے ہیں ڈیموکریسی اور آزادی کا کبھی یہ مطلب نہیں ہوتا کہ شیرازۂ وحدت کو پارہ پارہ کر دیا جائے اور دوسروں کے حقِ آزادی کے ساتھ کھیلا جائے۔

اخوان نے بلاشبہ جذبہ انگیز مؤقف کا مظاہرہ کیا۔ اجلاس کے بعد وہ مجھ پر ٹوٹ پڑے اور مجھے اپنے اموال میں سے اتنا حصہ پیش کرنے لگے کہ جس سے ان کے بھائی کے پاس معقول پونجی جمع ہو جائے کیوں کہ اس نے اپنا کاروبار بھی ترک کر دیا تھا اور اب نئی خدمت بھی رضاکارانہ طور پر سر انجام دینے کا اعلان کر دیا تھا لیکن میں نے انھیں اطمینان دلاتے ہوئے آگاہ کیا کہ ہم اس معاملے میں انھیں اپنے

حال پر نہ چھوڑیں گے۔ بلکہ مسجد کی دکانوں میں سے ایک دکان اُن کے لیے مخصوص کر دیں گے تاکہ وہ وہاں کوئی تجارتی کاروبار کر لیں یا تجارتی کی فیکٹری کھول لیں۔ یوں وہ مسجد اور مدرسہ کے جوار ہی میں رہیں گے۔ میں نے حاضرین کے لیے دعائے خیر کی۔ اور یہ خیال کیا کہ اب یہ جھگڑا یہیں ختم ہو جائے گا۔

دُوسری سازش

لیکن دلوں کی دنیا ایسی ہے کہ اگر ان کے کسی گوشے میں خواہشِ نفس جاگزیں ہو جائے تو وہ انھیں بھلائی سے اندھا اور سماعتِ حق سے بہرہ کر دیتی ہے۔ یہاں بھی ایسی کیفیت درپیش آئی۔ ہم اس اجلاس سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ مخالف گروپ کے افراد اپنے شیخ کے پاس گئے اور جو کچھ وقوع پذیر ہوا اُس پر سوچ بچار کرنے لگے جو قدرتاً اُن کے حق میں نہ تھا۔ سوچ بچار کے بعد انھیں یہ سوجھا کہ وہ اب دعوت اور تحریک کو بدنام کریں اور اپنے مشن کو خیر خواہی اور ہمدردی کا عنوان دیں۔ چنانچہ وہ یہ بات پھیلانے کے لیے نکل پڑے کہ استاذ حسن البنّا کا اس وقت تحریک کے کام کو کسی ایک اخوانی فرد کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا خواہ وہ کیسا ہی ہو دعوت کے لیے خطرناک ہے۔ تحریک اس وقت تاجروں کی مقروض ہے۔ مسجد اور مرکز کی تعمیر پر جو مصارف آئے ہیں اُن میں سے تین سو پچاس پونڈ کا قرض اس کے ذمّے ہے۔ اگر قرض خواہ تجّار اور عوام النّاس کو اس صورتِ حال کی خبر ہو گئی تو وہ فوراً اپنا اپنا قرض طلب کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے اور بیشتر دیگر اصحاب تحریک کی معاونت سے ہاتھ اُٹھا لیں گے اور لوگوں کی زبانیں ہماری شہرت کو باطل طریقے سے داغدار کر دیں گی اور خاص طور پر جماعت کے پاس اس وقت کوڑی تک نہیں ہے۔ کیا نیا نائب یہ سب بار اپنے کندھوں پر اٹھا سکتا ہے اور علی الخصوص ایسے حالات میں جب کہ استاذ حسن البنّا جماعت کو

اس بوجھ سے لدا ہوا چھوڑ کر یہاں سے منتقل ہو جائیں۔ کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ منصبِ نیابت کے لیے کسی ایسے آدمی کو پسند کیا جائے جو باہمت اور باثروت لوگوں میں سے ہوتا کہ وہ تحریک کو آنے والے شر و فتنہ سے محفوظ رکھ سکے۔

مجھ تک بھی یہ خبر پہنچ گئی اور نہ صرف اخوان کے حلقوں میں پھیل گئی بلکہ عوام الناس تک کو معلوم ہو گئی۔ لوگوں نے اپنی مجلسوں میں اس کا چرچا شروع کر دیا۔ میں نے حُسنِ ظن سے کام لیتے ہوئے تصویر کے اچھے پہلو کو ترجیح دی اور جھوٹی الزام تراشی میں ملوّث ہونے سے اجتناب کرتے ہوئے قائلین کے کلام کو فی الواقع خیر خواہی اور ہمدردی کے جذبے پر محمول کیا اور پھر میں نے اس فتنے کو بھی اپنے مخصوص طریقے کے مطابق حل کرنے کی ٹھان لی۔ میں نے قرض خواہ تجّار کو بلایا۔ وہ تین یا چار اصحاب تھے اور ان سے درخواست کی کہ ان مختلف قرضوں کو آپ میں سے کسی ایک صاحب کے نام یکجا کر دیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے یہ بات قبول کر لی۔ اور جن ایک صاحب کے نام یہ قرض یکجا کر دیا گیا تھا ان سے عرض کیا یہ قرض میری طرف سے طویل المیعاد قسطوں کی شکل میں ادا ہوگا۔ یعنی ہر ماہ آٹھ پونڈ ادا ہو سکیں گے۔ ان صاحب نے میری یہ پیش کش قبول کر لی۔ اور میں نے پوری رقم پر مشتمل اپنی طرف سے ذاتی مچلکے لکھ کر دے دیئے۔ اور اُن سے یہ اقرار نامہ لے لیا کہ جماعت کے ذمّے اُن کی کوئی رقم نہیں ہے اور اُسے دیگر تجار کے اقرار ناموں میں ضم کر دیا تاکہ جماعت کسی فرد کی ایک پائی کی بھی مقروض نہ رہے۔ اس کارروائی کے بعد میں نے تمام اخوان کو مدعو کیا۔ ان میں یہ چار مخالف اصحاب بھی شامل تھے۔ میں نے یہ تمام کارروائی ان کے سامنے رکھ دی۔ یہ سن کر ان چاروں کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے اور وہ طرح طرح کے عذرات کا سہارا لینے لگے۔ کبھی کہتے کہ آپ اپنے آپ کو اس قدر کیوں مشقّت میں ڈالتے ہیں؟ کبھی کہتے: کیا یہ کوئی مروّت ہے کہ ہم تنہا آپ

پر یہ بوجھ لدا رہنے دیں؟ کبھی یوں گویا ہوتے کہ: کیا عملِ خیر کا آپ کو یہ صلہ ملنا چاہیے؟ کبھی کہتے: فرض کیجیے، آپ کو کوئی ایسی افتاد آپڑتی ہے کہ آپ یہ قرض ادا نہیں کر سکتے تو پھر کیا علاج ہوگا؟ میں نے اُن سے کہا: جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے آپ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ باقی رہا میرا قرض ادا نہ کر سکنے کا معاملہ سو میں نے قسطوں کو اس طرح مقرر کر دیا ہے کہ جس سے ان شاء اللہ میرے لیے ان کی ادائیگی ممکن رہے گی۔ اور متعلقہ تاجر نے بھی اللہ تعالیٰ اُسے جزائے خیر دے اس طریقۂ ادائیگی پر صاد کر دیا ہے اور اس قضیے کے اندر میں بھی مسلمانوں کے ایک فرد کی حیثیت سے شریک ہوں۔ مجھ پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ میں اپنے دین و ملّت کے راستے میں انفاق کروں۔ لہٰذا آپ حضرات میرے غم میں مبتلا نہ ہوں۔ ہمارے لیے یہی بسا غنیمت ہے کہ ہمیں یہ نہ کہا جائے کہ ہم نادہند ہیں یا ہمارے اندر بھی فتنہ پردازی پائی جاتی ہے۔ ہمارے لیے یہی کافی ہے کہ ہمارا یہ اتحاد جو تائیدِ ایزدی سے حق اور ایمان کی بنیاد پر استوار ہو چکا ہے قائم و دائم رہے۔ میری ان گذارشات کے بعد ان حضرات کے لیے کچھ کرنے یا کہنے کی کوئی گنجائش نہ رہی۔ وہ صرف اتنا کر سکے کہ ان میں سے ایک صاحب نے جو مالیات کے سکرٹری تھے مالیات کا انتظام کسی دوسرے کے سپرد کر دینے کی خواہش ظاہر کی جسے قبول کر لیا گیا ——— اور ہم نے مالیات کا نظام ایک اور رفیق کے حوالے کر دیا۔ مجھے ابھی تک یاد ہے کہ ان صاحب نے جب سیف نکالا تو ان کی کیفیت یہ تھی کہ گویا ان کو دل کا دورہ پڑ چکا ہے۔ انھوں نے سیف کو مع کنجی اپنے جانشین کے سپرد کرتے ہوئے کہا: "لیجیے یہ کنجی اب اِن شاء اللہ بیت المال اُجڑا ہی رہے گا۔" میں نے ایک گہرے تاثر میں ڈوب کر کہا ——— "برادرم ایسی بات نہیں ہے۔ یہ بفضل اللہ آباد ہی رہے گا۔" الغرض یہ تمام حضرات واپس لوٹ

گئے۔ اس کے بعد اخوان کا بیت المال جب تک اللہ کی مشیت رہی آباد و پُر رونق رہا۔ اور فی الواقع وہ اللہ کے فضل و کرم کی طفیل بھرا ہی رہا۔ اللہ تعالیٰ اسماعیلیہ کے مخیّرین کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ انھیں جونہی اس واقعے کی اطلاع ملی اور یہ معلوم ہوا کہ میں نے پینتالیس مچلکے اپنی ذات کی طرف سے تحریر کر دیئے ہیں تو اسماعیلیہ کی معزز و مؤقر شخصیت شیخ محمد حسین زلوط رحمہ اللہ کی طرف سے انھیں اپنے گھر پر اجتماع کے لیے مدعو کیا گیا۔ چنانچہ مخیّرین حضرات جمع ہوئے اور انھوں نے یہ رقم آپس میں بانٹ لی اور فی الفور چار سو پونڈ کا عطیہ جمع کر دیا گیا۔ جس سے یہ تمام مچلکے ادا کر دیئے گئے اور جو باقی بچ گئے وہ جماعت کے بیت المال میں ڈال دیئے گئے۔ اخوان کی طرف سے بھی پے در پے عطیات آنے شروع ہو گئے جن سے ایک معقول پونجی فراہم ہو گئی۔ وللہ خزائن السمٰوٰت والارض ولکن المنافقین لا یعلمون۔ (اللہ ہی کے لیے ہیں آسمانوں اور زمین کے خزانے، مگر منافقین اس حقیقت کو نہیں جانتے)۔

سازشیوں کا پراسیکیوٹنگ کی طرف رجوع

اچنبھے کی بات ہے کہ یہ اخوان جو سرکشی پر تُل چکے تھے اجلاس میں یہ دیکھ چکے تھے کہ ان کے ساتھی اخوان انفاق فی سبیل اللہ میں کیسے مسابقت کرتے ہیں اور دعوت کے لیے مال تو الگ اگر جان بھی طلب کی جائے تو وہ بھی نچھاور کرنے سے دریغ نہیں کرتے مگر یہ لوگ ان بہترین مظاہر سے اثر پذیر ہونے کے بجائے اُلٹا خصومت و عداوت میں اور زیادہ لپک گئے اور یہ بات محتاجِ دلیل نہیں کہ انسان کا نفس اگر محض جیت کو، خواہ وہ غیر حق کے لیے ہو، اپنا مطمح نظر بنا لے تو اُسے اس مقصد کے سوا اور کوئی بات نہیں سوجھتی۔ اور اگر ٹیڑھے ترچھے ہتھکنڈے اُسے بار بار ہزیمت سے دوچار

بھی کرتے رہیں تب بھی وہ ہرگز باز نہیں آئے گا یہاں تک کہ وہ مکمل ہزیمت کا منہ نہ دیکھ لے۔ اللہ کی مخلوق بھی کیا رنگا رنگ ہے۔ ان لوگوں کے سامنے اب صرف یہ ایک تدبیر رہ گئی تھی کہ وہ صاحب جنھیں مالیات کی نظامت سے الگ کر دیا گیا تھا وہ پراسیکیوٹر کے پاس گئے اور اپنے دستخطوں سے انھوں نے ایک عرضی دائر کی۔ ان صاحب کا یہ طریقہ میری نگاہ میں ایک خوبی ہے جو میرے لیے ناقابلِ فراموش ہے۔ انھوں نے جب کبھی مخالفت کی ہے علانیہ اور کھل کر کی ہے۔ یہ ان کی اخلاقی شجاعت اور مردانگی کی ایک دلیل ہے بلکہ یہ تحریک ہی کا پیدا کردہ ایک کردار ہے گو اب غلط استعمال ہو رہا ہے۔ مجسٹریٹ کے نام اپنی عرضی میں وہ لکھتے ہیں :

"حسن افندی البنّا اسماعیلیہ میں اخوان المسلمون کا صدر اور پرائمری اسکول کا مدرس جماعت کے سرمایہ کو برباد کر رہا ہے۔ تمام سرمایہ قاہرہ اپنے بھائی کو بھیج رہا ہے جس کے متعلق وہ کہتا ہے کہ وہ قاہرہ کی جماعت کا صدر ہے۔ پورٹ سعید اور ابوصویر بھی یہ سرمایہ بھیجا جا رہا ہے۔ حالانکہ یہ تمام سرمایہ اسماعیلیہ میں جمع کیا گیا ہے اور باشندگانِ اسماعیلیہ کا دیا ہوا ہے۔ لہٰذا ضروری تھا کہ اسے اسماعیلیہ ہی میں صرف کیا جاتا۔ پبلک پراسیکیوٹر کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ لوگوں کے اموال، ان کی عزتوں اور ان کی جانوں کی حفاظت کرے۔ اس لیے درخواست گذار یہ مطالبہ کرتا ہے کہ پبلک پراسیکیوٹر اس قضیئے میں دخل دے اور ان مدوں پر سرمایہ برباد کرنے سے روکا جائے۔"

پراسیکیوٹنگ افسر بڑے بیدار مغز اور باریک بین تھے۔ میری یادداشت کے مطابق غالبًا وہ استاذ محمود مجاہد تھے جو آج کل جج لگے ہوئے ہیں۔ انھوں نے صاحبِ درخواست کو طلب کیا اور اس سے بڑے دھیمے اور پرلطف انداز میں بحث کی اور اُس سے دریافت کیا کہ :

"کیا آپ جماعتِ اخوان کی مجلس عاملہ کے رُکن ہیں ؟"

اُس نے جواب دیا : "مَیں اس کا رکن تھا اور مالیات کا کام میں سرانجام دیتا تھا۔ مگر میں نے استعفا دے دیا جسے قبول کر لیا گیا۔"

افسر نے مزید پوچھا : کیا عرضی میں بیان کردہ شاخوں کے نام جو رقوم بھیجی جاتی ہیں، مجلسِ عاملہ اُن کی منظوری دے دیتی ہے ؟

اُس نے کہا : جی ہاں۔

پراسیکیوٹر نے پھر یہ پوچھا : کیا آپ جنرل کونسل کے رکن ہیں ؟

بولا : "مَیں ہر ادارے کا رکن تھا لیکن اب میں ان لوگوں کو دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ اور اب اُن کے کسی شعبے کا اپنے آپ کو رکن نہیں سمجھتا۔"

سوال : "کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اگر یہ تصرفات جنرل کونسل میں پیش کیے جائیں تو وہ ان کی منظوری دے دے گی اور حسن افندی کے فیصلوں سے اظہارِ موافقت کرے گی ؟"

جواب : "یا للعجب، اگر حسن افندی ان سے یہ کہے کہ یہ رقوم مَیں نے اپنی ذات پر خرچ کر لی ہیں تو وہ اس کی بھی خوشی خوشی منظوری دے دیں گے۔ حسن افندی نے ان پر جادو کر رکھا ہے۔ وہ جو کچھ کرتا ہے یہ آنکھیں بند کر کے اس پر صاد کر دیتے ہیں۔"

اس جرح کے بعد پراسیکیوٹر کہنے لگا : "اگر مجلس عاملہ حسن افندی کی حامی ہے، جنرل کونسل بھی اس کی مؤید ہے اور آپ نہ اس کے رکن ہیں اور نہ اُس کے۔ تو آپ اس پھٹے میں کیوں ٹانگ اڑاتے ہیں ؟ پبلک پراسیکیوٹنگ کا اس قضیئے کے ساتھ کیا واسطہ ؟ یہ لوگ ـــــ اخوان المسلمون ـــــ ایک جمعیت سے منسلک ہوئے۔ انھوں نے رقمیں پیش کیں جنھیں خرچ کرنے کے لیے ایک فرد یا چند افراد کو انھوں نے اپنا وکیل بنا دیا اور اس نے جس طریقے سے بھی یہ رقمیں صرف کیں انھیں منظوری دے دی گئی۔ تو اب پراسیکیوٹنگ افسر کس بنیاد پر اس نظام کے اندر دخل اندازی کرے۔ یہ لوگ

خود مختار ہیں۔ اپنے اموال کے بارے میں جو چاہیں کریں۔ دیکھ نوجوان! تو ایک مخلص انسان نظر آتا ہے لیکن تو بڑی سخت غلطی کر رہا ہے۔ میری تجھے نصیحت ہے کہ تو جماعت میں واپس چلا جا۔ اور ان لوگوں کے ساتھ مل کر کام کر، اور ادھر اُدھر کی خیال آرائی کو ترک کر، اور اگر ان لوگوں کے حالات تجھے گوارا نہیں ہیں تو جا، گھر میں بیٹھ، اور اپنا کوئی اور دھندا کر۔ اور جو کچھ یہ لوگ کرتے ہیں انھیں کرنے دے۔ اگر تو اپنا بھلا چاہتا ہے تو یہی طرز تیرے لیے بہتر اور مناسب ہے ــــ وہ نوجوان یہ باتیں سُن کر واپس لوٹ گیا۔

شیخ حامد عسکریہ رحمہ اللہ کو یہ سب داستان معلوم ہو گئی۔ وہ شبراخیت سے اسماعیلیہ آئے اور انھوں نے ثالث بن کر ان خودسر لوگوں کو جماعت کی صفوں میں واپس لانے کی کوشش کی مگر وہ راہِ عناد کو چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ شیخ حامد عسکریہ ایسے معاملات میں بڑی بصیرت و فہم سے بہرہ ور تھے۔ ان لوگوں سے ملنے کے بعد مجھے آکر کہنے لگے:

"ان کے اندر کوئی خیر باقی نہیں ہے۔ یہ لوگ دعوت کی رفعت و بلندی کے ادراک سے محروم ہو چکے ہیں اور قیادت کی فرمانبرداری کے عقیدے سے بھی برگشتہ ہو چکے ہیں۔ جو شخص ان دونوں پہلوؤں سے بے بہرہ ہو جائے ہماری صفوں کے اندر وہ کوئی کارِ خیر سرانجام نہیں دے سکتا۔ لہٰذا آپ ان کی مخالفت کو بھی باعثِ اجر و ثواب سمجھیں اور اپنے راستے پر کاربند رہیں۔ واللہ المستعان۔

حامد عسکریہ رحمہ اللہ نے اپنی رائے سے خارجین کو بے باکانہ آگاہ کر دیا اور خود شبراخیت لوٹ گئے۔ مجھے یہ فکر ہوئی کہ میں مجلسِ عاملہ کا اجلاس طلب کروں تاکہ ان لوگوں کو جماعت سے باقاعدہ خارج کر دیا جائے۔ لیکن انھوں نے ازخود پیش قدمی کی اور اپنے استعفے دفتر کو بھیج دیے۔ مجلسِ عاملہ نے ان کی فی الفور منظوری دے دی۔ اور جھگڑا ختم کر دیا گیا۔ ان پر عربی کی یہ مثل صادق آتی ہے کہ علی نفسہا جنت

براتنش دارناست کہ برماست)

تحریک کے اندر پھوٹ ڈالنے کی کوشش

ان لوگوں پر یہ بڑا شاق گزرا کہ وہ اپنے آپ کو اب اِخوان کے ماحول سے بہت دُور دیکھ رہے تھے اور اخوان کے خلاف مکر و فریب کی کوئی تدبیر ان سے نہ بن آرہی تھی۔ لہٰذا انھوں نے اخوان کے خلاف افواہ سازی کا بازار گرم کر دیا اور گمنام عرضیاں سرکاری افسران کے نام بھیجنا شروع کر دیں۔ کبھی وزارت تعلیم کو، کبھی پولیس کو، اور کبھی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو۔ اور آخر کار شہر کے اُن لوگوں سے گھلنے ملنے لگے جنھیں تحریک اخوان کا ستون سمجھتے تھے اور جھوٹی اور خانہ ساز کہانیاں انھیں جاجا کر سنانے لگے تاکہ انھیں تحریک سے برگشتہ کریں۔ اس مہم کا آغاز انھوں نے شیخ محمد حسین زملوط سے کیا۔ شیخ موصوف کے سامنے انھوں نے یہ افترا پردازی کی کہ: "اخوان المسلمون بڑا خطرناک گروہ ہے۔ ان کی خفیہ سرگرمیاں اس نوعیت کی ہیں کہ اگر وہ آپ پر عیاں ہو جائیں تو آپ ان سے دُور بھاگ جائیں۔ اور اپنی جان بچانے کی فکر کریں۔ ہم ان کی یہ سرگرمیاں متعلقہ حکام کے علم میں لائیں گے لیکن ان کو بتانے سے پیشتر ہم نے چاہا کہ آپ کو بھی باخبر کر دیں تاکہ آپ پہلے ہی احتیاطی تدابیر اختیار کر لیں اور ان سے اظہارِ لاتعلقی کر دیں۔ اور اپنے استعفا اور علیحدگی کا باقاعدہ اعلان کر دیں۔ جب آپ ہمیں اطمینان دلا دیں گے ہم سرکاری حکام کے سامنے ان کے راز منکشف کر دیں گے۔ اس طرح آپ پر کوئی افتاد نہیں پڑے گی۔"

شیخ محمد حسین زملوط نے ان سے کہا: "جو کچھ آپ لوگ بیان کر رہے ہیں کیا اس کی صحت پر آپ کو پختہ یقین ہے؟" کہنے لگے: "جی ہاں پختہ یقین ہے۔ بلکہ ان خفیہ کاموں کے اندر ہم خود بھی عملاً ان کے ساتھ شریک رہے ہیں۔"

شیخ موصوف ایک دانش مند اور معاملہ فہم آدمی تھے، دولتِ ایمان سے

بہرہ اندوز تھے۔ متدین تھے۔ صاف گوئی اور جرأت کا بھی بہرۂ وافر پایا تھا۔ ان سے کہنے لگے: "تم لوگ اس وقت میری نگاہ میں دو حال سے خالی نہیں ہو۔ اگر تمھاری بات سچی اور درست ہے تو تم غدار اور خائن ہو اور اگر غلط کہہ رہے ہو تو کذاب ہو۔ ایسی صورت میں تم مجھ سے کیسے یہ توقع رکھتے ہو کہ میں تمھاری تصدیق کروں اور تمھارا احترام کروں درآنحالیکہ تم خائن ہو یا جھوٹے۔ اُٹھ جاؤ یہاں سے۔ آئندہ کے لیے میں تمھیں یہاں نہ دیکھوں۔"

مجھے وہ گھڑی ہرگز فراموش نہیں ہو سکتی جب شیخ محمد حسین زلوط میرے پاس اسکول میں آئے۔ ان کا رنگ متغیر تھا۔ غصہ اور کبیدگی کے آثار چہرے سے ہویدا تھے۔ انھوں نے اسکول کے پرنسپل سے اجازت لی اور مجھے کلاس سے ساتھ لے لیا اور ہم دونوں خراماں خراماں شہر کے باہر نکل گئے۔ دوران گفتگو انھوں نے ارباب سازش سے جو کچھ سُنا تھا مجھ سے اُس کی چھان کرید شروع کر دی۔ مجھ سے کہنے لگے: "میاں صاحب! ابھی فی الفور شہر لوٹ جاؤ۔ اور جو کچھ یہ حضرات کہہ رہے ہیں اگر وہ درست ہے تو فوراً اپنا بندوبست کر لو۔ اور کوشش کرو کہ تمھارے ان پوشیدہ کاموں کا کوئی پہلو ــــ اگر فی الواقع تمھاری کوئی پوشیدہ سرگرمیاں ہیں ــــ ہرگز بے نقاب نہ ہونے پائے اور اگر کوئی راز منکشف ہو بھی جائے یا کسی چیز کے بارے میں تم سے پوچھ گچھ ہو تو صاف کہہ دینا کہ اس جماعت کے ساتھ میرا قطعاً کوئی رشتہ نہیں ہے۔ اس کا صدر محمد ابو حسین زلوط ہے۔ میاں! تم ابھی جوانی کی منزل میں ہو۔ تمھارا ایک مستقبل ہے۔ نیز تم سرکاری ملازم ہو۔ حکومت تمھیں تنگ کر سکتی ہے۔ تم ہمارے شہر میں ایک مہمان ہو۔ تم نے یہ دعوت کا کام لوجہ اللہ کیا ہے۔ تم تو ہر لحاظ سے شکریے اور احسان مندی کے مستحق ہو۔" میں یہ سنتا رہا۔ اور اس مرد مومن کی شہامت اور مردانگی سے بے حد متاثر ہوا۔ میں نے اُن سے عرض کیا: یا سیدی! آپ پورا اطمینان رکھیں۔ ہم جو کچھ کر رہے ہیں دن کی روشنی میں

کر رہے ہیں۔ اگر یہ گروہ صادق القول ہوتا تو یہ مدت مدید سے ہماری مخبری کر چکا ہوتا۔ اس گروہ اور تحریک کے درمیان جو اختلاف برپا ہو چکا ہے وہ نیا نہیں ہے۔ اصل قصہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے دیکھا ہے کہ آپ تحریک کو اپنی جاہ و منزلت کی بدولت اور اپنے مالی ذرائع سے مدد بہم پہنچاتے ہیں۔ آپ ایک نیک نفس شریف اور قابلِ احترام انسان ہیں۔ ان لوگوں نے یہ سوچا ہے کہ تحریک کو آپ کی شفقت اور وابستگی سے محروم کر دیں اور تحریک کو عوام الناس کے سامنے ایک خوفناک تصویر بنا کر پیش کریں۔ میں آپ کا انتہائی ممنون ہوں کہ آپ نے اپنی ہمدردانہ پیش کش کا اظہار فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس سچی ایمان داری اور مخلصانہ وفاشعاری کا اجر نیک عطا فرمائے۔

اس کے بعد اس مردِ درویش نے جو کچھ فرمایا وہ بھی میرے دل پر نقش ہے۔ کہنے لگے: "برادرم! خدا کی قسم، میں نے اپنے چچا شیخ عبید کو بکثرت یہ کہتے سنا ہے کہ "میری اللہ سے درخواست ہے کہ میں اُس وقت تک دنیا سے رخصت نہ ہوں جب تک اسلام کا غلبہ، ملّتِ اسلامی کی کامیابی اور احکامِ اسلام کی برتری نہ دیکھ لوں۔ وہ بےچارا دنیا سے رخصت ہو گیا مگر اُسے غلبۂ اسلام کا مشاہدہ نصیب نہ ہوا۔ خود مجھے بھی زندگی کے اندر اس کے سوا کسی چیز کی آرزو نہیں ہے کہ میں اسلام کے غلبہ و عروج کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں اور میں ہمیشہ اللہ سے دُعا کرتا رہتا ہوں کہ یہ غلبہ و عروج دیکھ کر میری آنکھیں بند ہوں لیکن مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہ منزل بہت دور ہے۔ اس لیے کہ مسلمانوں کو ابھی تک قطرۂ خون گراں نظر آتا ہے اور جب تک وہ قطرۂ خون کو گراں سمجھتے رہیں گے انھیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ عزت و حریت کی قیمت صرف قطرۂ خون ہے۔ قرآن اسی حقیقت کو بیان کرتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور صحابہؓ کی زندگی اسی بات کی گواہی دیتی ہے۔ کیا یہی بات نہیں ہے؟

میں نے کہا: "جی ہاں، بیشک آپ نے جو کچھ فرمایا برحق ہے۔ لیکن میں آپ کو

یقین دلاتا ہوں کہ سچا ایمان ہی در اصل انسانی خون کو ارزاں یا گراں بنا سکتا ہے۔ اس لیے کہ ایمان کی راہ میں بہنے والے خون کا اجر اللہ کے ہاں بہت عظیم و جزیل ہے۔ اور میں دیکھ رہا ہوں کہ ایمان کے شعلے ایک خدا پرست گروہ کے دلوں میں بھڑکنے لگ گئے ہیں اور ان شاء اللہ اس گروہ کے ہاتھوں خیر و سعادت اور نجات و فلاح کے عظیم کارنامے سرانجام پائیں گے ان نوخیز اخوانیوں کو آپ ہر بھلائی کا عاشق پائیں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی عمر دراز کرے اور آپ اسلام کے غلبہ و فروغ کو دیکھیں۔"

شیخ زلوط بولے۔ لیکن یہ گروہ انتہائی قلیل التعداد ہے۔

راقم نے عرض کیا: آئندہ یہ قلت کثرت سے بدل جائے گی۔ اور پھر برکت تو اسی قلت کے اندر مضمر ہے:

کم من فئة قليلة غلبت فئة كثيرة باذن الله والله مع الصابرين۔

"بارہا ایسا ہوا ہے کہ ایک قلیل گروہ اللہ کے اذن سے ایک بڑے گروہ پر غالب آگیا ہے۔ اور اللہ صبر کرنے والوں کا ساتھی ہے۔"

اس پر شیخ موصوف فرمانے لگے: اللہ تمھیں اچھی خوشخبریوں سے نوازے۔ ہم اللہ سے یہی توقع رکھتے ہیں اور اسی کا سوال کرتے ہیں۔

بعد میں مجھے شیخ محمد حسین زلوط نے بتایا کہ پراسیکیوٹنگ افسر نے مجھ سے اُن عرضیوں کے بارے میں پوچھا تھا جو جماعت کی "خفیہ سرگرمیوں" کے بارے میں حکام کو بھیجی گئی تھیں۔ میں نے اُسے یہ نصیحت کر دی کہ ان گمنام عرضیوں کو ردّی کی ٹوکری کے حوالے کر دو۔ اگر یہ عرضیاں درست ہوتیں تو ان کے بھیجنے والے اپنا نام اور پتے کیوں مخفی رکھتے، بلکہ جرأت مندانہ طریقے سے حقیقتِ حال کا سامنا کرتے ـــــ

اللہ تعالیٰ شیخ محمد حسین زلوط کو اپنی رحمتوں سے نوازے اور انھیں جزائے خیر عطا فرمائے۔

مخالفانہ اشتہارات اور کتابچے

ان چار یا پانچ مخالفین نے جماعت کو زک پہنچانے کا جب اور کوئی راستہ نہ دیکھا تو انھوں نے جھوٹ پر مبنی اشتہارات اور کتابچے اور بے سر و پا قصّے چھاپ کر پھیلانے کی تدبیر اختیار کر لی۔ ان اشتہارات اور کتابچوں میں وہ یہ افترا پردازی کرتے کہ: اس تنظیم کے اندر آزادیٔ رائے مفقود ہے۔ یہ جماعت شورائی نظام سے ہٹ کر چل رہی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اور دل چسپ بات یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے دعاوی کو یہ کہہ کر خود ہی جھٹلا دیتے کہ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ان کی مجلسِ عاملہ اور ان کی جنرل کونسل دونوں حسن البنّا کی کسی بات کی مخالفت نہیں کرتی ہیں، اور اس کی بالکل اندھا دھند اطاعت کرتی ہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ اگر جنرل کونسل سے مشورہ لیا جاتا ہے اور مجلسِ عاملہ سے بھی مشورہ لیا جاتا ہے تو فقدان شوریٰ کیسے ثابت ہو گیا؟ اور شوریٰ اور آزادیٔ رائے کا یہ مطلب کیسے ہو گیا کہ لازماً مخالفت اور بغاوت کا راستہ اختیار کیا جائے؟ پھر یہ کہتے: "اسماعیلیہ کا پیسہ قاہرہ پر قربان کیا جا رہا ہے اور استاذ یہ پیسہ اپنے بھائی کو قاہرہ بھیج رہا ہے۔ اسی طرح اسماعیلیہ کی دولت ابوصویر اور پورٹ سعید میں صرف کی جا رہی ہے۔" گویا اسلامی دعوت کے علمبرداروں کے لیے یہ ناجائز ہے کہ وہ کسی ایسے شخص کی مدد اور تعاون حاصل کریں جو اُن کا رشتہ دار ہے خواہ وہ اپنے ایمان اور قابلیت میں کتنا ممتاز ہو۔ بلکہ اسلامی دعوت کے حاملین پر یہ لازم ہے کہ اگر وہ تہمتوں سے مبّرا رہنا چاہتے ہیں تو اپنے رشتہ داروں کو اپنے حلقے سے بیک بینی و دو گوش نکال باہر کریں، خواہ ان کا وجود تحریک کے لیے کتنا ہی مفید ہو۔ مگر ان کا یہی جرم کیا کم ہے کہ وہ حاملینِ دعوت کے رشتہ دار اور بھائی بند ہیں اور چاہے اس رشتہ داری نے اُن پر یہ ستم بھی ڈھائے ہوں کہ وہ زندگی کی دوڑ میں پیچھے دھکیل دیے گئے اور دوسروں کو آگے

بڑھا دیا گیا۔ مخالفین کبھی یہ کہنے لگتے: "مسجد کا حساب ابھی تک عوام الناس کو نہیں بتایا گیا ہے۔ ہمیں مسجد کی آمدنی کا علم نہیں ہے کہ کہاں تک ہوئی اور کیسے کیسے صرف کی گئی۔ اسکول کا ساز و سامان بھی ٹنڈر دیئے بغیر خریدا گیا ہے اور غیر قانونی طریقے سے خریدا گیا ہے۔ عوام کو یہ حق ہے کہ وہ جماعت کے ذمہ دار لوگوں کے اعمال کا محاسبہ کریں۔" یہ لوگ جو من گھڑت رپورٹ چھاپ رہے تھے مجھے اس کی اطلاع ہوئی۔ چنانچہ میں اس گروہ کا جو اصل کرتا دھرتا تھا اس کے گھر گیا۔ وہ ایک مردِ عاقل تھا۔ اس کی عمر اور سابقیت کے پیش نظر میں اُس کا احترام کرتا تھا۔ میں نے اُسے کہا: مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم نے ایسا ایسا پروگرام بنا رکھا ہے۔ کیا یہ صحیح ہے؟ اُس نے جواب دینے سے گریز کیا۔ میں نے زیرِ طبع رپورٹ کی بعض عبارتیں نکال کر اُسے دکھائیں۔ چنانچہ اُسے چار و ناچار تسلیم کرنا پڑا کہ ہاں یہ رپورٹ زیرِ طباعت ہے۔

میں نے کہا: کوئی حرج نہیں۔ چچا صاحب آپ جو چاہیں کریں۔ میں اب آپ کے پاس اس لیے نہیں آیا کہ آپ کی منت سماجت کروں کہ اس رپورٹ کی اشاعت روک دیں یا جماعت کے خلاف مہم بازی سے دست بردار ہو جائیں۔ آپ اپنی رائے کے مالک ہیں جو چاہیں کریں۔ لیکن جیسا کہ میں جانتا ہوں اور ابھی تک میں یہی سمجھتا ہوں کہ آپ ایک سمجھ دار اور فہیم آدمی ہیں۔ تمام اعمال نتائج و عواقب کے مرہون ہوتے ہیں۔ مجرد تہوّر اور انتقامی جوش کوڑی بھر فائدہ نہیں بخشتا۔ یہ رپورٹ چھاپ کر آپ لوگ کس نتیجے کی آس لگائے بیٹھے ہیں؟"

وہ کہنے لگا: ہم رائے عامہ کو بیدار اور اُسے اصل حقیقت سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں۔

میں نے عرض کیا: جس چیز کو آپ "حقیقت" سمجھتے ہیں اور جسے میں سراسر کذب اور باطل سمجھتا ہوں اس پر میں آپ سے قطعاً بحث نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ کیا آپ اس وہم میں مبتلا ہیں کہ ہم اس رپورٹ کا جواب دینے

سے عاجز ہیں یا ہم رائے عامہ کو اس امر کا قائل نہیں کر سکتے کہ ہم سچے اور آپ لوگ جھوٹے ہیں۔ تمھارے پاس تو صرف کھوکھلے دعاوی ہیں اور ہمارے پاس تحریری ثبوت اور قانونی دستاویزات ہیں اور چچا صاحب آپ خود تمام لوگوں سے زیادہ حقیقتِ حال کو جانتے ہیں مسجد کا حساب خود آپ کے ہاتھ میں تھا۔ مدرسہ کے لیے جو ساز و سامان خریدا گیا اس میں بھی آپ شریک و دخیل رہے۔ مسجد اور دیگر اداروں کے لیے اکثر و بیشتر اشیاء کی خریداری آپ کے ذریعہ سے ہوتی رہی ہے۔ لہٰذا جب آپ لوگ رائے عامہ کو بیدار اور باخبر کریں گے تو اس سے ہمیں فائدہ پہنچے گا نہ کہ آپ لوگوں کو۔ پھر ہمارے پاس نشر و اشاعت کے وہ ذرائع و وسائل بھی ہیں جو آپ کو میسر نہیں ہیں۔ عوام کے ساتھ ہمارا رابطہ زیادہ قریب اور مضبوط ہے۔ ہم اس موضوع کو خطبات جمعہ میں بیان کر سکتے ہیں، تحریری طور پر پھیلا سکتے ہیں، پبلک گفتگوؤں میں واضح کر سکتے ہیں۔ اجتماعات اور جلسے منعقد کر سکتے ہیں۔ درسوں اور وعظوں کے دوران اس پر روشنی ڈال سکتے ہیں مسجدوں میں، قہوہ خانوں میں، راستوں اور بازاروں میں اسے پھیلا سکتے ہیں۔ توضیح حقیقت کے لیے ہمارے پاس بکثرت زبانیں اور قلم ہیں۔ اور حق بات خود بھی روزِ روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے۔ میرے لیے اس قضیئے میں صرف ایک بات تکلیف دہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ میں کل تک تو آپ کو لوگوں کے سامنے اس طرح پیش کرتا تھا جس طرح بیٹا باپ کو احترام و توقیر کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ اور ان چھوکروں کو نیں اسلام پسند نوجوانوں کے نچوڑ کی حیثیت سے متعارف کراتا تھا۔ اب آپ لوگوں نے جو مؤقف اختیار کیا ہے وہ مجھے مجبور کرے گا کہ میں بادلِ نخواستہ آپ لوگوں پر طعن و تشنیع کروں اور دعوتِ حق اور تحریک کے خلاف آپ لوگوں پر کذب بیانی بہتان تراشی، خیانت، غداری اور بے وفائی وغیرہ کلمات چسپاں کروں۔ بس اسی منظر کا تصور میرے دل کو لرزا رہا اور اسے سخت تکلیف پہنچا رہا ہے۔ گویہ اصول عام

ہے کہ البادی اظلم (ابتدا کرنے والا ظالم ہے)۔ اللہ تعالیٰ عرب شاعر پر رحم فرمائے۔ اُس نے کہا تھا:

نفلق ھامامن رجال	ہم ایسے لوگوں کی بھی کھوپڑیاں اُتار دیتے ہیں جو ہمارے لیے بڑے عزیز ہوتے
اعزۃ علینا وھم کانوا	ہیں، کیوں کہ وہ نا فرمانبردار اور ظالم بن گئے۔
أعق واظلما۔	

اس رنج و تکلیف میں مزید اضافہ اس بات سے ہو جاتا ہے کہ ان تمام انتقامی کوششوں کا کوئی نتیجہ اور ان عرق ریزیوں کا کوئی ثمرہ برآمد نہ ہوگا۔ اس معرکے میں اعصاب سوزی اور ایک دوسرے کی عزت و آبرو پر دست درازی رائیگاں جائے گی۔ بہتر ہی سراسر اسی میں ہے کہ اس جنگ سے آپ کنارہ کش ہو جائیں جس کا انجام آپ کے حق میں جیسا کچھ ہوگا اس سے آپ ناواقف نہیں۔ اگر محض انتقام کے ارادے ہیں تو یہ ایک خالی از خیر مشغلہ ہے اور اگر نصیحت اور خیر خواہی پیش نظر ہے تو وہ تم کر چکے ہو۔ اور لوگ بھی جان گئے ہیں کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ بلکہ تمھارے لیے یہی بات کافی ہے کہ اللہ سب کچھ جانتا اور خبر رکھتا ہے۔ بہر حال اگر تمھاری تگ و دو اور مخالفت و مخاصمت اللہ کی رضا جوئی کے لیے ہے تو یقین جانو کہ اللہ تعالیٰ علیم بذات الصدور ہے۔"

میری باتوں سے یہ صاحب متاثر ہو گئے اور مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ مذکورہ بالا رپورٹ کی اشاعت رکوا دیں گے اور اس کا مسودہ پریس سے واپس منگوا لیں گے۔ میں اُن سے یہ وعدہ لے کر وہاں سے اٹھ کر واپس آ گیا۔

ایک درس اور اس کے اثرات

مجھے یاد ہے کہ ان واقعات کے دوران میں نے عوام الناس کے سامنے ایک درس دیا جس کا موضوع تھا: "قلبی پاکیزگی کی فضیلت، سب انسانوں کے لیے بھلائی کی خواہش،

اوراختلاف کے موقع پر متحارب فریقوں میں مصالحت کرانا۔ درس دینے کے بعد میں گوشۂ خلوت میں جا بیٹھا اور پھر عالمِ تنہائی میں میرے اور دل کے مابین تندوتیز گفتگو ہوئی: اے حسن البنا تم لوگوں کو تو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنی ذات کو بھول جاتے ہو؟ یہ کیا منافقانہ طرز ہے؟ اللہ تعالےٰ کو وہ شخص سب سے زیادہ محبوب ہے جو دل گداز اور زبانِ راست گو سے بہرہ مند ہے۔ اور اللہ کو وہ شخص سب سے زیادہ مبغوض ہے جو ضدی اور جھگڑالو ہے۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ:

الا ادلکم علی افضل من درجات الصلوٰۃ والصوم والصدقۃ؟ قالوا بلیٰ یا رسول اللہ! قال: اصلاح ذات البین فان فساد ذات البین ھی الحالقۃ لا اقول تحلق الشعر ولکن تحلق الدین۔

"کیا میں تم کو وہ کام نہ بتاؤں جو نماز، روزہ اور صدقہ سے کئی درجے افضل ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا: ہاں یا رسول اللہؐ، ضرور ارشاد ہو۔ آنجنابؐ نے فرمایا: لوگوں کے درمیان صلح کرانا! لوگوں کو باہم لڑانا ایسا فتنہ ہے جو مونڈ کر رکھ دینے والا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ سر کے بال مونڈ کر رکھ دیتا ہے۔ بلکہ یہ خود دین ہی کا صفایا کر کے رکھ دیتا ہے۔"

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

واصلحوا بینھما والصلح خیر۔

"اور ان دونوں (میاں اور بیوی) کے درمیان صلح کرا دو۔ اس لیے کہ صلح سراسر بھلائی ہے۔"

بے شک اللہ اور اس کے رسول دونوں نے سچ فرمایا۔ مگر میں ہوں کہ دیگراں را

نصیحت اور خود را فضیحت ۔ یہ رویّہ ہرگز ہرگز درست نہیں ہے ۔ دل کی تطہیر اور نفس کی صفائی لازم ہے ۔ غیظ و غضب کے جذبات کی سرکوبی کرنی چاہیے اور اپنی ذات کے لیے بدلہ لینے کے داعیہ کو بھسم کر دینا چاہیے ۔ لہٰذا یہ ناگزیر ہے کہ پہلے مَیں عملی طور پر اس اصلاحی کام کو اپنی ذات پر آزماؤں ۔ گو مَیں نے کسی گناہ کا ارتکاب نہیں کیا اور نہ زیادتی کی ابتدا میری طرف سے ہوئی ہے لیکن با ایں ہمہ یہ تجربہ ضروری ہے ۔ مَیں نے قلم تھام لیا، اور مخالف گروہ کے سرخیل کے نام ایک خط تحریر کیا ۔ اس میں مَیں نے لکھا :

"مَیں ہر لحاظ سے اس بات پر تیار ہوں کہ ماضی کو سراسر فراموش کر دیا جائے ۔ اور مخالف گروہ کے افراد اگر چاہیں تو انھیں اخوان کی صفوں میں واپس لایا جا سکتا ہے ۔ اگر وہ میری اس پیش کش کو اصول رواداری کی بنیاد پر قبول کر لیں تو اللہ تعالیٰ ان کے عمل کو قبول فرمائے گا ۔ مَیں نے درگذر کر دی ہے ۔ انھیں بھی مسامحت سے کام لینا چاہیے اور اگر وہ یہ باہمی صفائی احقاقِ حق کے اصول پر کرنا چاہتے ہیں تو میں اس طریقِ کار کو اختیار کرنے کے لیے بھی آمادہ ہوں اور ثالثوں کا حقِ انتخاب بھی انھیں تفویض کرتا ہوں ۔ جسے چاہیں منتخب کریں ۔ ہم ثالث فرد یا ثالث افراد کے آگے اپنا مقدمہ رکھ دیں گے ۔ اور ابھی سے یہ اعلان کرتا ہوں کہ جو بھی فیصلہ صادر ہو، مَیں اُس کے آگے سرِ تسلیم خم کر دوں گا ـــ اس تمہید کے بعد مَیں نے خط میں اپنے اس مؤقف کی وجہ بھی بیان کر دی ۔ مَیں نے لکھ دیا کہ ایک درس دینے کے بعد مجھ پر یہ اثرات طاری ہوئے ہیں اور مجھے یہ خوف لاحق ہوا ہے کہ کہیں مَیں بھی ان لوگوں میں شامل نہ ہو جاؤں جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ :

لم تقولون ما لا تفعلون . كبر مقتا عند الله ان تقولوا ما لا تفعلون .

"تم لوگ وہ باتیں کیوں کہتے ہو جو تم خود نہیں کرتے ہو ۔ اللہ کے نزدیک

یہ سخت ناپسندیدہ رویہ ہے کہ تم کہو وہ بات جو تم نہیں کرتے۔"

مردناداں پر کلام نرم ونازک بے اثر

مگر یہ خط باایں ہمہ کہ اس کی ایک ایک سطر میں جذبۂ بے اختیار موجزن تھا۔ ان لوگوں پر کوئی اثر نہ ڈال سکا۔ بلکہ میں نے تو یہاں تک اصرار کیا کہ یہ خط میں بہ نفسِ نفیس مخالفین کے سرخیل کے گھر لے کر جاؤں۔ اور اپنے ہاتھ سے اُسے تھماؤں۔ اخوان میرے اس فیصلے پر بڑے برافروختہ ہوئے اور مجھے ہر گونہ تدبیر سے اس خط سے روکا۔ لیکن میں اپنی رائے پر اڑا رہا۔ اور میں مُصِر رہا کہ میں اس خط کو تنہا اُس کے گھر لے کر جاؤں گا۔ یہ بات اخوان کے لیے انتہائی موجبِ حیرت اور باعثِ استعجاب بن گئی۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ میں اپنی اس "کمزوری" کے اندر جسے میں انتہائی قوت سمجھتا تھا ــــــ اور ابھی تک سمجھتا ہوں ــــ بے پناہ لذت محسوس کر رہا تھا۔ اس لیے کہ یہ کمزوری احکامِ خداوندی کے تحت تھی۔

کلمۃ الحق

اس خط کے مخلصانہ الفاظ ان سنگدل لوگوں کے دلوں کے اندر راہ نہ پا سکے اور نہ اس مردِ عاقل کا یہ وعدہ بروئے کار آسکا کہ وہ مخالفانہ رپورٹ کو نہیں شائع ہونے دے گا۔ کیوں کہ ان میں سے ایک شخص انتہائی خودسری پر اُتر آیا اور دوسرے ساتھیوں کی مخالفت کے باوجود اُس نے رپورٹ کو اپنے نام سے چھاپنے پر اصرار کیا۔ چنانچہ بالفعل یہ رپورٹ چھپ گئی اور اُسے لوگوں کے اندر خوب تقسیم کیا گیا۔ اور چھاپنے والا اُس کی بہت سی کاپیاں خود پورٹ سعید اور ابوصُویر لے کر گیا۔ یہاں اخوان کی شاخیں تھیں جو اسماعیلیہ سے زیادہ دُور نہ تھیں۔ یہ رپورٹ منصۂ ظہور پر آنے

کے بعد اخوان کی انتظامیہ نے "کلمۃ الحق" کے عنوان سے اس کی تردید لکھی۔ یہ تردید جونہی چھپ کر سامنے آئی لوگوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور یہ رپورٹ اور اس کی تردید نے عوام الناس کی نگاہوں کو دعوت کی طرف مبذول کر دیا۔ اور اس کے بعد وہ ہر اُس چیز میں دلچسپی لینے لگے جو جماعت کی طرف منسوب ہوتی تھی۔ یوں یہ مخالفانہ تحریک وسیع پیمانے پر دعوت کی اشاعت و فروغ کا بہت بڑا محرک ثابت ہوئی۔ اور لوگوں کی کثیر تعداد اخوان میں شامل ہوگئی۔

حقیقی عدالت کی طرف رجوع

ایک طرفہ واقعہ یہ ہوا کہ میں نے مجلسِ عاملہ کے ارکان سے طے کیا تھا کہ میں اخوان کی یہ رائے دریافت کروں گا کہ کیا اس قضیئے کو اس بنیاد پر عدالت میں نہ لے جایا جائے کہ اخوان پر باقاعدہ مطبوعہ شکل میں قذف کا ارتکاب کیا گیا ہے۔ چنانچہ ایک روز ہم لوگ نماز عشاء کے بعد مسجد کے داخلی چبوترے میں جمع ہوئے۔ مَیں نے اجلاس کا افتتاح کیا اور مَیں موضوع زیرِ بحث کی تشریح شروع کرنے والا ہی تھا کہ مسجد کے اندر جماعت ختم ہو جانے کے بعد بیٹھ رہنے والے نمازیوں میں سے ایک صاحب نے قرآن کریم کی تلاوت کا آغاز کر دیا اور وہ یہ آیت پڑھنے لگ گیا:

وکذلک جعلنا لکل نبیّ عدوا شیاطین الانس والجن یوحی بعضھم الی بعض زخرف القول غرورا۔ ولو شاء ربک ما فعلوہ فذرھم وما یفترون ولتصغی الیہ افئدۃ الذین لا یومنون بالاخرۃ ولیرضوہ ولیقترفوا ما ھم مقترفون۔ افغیر اللہ ابتغی حکما وھو الذی انزل الیکم الکتٰب مفصلا، والذین آتیناھم الکتاب یعلمون انہ منزل من ربک بالحق فلا

تکونن من الممترین ۔ وتمت کلمۃ ربک صدقا وعدلا
لامبدل لکلمتہ وھوالسمیع العلیم ۔

" اور ہم نے اسی طرح ہمیشہ شیطان انسانوں اور شیطان جنوں کو ہر نبی کا دشمن بنایا ہے جو ایک دوسرے پر خوش آئند دھوکے اور فریب کے طور پر القا کرتے ہیں۔ اگر تمھارے رب کی مشیّت یہ ہوتی کہ وہ ایسا نہ کریں تو وہ کبھی نہ کرتے۔ پس تم انھیں ان کے حال پر چھوڑ دو کہ اپنی افترا پردازیاں کرتے رہیں تاکہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اُن کے دل اس خوشنما دھوکے کی طرف مائل ہوں اور وہ اس سے راضی ہو جائیں اور ان برائیوں کا ارتکاب کریں جن کا وہ ارتکاب کرنا چاہتے ہیں۔ پھر جب یہ حال ہے تو کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور فیصلہ کرنے والا تلاش کروں حالانکہ اُس نے پوری تفصیل کے ساتھ تمھاری طرف کتاب نازل کر دی ہے اور جن لوگوں کو ہم نے (تم سے پہلے) کتاب دی تھی وہ جانتے ہیں کہ یہ کتاب تمھارے رب کی طرف سے حق کے ساتھ نازل ہوئی ہے۔ لہٰذا تم شک کرنے والوں میں شامل نہ ہو۔ تمھارے رب کی بات سچائی اور انصاف کے اعتبار سے کامل ہے۔ کوئی اس کے فرامین کو تبدیل کرنے والا نہیں ہے اور وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔"

ہم سب لوگ اس کی تلاوت پر جو وہ اپنے طور پر کر رہا تھا مگر اس کی آواز خاصی بلند تھی ہمہ تن گوش ہو گئے۔ جب اُس نے مذکورہ بالا آیت ختم کر لی تو خاموش ہو گیا۔ ادھر میں بھی ساکت وصامت بیٹھا رہا۔ اخوان نے کہا: ہم یہاں کیوں جمع ہوئے ہیں؟ میں نے کہا: آیت افغیر اللہ ابتغی حکما (کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور فیصلہ کرنے والا تلاش کروں) نے ہمارا فیصلہ کر دیا ہے۔ میں نے اجتماع کی غرض بہ تفصیل بیان کر دی۔ اور آخر

میں اُن سے کہا کہ اب میں ایجنڈے میں سے اپنی اس تجویز کو واپس لیتا ہوں کہ ہم لوگ اپنا مقدمہ عدالت میں لے کر جائیں۔ اللہ تعالیٰ ہی ہمارے لیے حَکَم کافی ہے۔ اُس نے جو فیصلہ دیا ہے وہ مبنی بر عدل ہے۔ اور وہ اعدل الحاکمین ہے۔

سازش کے محرک مولوی صاحب کا انجام

یہ سب کہانی پیش آتی رہی۔ اور وہ مولوی صاحب جو اسماعیلیہ کے اخوان کے سربراہ بننے کے آرزومند تھے اخوان کے مدرسوں میں ابھی بطور مدرس کام کر رہے تھے اور دور سے اس فتنے کی سرپرستی کر رہے تھے۔ اور خوب روباہی چالیں چل رہے تھے۔ لیکن وہ اس درجہ چوکنے اور محتاط تھے کہ جو بات بھی اُن کی جانب منسوب ہو جاتی اُس سے گلوخلاصی کرا لیتے۔ میں نے بھی اُن پر طعن و تخمین کی اساس پر گرفت نہ کرنا چاہی اس لیے کہ اس سے امر واقع میں کوئی فرق نہ آتا تھا۔ ان کے حامی اخوان خود فتنے میں ملوث ہو چکے تھے اور ان کا کام تمام ہو چکا تھا۔ میں ہمیشہ یہ توقع رکھتا رہا کہ مولوی صاحب کو جو کہ دانش مند، صاحب علم اور لاجواب ادیب ہیں ان کی دانش اور علم اور ذوق ادب انھیں حق کے راستے پر لوٹا دیں گے، اور پھر وہ دوسروں کو دوبارہ واپس لانے کے لیے میرا ہاتھ بٹائیں گے، کہ ان کو اپنے حال پر مزید جمے رہنے میں مدد دیں گے۔ لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ صاحب موصوف فتنہ و شر کو مسلسل غذا فراہم کرتے رہے۔ بغیر اس کے کہ اس کی ذمہ داری ان پر عائد ہو۔ یہاں تک کہ آتش فتنہ کے شعلے خوب بھڑک اُٹھے اور معاملہ حد سے گذر گیا۔ مگر ایک مرتبہ وہ اتفاقاً رنگے ہاتھوں پکڑے گئے۔ وہ یوں کہ میں ایک رات مسلسل بے خوابی میں مبتلا رہا۔ اور فجر سے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ پیشتر ہی نماز کے لیے مسجد عباسی کو روانہ ہو گیا۔ راستے میں مخالفین میں سے ایک شخص کے مکان سے میرا گزر ہوا۔ دیکھا کہ اُس میں خوب روشنی ہو رہی ہے۔ کھڑکیاں

کھلی ہوئی ہیں اور بحث ومباحثہ جاری ہے اور زور زور سے آوازیں اُٹھ رہی ہیں۔ مَیں
اس طرف ملتفت ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ مولوی صاحب تشریف فرما ہیں اور ان کے اردگرد
مخالفین کی جماعت بیٹھی ہوئی ہے اور مولوی صاحب انھیں دجل وفریب اور مخاصمت
ونزاع کے گر سمجھا رہے ہیں۔ مَیں یہ دیکھ کر آگے روانہ ہوگیا۔ صبح کو میں نے مولوی صاحب
کو طلب کیا۔ اور بڑی لطافت کے ساتھ باتوں باتوں میں اُن سے دریافت کیا کہ اِمشب
کہاں بسر کی ہے ؟ انھوں نے جواب میں مجھے ایک طویل کہانی سنائی جس کا اختتام یہ تھا
کہ انھوں نے اپنے مکان پر رات گذاری ہے۔ اُس کے بعد مَیں نے برپا شدہ فتنے اور
اُس کے اثرات ونتائج کی طرف گفتگو کا رُخ موڑ دیا۔ اور یہ بھی اشارہ کیا کہ لوگ کہتے
ہیں اور مختلف روایات نقل کرتے ہیں کہ اس فتنے کے اندر آپ کا بھی حصّہ ہے۔ وہ
فوراً اپنی برأت کا اظہار کرنے لگے اور اس "تہمت" کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔
اور یوں ظاہر کرنے لگے کہ گویا اس بارے میں وہ کوثر وتسنیم سے بھی پاکیزہ تر ہیں۔ بلکہ
انھوں نے اپنی معصومیت پر طرح طرح کے دلائل وبراہین کا انبار لگا دیا۔ مَیں
سُن سُن کر انگشت بدنداں تھا کہ اس شخص کو ہیرا پھیری کی کس قدر قدرت و
صلاحیت حاصل ہے اور آخر میں تو اُس نے اپنی برأت وطہارت کی توثیق کے لیے
اپنی بیوی کی طلاق کی قسم کھانے کی ٹھان لی۔ مگر اب مجھ سے نہ رہا گیا اور مَیں نے
جھنجھلا کر اس کا منھ پکڑ لیا اور چلّا کر کہا : خدا سے ڈر، اور حلف نہ اٹھا۔" پھر میں نے
دریافت کیا کہ رات کو فلاں گھڑی تم کس جگہ تھے۔ یہ سنتے ہی اُس کے اوسان خطا ہو گئے۔
اور وہ بھونچکا رہ گیا اور کوشش کرنے لگا کہ کوئی جواب اختراع کرے مگر اس کی
زبان ٹھٹک گئی۔ میں نے اُسے مزید موقع نہ دیا اور اصل حقیقت اس کے سامنے عیاں
کر دی اور اس کے ناقابلِ انکار ثبوت بھی بیان کر دیئے۔ میں نے اُسے صاف صاف
کہہ دیا کہ یہ مجھے کسی شخص نے نہیں بتایا بلکہ میں نے اپنی آنکھوں سے تمھاری چالبازیوں

کو دیکھا ہے۔ چنانچہ اب اُسے چار و ناچار اقبالِ جرم کرنا پڑا۔ اور کہنے لگا کہ میں بڑا شرمندہ ہوں اور اپنے کیے پر نادم ہوں۔ آپ میرے ساتھ مہربانی اور رحم و کرم کا برتاؤ کریں۔ مَیں نے کہا: کوئی ڈر کی بات نہیں۔ اطمینان رکھیے کہ میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ تمھیں کوئی گزند پہنچاؤں۔ کیونکہ میرے لیے یہ تصور کرنا بھی محال ہے کہ کل تک میں تمھاری تعریف میں رطب اللسان تھا۔ تمھیں آگے بڑھاتا تھا اور خود تمھارے پیچھے نماز پڑھتا تھا۔ تمھارے درس میں حاضر ہوتا تھا اور لوگوں کو تمھارے درس میں شمولیت کی تلقین کرتا تھا۔ اور آج میں تمھاری مذمت کروں اور چوراہے میں تمھارے لتے دھوؤں، اور تمھارا جو جُرم مجھ پر منکشف ہوا ہے اُسے بے نقاب کرتا پھروں۔ اس عجیب و غریب پوزیشن کا میں تصور تک نہیں کر سکتا۔ لیکن اب میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ تم میرے ساتھ دعوت اور عملی زندگی میں شریکِ کار بنے رہو۔ تمھارے سامنے دو راستے ہیں۔ ان میں سے ایک راستہ منتخب کرلو۔ یا تو تم اسماعیلیہ کے اندر رہو۔ میں تمھارے لیے بہ تائیدِ ایزدی کسی شغل کا بندوبست کر دوں گا۔ مگر وہ اخوان کے ماحول سے باہر ہوگا۔ اس صورت میں تم موجودہ ملازمت سے علیحدگی کے لیے کوئی معقول اور قابلِ قبول عذر بیان کر دینا۔ اور پھر دوسرا راستہ یہ ہے کہ تم اپنے شہر واپس لوٹ جاؤ۔ مَیں تمھیں وہاں تک پہنچا دوں گا اور تمھاری راحت و آرام کا اس وقت تک ذمہ دار ہوں گا جب تک تم اپنے مامن میں نہیں پہنچ جاتے۔ اللہ ہم سب کا کارساز ہے۔ اور وہ ہمارا گواہ ہے۔ انھوں نے دوسری شرط قبول کر لی۔ مگر شرط یہ عائد کی کہ اُن کے ذمّے جو قرض ہے میں اُسے ادا کر دوں۔ چنانچہ میں نے اُن کا قرض ادا کر دیا۔ اس کے بعد انھوں نے باقاعدہ اپنا استعفیٰ دائر کر دیا۔ اور مرکز اور مدرسہ کے ساتھ بیک وقت اُن کا رابطہ منقطع ہوگیا۔

مولوی صاحب دیوانی عدالت میں

مگر جیسا کہ انھوں نے عہد کیا تھا وہ اپنے شہر کو واپس نہ لوٹے۔ ایک روز

میں نے اچانک یہ اعلان سُنا کہ اسماعیلیہ کے اندر ان کی نظامت اور ادارت میں ایک نئے اسکول کا افتتاح کر دیا گیا ہے اور جن پانچ افراد کے ساتھ اُن کا گٹھ جوڑ تھا اُن پر مشتمل ایک نگران کمیٹی قائم کر دی گئی ہے۔ اعلان میں اخوان المسلمون کی کوششوں اور اُن کے مدرسوں پر شدید نقد و جرح کی گئی ہے۔ مَیں نے دل میں کہا: بہت خوب! اصل ضرورت یہ تھی کہ وہ ہم سے الگ تھلگ رہیں اور اس کے بعد جو چاہیں گُل کھلائیں۔ لیکن ایک روز اچانک مجھے مقامی عدالت کی طرف سے یہ اطلاع ملی کہ مولوی صاحب نے اخوان المسلمون کے پاس جو عرصہ گذارا ہے اُس کا وہ معاوضہ طلب کر رہے ہیں۔ اُن کا یہ معاوضہ معمولی سی رقم تھی۔ مگر انھیں یہی شوق ہوا کہ وہ اس حقیر رقم کو عدالت کے ذریعہ ہم سے طلب کریں۔ حالانکہ میرے پاس ایسی دستاویزات تھیں جو اُن کے معاوضے سے کئی گنا زیادہ اُن پر قرض ثابت کرتی تھیں۔ بہر حال مَیں بذاتِ خود عدالت میں حاضر ہوا۔ مولوی صاحب نے اپنا دعویٰ پیش کیا۔ مَیں نے اُن کے دعوے کو تسلیم کر لیا۔ لیکن میں نے جج کے سامنے وہ تمام دستاویزات پیش کر دیں جو میرے پاس تھیں۔ جج نے ان دستاویزات کی قانونی حیثیت کو تسلیم کر لیا اور مولوی صاحب کے دعویٰ کو خارج کر دیا اور مصارف مقدمہ اُن پر عاید کیے۔ جس مدرسے کے بارے میں بڑے طمطراق سے اعلان کیا گیا تھا اُسے کبھی بقاء نصیب نہ ہو سکی، بلکہ کھلنے بھی نہ پایا تھا کہ اس کی بساط لپیٹ گئی۔ خود مولوی صاحب بھی اسماعیلیہ میں نہ ٹھیر سکے بلکہ وہاں سے کوچ کر گئے۔

مَیں یہ طویل حکایت اپنی ڈائری میں درج کرتے ہوئے اُن مولوی صاحب سے اظہارِ معذرت کرتا ہوں۔ وہ آج ہمارے ملک کے بہترین علماء میں شمار ہوتے ہیں اور ہمارے بہترین دوستوں میں سے ہیں ــــــ مَیں نے جن وقتوں کی داستان بیان کی ہے وہ گذر گئے۔ اُن کی یادیں بھی قصۂ پارینہ ہو گئیں۔ ہو سکتا ہے کہ اُن دنوں بھی

انھیں کوئی عذر لاحق تھا اور ہم انھیں یونہی ملامت کرتے رہے۔ دلوں کے چھپے ہوئے راز خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

راقم کی شادی اور تبدیلی

شاید اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات بابرکات نے یہ ارادہ فرمایا کہ وہ ان فتنوں اور آزمائشوں کی ضربوں میں تخفیف کر دے جو دعوتی زندگی کے آغاز ہی میں میرے لیے بلا شبہ ناگہانی افتاد بن کر وارد ہوتی رہیں۔ یہ فتنے اور آزمائش میرے لیے حیرت انگیز سبق ہوتے تھے جنھیں میں حیرت و استعجاب کے عالم میں ڈوب کر مسلسل حاصل کرتا رہا۔ اگرچہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا فضل و کرم ان فتنوں کے مضر اثرات کو زائل کر دیتا تھا اور ہمارے لیے اُن کے اندر سے ایسا خیر اُجاگر فرما دیتا تھا جس پر ہم پکار اُٹھتے تھے کہ:

عدو شرّے بر انگیزد کہ خیر ما دراں باشد

مَیں یہ بات خوب سمجھتا تھا کہ دعوت جو کبھی لڑائی سے دوچار ہوا کرتی ہے اس کے نادان دشمن بھی اس کی مخالفت کرتے ہیں، جو لوگ اس سے کوئی تعلق نہ رکھتے ہوں وہ بھی اس سے جنگ آزما ہو جاتے ہیں۔ جو اسے سمجھتے ہیں وہ بھی اس کے خلاف برسرِ پیکار ہو جاتے ہیں اور کچھ ایسے مخالف بھی ہوتے ہیں جو اس کی صفوں میں کارکن کی حیثیت سے شریک ہوتے ہیں مگر وہ اپنے مفادات کی تکمیل کے لیے شامل ہوتے ہیں۔ اس ہمہ جہت جنگ کے لیے مَیں پورا اسلحہ فراہم کرتا رہتا تھا۔ میرا اسلحہ تھا صبر، ضبطِ نفس اور اچھا کردار۔ رہی یہ بات کہ عَلَمِ مخالفت وہ مخلص ترین لوگ بھی بلند کر دیں جن پر ہم پورا پورا اعتماد کرتے ہوں اور ان کو شہ دینے والے وہ بعض افراد ہوں جو خود تحریک کے زیرِ سایہ تحریک کے اداروں میں پل رہے ہوں۔ اور پھر اس مخالفت کا مقصد و منشا بھی کوئی نہ ہو اور یہ سب بے نتیجہ تگ و دو ہو،

تو یہ صورت فی الواقع محیرّ العقول بات ہے وللہ فی خلقہ شوؤن (مگر اللہ کی مخلوق بڑی رنگا رنگ ہے) ـــــ تو گویا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات بابرکات نے یہ ارادہ فرمایا کہ وہ ان فتنوں اور آزمائشوں کی ضربوں میں تخفیف فرمادے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے میرے لیے شادی کا موقع فراہم کر دیا اور میری شادی بڑے آسان، ہلکے پھلکے طریقے اور انتہائی سادگی کے ساتھ انجام پاگئی۔ تقریباً یکم رمضان کو نسبت ٹھیری، رمضان المبارک کی ستائیسویں شب کو مسجد کے اندر نکاح ہوگیا اور دس ذوالقعدہ کو رخصتی ہوگئی۔ اور یوں اللہ تعالیٰ کی مشیّت پوری ہوگئی۔ والحمد للہ رب العالمین۔

شادی کے بعد میں نے محسوس کیا کہ اسماعیلیہ کے اندر اب میرا مشن مکمل ہوگیا ہے۔ تحریک برپا ہوچکی ہے۔ مختلف تحریکی ادارے قائم کر دیئے گئے ہیں۔ اسماعیلیہ کے تمام تر باشندے اخوان (بھائی بھائی) بن چکے ہیں۔ میرا نصف دین بھی مکمل ہوگیا ہے (شادی کو نصف دین کہا گیا ہے)۔ لہٰذا اب یہاں میرا بیٹھ رہنا کیوں ضروری ہے؟۔ میرے اوپر یہ عجیب وغریب احساس طاری ہوگیا کہ مَیں اب یہاں سے تبدیل کر دیا جاؤں گا۔ چنانچہ ۱۹۳۲ء کی گرمیوں کی تعطیلات آگئیں۔ مَیں نے اپنے استاذِ گرامی شیخ عبدالوہاب نجّار رحمہ اللہ سے ملاقات کی۔ اور ہم دونوں دیر تک محوِ گفتگو رہے۔ اور بات اسماعیلیہ اور اسماعیلیہ میں دعوت کی رفتار تک جا پہنچی۔ اور مَیں نے یہ بھی بتا دیا کہ اب میرا دل یہ کہہ رہا ہے کہ اسماعیلیہ سے عنقریب جدا ہو جاؤں گا۔ مَیں نے شیخ عبدالوہاب نجّار سے گذارش کی کہ آپ استاذ بطراوی مفتشِ لسان عربی سے بات کریں کہ میں قاہرہ تبدیل ہو جانے کی خواہش رکھتا ہوں۔ چنانچہ استاذ نجّار، بطراوی صاحب سے بات چیت کرنے کے بعد میرے پاس آئے اور مجھ سے کہا کہ مَیں تبدیلی کے لیے ایک درخواست تحریر کروں۔ چنانچہ میں نے وہیں ایک درخواست لکھ دی۔ اللہ تعالیٰ نے خواہش کو پورا کر دیا۔ اکتوبر ۱۹۳۲ء میں مَیں قاہرہ تبدیل کر دیا گیا ـــ الحمد للہ الذی بنعمتہ تتم الصالحات۔

خرد کہتی تھی رک جاؤ بہت نازک زمانہ ہے
سفینہ کو مگر طوفان سے ٹکرا دیا تو نے

اگر یہ واقعہ ہے مذہبِ اسلام زندہ ہے
تو پھر کیا ڈر ہے تو زندہ ترا پیغام زندہ ہے

ماہر القادری

ہماری مطبوعات

حضرت یوسفؑ قرآن کے آئینے میں	مولانا سید احمد عروج قادریؒ
خیر البشر کے چالیس جاں نثار	طالب ہاشمی
خورشید رسالت کی پانچ کرنیں	آباد شاہ پوری
سیرت اصحاب رسولؐ	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
سیرت حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ	صابر قمرنی
خاتون جنتؓ	مائل خیرآبادی
امّ المؤمنین حضرت عائشہؓ	"
ازواج مطہرات	فرزانہ احسن
امام ابوحنیفہؒ اور ان کا کارنامہ	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا کارنامہ	مولانا سید احمد عروج قادریؒ
اولیاء اللہ	"
کربلا سے بالاکوٹ تک	مولانا محمد سلیمان قاسمی
یادرفتگاں (اوّل)	ماہرالقادری
پہاڑی کے چراغ	آباد شاہ پوری
ہندو دھرم کی جدید شخصیتیں	محمد فاروق خاں
چٹانیں (جانباز صحابیات کے حالات)	مائل خیرآبادی